مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

حیات وافکار کے چند پہلو

ترتیب وتدوین

سفیر اختر

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی-اسلام آباد

www.abulhasanalinadwi.org

ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد

جملہ حقوق بحق ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد محفوظ ہیں (۲۰۰۲ء)

کوائف فہرست سازی دوران طباعت

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: حیات و افکار کے چند پہلو/ ترتیب و تدوین: سفیر اختر
(ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد)
ا۔ندوی، سید ابوالحسن علی،۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء۔الف-سفیر اختر، مرتب
۹۲۲۰۹۷۵۴ dc ۲۱
ISBN 969-408-227-7

طابع و ناشر: ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد
مطبع: مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد

www.abulhasanalinadwi.org

فہرست مندرجات

حرفِ اول	ظفر اسحاق انصاری	۹
پیش لفظ	مرتب	۱۱
افتتاحیہ	خورشید احمد	۱۳

۱

میری علمی اور مطالعاتی زندگی	سید ابوالحسن علی ندوی	۲۱
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ ـــــ سوانحی خاکہ	سید رضوان علی ندوی	۷۱

۲

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر	شکری فیصل/سید محمد الحسنی	۹۷
تاریخ دعوت و عزیمت [جلد دوم]	خورشید احمد	۱۰۵
تاریخ دعوت و عزیمت [جلد سوم]	نثار احمد	۱۱۷
برصغیر کی تاریخ اصلاح و جہاد	سفیر اختر	۱۳۱
نقوشِ اقبال	محمد صدیق خان شبلی	۱۴۷
قادیانیت: مطالعہ و جائزہ (چند یادیں)	نصر اللہ خان عزیز	۱۵۵
مختارات	جلیل احسن ندوی	۱۶۱

www.abulhasanalinadwi.org

(۳)

ایک سچا داعی اسلام	خالد علوی	۱۶۷
مولانا علی میاں کا پیغام ــــ امت مسلمہ کے نام	محمد طفیل ہاشمی	۱۸۷
اسلام کی تجدید واحیاء کیسے ممکن ہے؟	حبیب الرحمٰن عاصم	۱۹۷

(۴)

مولانا علی میاں بحیثیت ادیب	خورشید رضوی	۲۱۳
عرب دنیا، عربی زبان وادب اور مولانا علی میاں	سہیل حسن	۲۲۷
مولانا ابوالحسن علی ندوی: ایک روحانی شخصیت	فضل الرحیم	۲۳۷
''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے''	محمد الغزالی	۲۴۳
مولانا علی میاں اور پاکستان	زاہد منیر عامر	۲۵۳

(۵)

مکاتیب	سید ابوالحسن علی ندوی	۲۶۱

(۶)

اشاریے

رجال	۳۰۵
اماکن	۳۱۶
کتابیں اور جرائد	۳۲۱
ادارے اور تنظیمیں	۳۳۰

www.abulhasanalinadwi.org

مرحوم [مولانا حکیم سید عبدالحی، ناظم ندوۃ العلماء] کے دوسرے صاحبزادے ---[اُن کی رحلت کے] وقت بالکل ہی کم سن تھے، ---آج وہ سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور روزگار ہیں، اور تبلیغ دین کے کام میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہیں، دو تین سال سے حجاز میں دعوت کے کاموں میں لگے ہیں۔ امسال [۱۹۵۳ء] حجاز اور مصر کی فضائیں ان کی دعوت کے نغموں سے مسحور ہیں، اور اسی مناسبت سے وہ ایک سال سے حجاز اور مصر میں مقیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عربی تقریر و تحریر کی دولت اُن کو عنایت فرمائی ہے جس کو وہ بحمد اللہ دین کی راہ میں لٹا رہے ہیں۔

سید سلیمان ندوی

www.abulhasanalinadwi.org

---[علی میاں] سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں، لیکن علم و فضل میں، سنجیدگی فکر میں، اخلاص میں، اخلاق و تقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت و طاعت میں میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل۔ رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور بھی لوگوں سے میں واقف ہوں۔ باپ اور بھائی کا کیا کہنا، دونوں ''نورعلی نور'' پاک صاف، طاہر و مطہر مٹی جو تیمم کے قابل ہو، اس سے بنے ہوئے۔ دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر و قابل فخر--- یہ اس تاروں کے جھرمٹ کے درمیان آفتاب!

عبدالماجد دریابادی

---ہماری اس دنیا میں ایسے لوگ بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذہنِ ثاقب بھی ملا ہو اور دلِ روشن بھی، جو اس دوڑتی ہوئی اور کروٹیں بدلتی ہوئی دنیا کے حالات و مزاج اور اس کے نت نئے تقاضوں سے پورے باخبر بھی ہوں اور دینی ایمانی حقائق کے بارے میں وارثین انبیاء کی طرح صاحب یقین بھی ـــ الغرض ہماری اس دنیا میں یہ جنس بہت ہی کم یاب ہے اور اللہ کے ایسے بندے جو ان دونوں صفتوں کے جامع ہوں، اس عاجز نے غالباً اتنے بھی نہیں دیکھے جتنی کہ اپنے ایک ہاتھ میں انگلیاں ہیں، لیکن جو دو چار دیکھے ہیں، ان میں ایک ذات رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی کی بھی ہے۔ اللہ کی خاص عنایت اور توفیق سے وہ صاحب نظر و فکر بھی ہیں اور صاحب قلب بھی، وہ اپنے علم و معلومات کے لحاظ سے جدید بھی ہیں اور ایمان و یقین اور رسوخ فی الدین اور طرز زندگی کے لحاظ سے قدیم بھی، ان کی ذات میں مدرسہ بھی ہے اور خانقاہ بھی---

محمد منظور نعمانی

www.abulhasanalinadwi.org

حرف اول

بیسویں صدی کا آخری سورج غروب ہونے سے چند گھنٹے قبل مسلمان ایک بڑے صدمے سے دوچار ہوئے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، جو اس امت کے لیے اللہ کی رحمت کا ایک سایہ تھے، اُس روز نمازِ جمعہ سے قبل، آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہوئے اُس رب کریم سے جا ملے جو ان کی نمازوں، قربانیوں اور موت و زیست سب کا مقصود و منتہا تھا۔ مولانا جن کی عمر نوے کی سرحد کی طرف بڑھ رہی تھی، اللہ کی بندگی اور اُس کے دین کی نہایت بھرپور خدمت انجام دینے کے بعد ایک ایسی منزل کی طرف روانہ ہو گئے جو بفضلہٖ تعالیٰ اس دار ابتلاء و محن سے بدرجہا بہتر ہوگی، لیکن اُن کے اٹھ جانے سے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ارب سے زیادہ نفوس پر مشتمل امت مسلمہ یتیم ہوگئی۔ وہ ایک ایسے عالم، مفکر، داعی، ادیب، مربی اور زعیم سے محروم ہوگئی جو عرصۂ دراز سے اس امت کے ہر دکھ درد میں نہ صرف شریک تھا، بلکہ اس کے ہر غم کو وہ اپنا غم بنا چکا تھا، جسے اس دنیا سے کچھ لینا نہ تھا، جسے امت مسلمہ کی خوشی کے سوا کوئی دوسری خوشی مطلوب نہ تھی۔ وہ اپنے لیے صرف اپنے رب کی رضا کا طلب گار تھا، اور امت مسلمہ کو رسول اکرمؐ کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس کے دل کی ساری بے تابیاں، اس کے نالۂ نیم شب کا نیاز، اس کی خلوت و انجمن کا گداز، اس کی امنگیں اور آرزوئیں، ان سب کا محور یہی تھا کہ اللہ کا پیغام عام ہو، مسلمان اسے دل و جان سے اپنا کر اللہ کے آخری رسولؐ کے نقش قدم پر چل پڑیں، اپنے اور بیگانے سب اس روشنی سے اپنے دل و دماغ کو روشن اور عصر حاضر کی چکاچوند تہذیب کی تیرگی

www.abulhasanalinadwi.org

سے نجات حاصل کر کے زندگی کی راہوں کو ہدایت الٰہی سے روشن کر لیں۔

مولانا کی داستانِ حیات کو دنیا کے پیمانوں سے ناپا جائے تو بڑی سادہ اور سپاٹ تھی۔ وہ نہ بنک بیلنس کے مالک تھے، نہ کسی عالیشان کوٹھی اور کار کے۔ وہ اس دنیا میں اس طرح رہے جس طرح ایک مسافر اور راہ گزر رہتا ہے۔ اُن کا امتیاز یہی تھا کہ انہوں نے دنیا اور دنیا والوں سے کچھ نہ لیا، لیکن ایک ایسی متاع ان میں بڑی سخاوت سے لٹاتے رہے جن سے اہل دنیا کی جھولی خالی ہے اور جو صرف اہل دل کے ہاں ملتی ہے۔ علم، ایمان، خدا شناسی و خدا ترسی، اخلاق و تہذیب، شائستگی، ہمدردی و انسانیت کی دولت مولانا ہر طرف بکھیرتے رہے۔ آخر کار وہ دنیوی لحاظ سے تہی کیسہ، لیکن درحقیقت ایک بہت بڑا سرمایہ لے کر اُس دنیا کی طرف روانہ ہو گئے ہیں جہاں ان کے لیے نہ خوف ہے اور نہ حزن، ایک ایسی دنیا جہاں وہ ان شاء اللہ انبیاء و شہداء اور صدیقین و صالحین کی معیت میں اُن نعمتوں سے لذت اندوز ہو رہے ہوں گے جن تک ہماری چشم تصور کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

مولانا جیسے عظیم انسان کے اٹھ جانے سے احساس زیاں بھرپور ہے، مگر مولانا نے اپنے پیچھے فکر و نظر کا وسیع سرمایہ یادگار چھوڑا ہے جس سے اُن کے پیغام کی گونج ہمیشہ بلند ہوتی رہے گی۔ میرے اور میرے رفقاء نے چاہا کہ کیوں نہ اُن کے ذکر خیر کے لیے ایک سیمینار کا اہتمام کریں، چنانچہ اپنے احباب کو دعوت دی، ہم اُن کے شکر گزار ہوں کہ وقت کی کمی کے باوجود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اور اُن کے مقصد زندگی سے اُن کی محبت نے اُنہیں ہماری دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا، اور اُنہوں نے سیمینار میں شرکت کی۔ سیمینار میں پیش کردہ مقالات اہل نظر کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد خوشی محسوس کر رہا ہے کہ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کی اس سے یاد تازہ رہے گی۔

ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد ظفر اسحاق انصاری

www.abulhasanalinadwi.org

پیش لفظ

۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو بیسویں صدی اور ہزارہ دوم کا آخری سورج ہی غروب نہیں ہوا، بلکہ اس سے چند گھنٹے پہلے مسلمانانِ برعظیم پاکستان و ہند و بنگلہ دیش کی دُنیائے فکر و دانش کا ایک آفتاب بھی اپنی آخری منزل کو روانہ ہو گیا تھا۔ اس ''آفتاب علم و فضل'' سے میری مراد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی ذات گرامی ہے جن کی علمی و دینی مساعی نے ایک نسل کے جادۂ حیات کو روشن تر کیا تھا۔ مولانا مرحوم دنیا سے اٹھ گئے ہیں، لیکن ان کی تحریریں، اور ان کے قائم کردہ ادارے ان شاء اللہ ایک عرصہ زندہ رہیں گے، اور آنے والی نسلیں ان سے اکتسابِ نور کرتی رہیں گی۔

مولانا مرحوم کی رحلت کے فوراً بعد ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد نے ان کی یاد میں ایک دو روزہ سیمینار کا اہتمام کیا (۲۱ فروری ۲۰۰۰ء)۔ جس کی اُردو اور عربی کی الگ الگ نشستوں میں اہل قلم نے مولانا مرحوم کی حیات و افکار کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے اختتام پر اس ارادے کا اظہار کیا گیا تھا کہ سیمینار کے لیے لکھے گئے مقالات شائع کیے جائیں گے، اور اُردو مقالات کی ترتیب و تدوین راقم الحروف کے ذمے ڈال دی گئی۔

مقالات کی ترتیب و تدوین میں بعض ناگزیر اسباب سے تاخیر ہوئی، جسے بعض مقالہ نگار دوست برداشت نہ کر سکے، اور انہوں نے اپنی محنت کو ٹھکانے لگانے کی جائز خواہش کے تحت، یا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد میں تحریریں شائع کرنے کے خواہش مند مدیران جرائد کے اصرار پر اپنے مقالات اشاعت کے لیے دے دیے۔ یوں راقم الحروف ان کے مقالات کو زیر نظر مجموعے

www.abulhasanalinadwi.org

کی زینت بنانے سے محروم ہوگیا۔ یہ کمی پوری کرنے کی خاطر، اور مجموعے کو نسبتاً جامع بنانے کے لیے خود مولانا مرحوم، اور ان کے بعض معاصرین کی تحریریں شامل کر لی گئی ہیں، جو اگرچہ مطبوعہ ہیں، مگر ان تک عام قارئین کی رسائی نہیں ہے۔ ان تحریروں سے مولانا مرحوم کی زندگی اور سوچ کے بعض پہلو سامنے آتے ہیں، اور امید ہے کہ قارئین اس ''قند مکرر'' سے بدمزہ نہ ہوں گے۔

مقالات کی ترتیب و تدوین کے دوران میں مولانا مرحوم کے بیسیوں مکاتیب نظر سے گزرے ـــ رسائل میں شائع شدہ، اور غیر مطبوعہ بھی۔ زیر نظر مجموعے میں کچھ، بطور نمونہ ''مشتے از خروارے'' پیش کیے جا رہے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو مولانا مرحوم کے منتخب مکاتیب کسی اور موقع پر پیش کیے جائیں گے۔

زیر نظر مجموعہ مقالات ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: حیات وافکار کے چند پہلو'' کی تیاری میں متعدد احباب کا حصہ ہے۔ محترم ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری (ڈائریکٹر جنرل ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد) کی ذاتی دلچسپی اور مشوروں کی بدولت مجموعے کی ترتیب و تدوین کو بہتر بنانے میں مدد ملی ہے۔ برادر سہیل حسن نے عربی عبارات کی تصحیح اور انہیں اصل متون سے ملا کر دیکھنے کی زحمت اٹھائی ہے۔ بعض مقالہ نگاروں نے میری خواہش پر اپنے مقالات پر نظر ثانی کی ہے، اور میری معروضات کو شرف پذیرائی بخشا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری (ادارہ تحقیقات اسلامی - اسلام آباد) کے کارکنوں نے مختلف رسائل و جرائد فراہم کرنے میں بھرپور تعاون کیا ہے۔ برادر شفیق احمد اور برادر طاہر عباسی نے اسے کمپوز کرنے، اور برادر مرزا لیاقت بیگ نے اسے طباعت کے لیے حتمی شکل دینے میں اپنی بھرپور فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے، نیز برادر سلمان طاہر نے اشاریے تیار کیے ہیں۔ راقم الحروف ان سب دوستوں کا شکر گزار ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد

۲۲ مئی ۲۰۰۲ء

سفیر اختر

www.abulhasanalinadwi.org

خورشید احمد

افتتاحیہ

بیسویں صدی، ملت اسلامیہ کے لیے ایک طرف اس کی شناخت اور مثبت پیش رفت کی صدی ہے، تو دوسری طرف اس صدی نے ملتِ اسلامیہ سے بڑا خراج وصول کیا ہے، اور یہ خراج آخری عشرے میں تو اپنی مثال آپ بن گیا۔ جہاد افغانستان میں دی گئی قربانیاں ان گنت ہیں، ارضِ فلسطین مسلسل لہولہان ہے، اور مسجد اقصیٰ محصور ہے۔ بوسنیا اور کوسوا میں خون کی ندیاں بہہ گئیں، کشمیر جل رہا ہے اور شیشان میں خونِ مسلم کی ارزانی حد سے گزر گئی ہے۔ اس صدی میں اسلامی فکر و دانش اور احیائے دین کے جذبے سے سرشار کوہ قامت شخصیات نے جنم لیا، اور ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو گئیں۔ چلتے چلتے آخری روز ۳۱ دسمبر کو بیسویں صدی ایک اور چرکا لگا گئی۔ برعظیم پاکستان و ہند کے صف اول کے دینی رہنماؤں کی آخری نشانی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ایک عالم کو سوگوار چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون**۔ اُن کی رحلت پر آنکھیں اشک بار ہیں، مگر دل اللہ کے فیصلے پر مطمئن ہیں۔ **کل من علیها فان و یبقی وجه ربك ذوالجلال والاکرام** (الرحمٰن ۵۵:۲۶-۲۷) (ہر چیز جو اس زمین پر ہے، فنا ہو جانے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے)۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کے کارکن، اور بالخصوص برادر مکرم ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یاد میں مل بیٹھنے کا اہتمام کیا ہے، تا کہ ان کی حسنات کے تذکرے کے ساتھ ان کے مقصدِ زندگی پر، جو ہر مسلمان کا مقصد زندگی ہے، اہل علم اظہار خیال کریں۔ میں اس محفل میں اپنی شرکت کو ایک سعادت سمجھتا ہوں۔

www.abulhasanalinadwi.org

بطورِ تحدیثِ نعمت عرض کرتا ہوں کہ مجھے گزشتہ نصف صدی کے بعض چوٹی کے اہلِ علم و دانش سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کے مواقع ملے، لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان سب میں منفرد تھے۔ ان کی شخصیت، ان کی سیرت اور ان کی خدمات پر جتنا بھی غور کرتا ہوں، دل گواہی دیتا ہے "بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری"۔

مولانا علی میاں سے میرا تعارف اور شخصی تعلق تین مرحلوں سے گزر کر استوار ہوا۔ پہلے مرحلے میں مولانا مسعود عالم ندوی نے مولانا علی میاں کی محبت اور عظمت کے نقوش میرے، اور میری طرح میرے ہم عمر دوستوں کے دلوں پر مرتسم کیے تھے۔ مولانا مسعود عالم مولانا علی میاں کے بڑے عزیز دوست اور ہم ذوق ساتھی تھے۔ دونوں کو عربی ادب و انشاء سے یکساں لگاؤ تھا، دونوں کی علمی دلچسپیاں ایک تھیں، دونوں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد تھے، اور دارالعلوم کے زمانۂ قیام میں ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنے دوست مولانا علی میاں کی جلوت و خلوت کے بہت سے واقعات اس طرح بیان کیے کہ ان کا مقامِ علم و فضل، ان کی للہیت اور کیفیتِ عبادت، نیز ان کا شوقِ دعوت و تبلیغ سب دل و دماغ پر نقش ہو گیا۔ دوسرے مرحلے کا آغاز مولانا علی میاں کی تحریروں کے مطالعے سے ہوا، ان کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" کی پہلی جلد پڑھی، تو اس کتاب سے نہ صرف انیسویں صدی کی عظیم تحریک اصلاح و جہاد سے گہری شناسائی ہوئی، اور سید احمد شہید سے گہرا تعلق پیدا ہوا، بلکہ خود سیرت نگار مولانا علی میاں کی شخصیت بھی دل میں گھر کر گئی۔ ان سے تعلق خاطر کا تیسرا مرحلہ مئی ۱۹۵۴ء میں شروع ہوا جب مولانا علی میاں قیامِ پاکستان کے بعد پہلی بار پاکستان تشریف لائے تھے۔ میں اس زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ تھا، بالمشافہہ ملاقات میں انہیں اس ذہنی تصویر سے ہم آہنگ پایا جو مولانا مسعود عالم ندوی کے تذکارِ دوست اور خود مولانا علی میاں کی تحریروں کے مطالعے سے ذہن میں بنائی تھی۔ اس کے بعد ان سے بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ آخری ملاقات برطانیہ میں ۱۹۹۶ء میں ہوئی جب وہ اسلامک فاؤنڈیشن (لیسٹر) میں تشریف لائے، اور فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام مقامی مسلمانوں کے ایک

www.abulhasanalinadwi.org

اجتماع اور رفقائے ادارہ سے خطاب فرمایا۔ فاؤنڈیشن سے ہو کر نوٹنگھم میں مسجد اور دارالعلوم کا افتتاح کرنے تشریف لے گئے، مرحوم بھائی خرم مراد، ڈاکٹر مناظر احسن، اور میں نے اس تقریب میں شرکت کی۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ ۴۲ برسوں میں پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک ہر بار ان کی شفقت اور ان کے پیار میں اضافے کا ہی گمان رہا۔

مولانا علی میاں میرے لیے استاد، مربی اور محسن کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کی ہر تحریر بڑے ذوق وشوق سے پڑھی، اور ان کی بعض کتابوں کا تو انتظار رہتا تھا۔ ان کی کتاب ''مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا؟'' جو ان کی شہرہ آفاق عربی کتاب **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین** کا ترجمہ تھا، پڑھی، اس نے فکر ونظر ہی کو جلا نہ بخشی، بلکہ روح کو تڑپا اور گرما دیا۔ ان کی ''تاریخ دعوت وعزیمت'' نے بہت متاثر کیا۔ میں نے ''چراغ راہ'' میں اس کے دوسرے حصے پر جو شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی مساعی جمیلہ کے تذکرے پر مشتمل ہے، طویل تبصرہ لکھا تھا۔ قلم و قرطاس سے اپنے تعلق کے باعث مولانا علی میاں کی تحریریں نہ صرف خود پڑھیں، بلکہ جن رسائل سے تعلق رہا، ان کے ذریعے ان تحریروں کے مطالعے میں دوسروں کو بھی شریک کیا۔ دل کی بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبال، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے بعد میں نے جس شخصیت کی تحریروں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، وہ مولانا علی میاں ہی ہیں۔

مولانا علی میاں ایک نامور عالم دین، ایک بلند پایہ مصنف اور دانش ور، ایک صاحب طرز ادیب، ایک سحر انگیز خطیب اور ایک منفرد مؤرخ و سیرت نگار تھے، لیکن ان سب جہتوں سے بڑھ کر وہ ایک داعی، ایک مبلغ، ایک مصلح اور ایک صاحب دل مزکی اور مربی تھے۔ ان تمام اوصاف کے اجتماع نے انھیں بیسویں صدی کے احیائے اسلام کے معماروں میں ایک منفرد مقام دے دیا تھا۔ میں جب بیسویں صدی کی اسلامی فکر و دانش کی قوس قزح پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ان کا فکر و اسلوب ایک گلدستے کی مانند دکھائی دیتا ہے جس میں اس دور کے متعدد اہل نظر اور اصحاب دعوت کے متفرق پہلو جمع ہو گئے ہیں۔ ان کے یہاں علامہ اقبال کا سوز و گداز، مولانا مودودی کی منطقیت

www.abulhasanalinadwi.org

اور تعقل، علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کا ذوقِ تاریخ، اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس، مولانا عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد زکریا کی روحانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ مولانا علی میاں کے یہاں یہ سب پہلو ایک دوسرے کے نقیض نہیں، بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں، اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ناقدین علم وفن نے نظر انداز کر دیا ہے۔

مولانا علی میاں کا اصل میدان دعوت ہے، سیرت اور انسان سازی ہے، روح کی بیداری اور امت کی ترقی کے لیے اسلاف کے نمونے کا احیاء ہے۔ ان کے یہاں خانقاہ اور جہاد، تزکیہ اور انقلاب دونوں دھارے ساتھ ساتھ رواں نظر آتے ہیں۔ وہ کبھی تاریخ کے جھروکوں سے ایک پہلو کو نمایاں کرتے ہیں، اور کبھی دوسرے کو۔ ان کی پہلی اہم اور بڑی کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' ۱۹۳۹ء کے آغاز میں شائع ہوئی تھی (سید احمد شہید کی سیرت پر ہی انہوں نے اپنی پہلی عربی تحریر قلمبند کی تھی)، جسے انہوں نے زندگی کے آخری برسوں میں سلسلہ ''دعوت وعزیمت'' کے ایک حصے کی شکل دے دی تھی۔ اس پورے سلسلہ دعوت وعزیمت میں تزکیہ نفس اور جہاد واصلاح کا چولی دامن کا ساتھ باقی رہتا ہے۔ ان کے ذوق، اور خاندانی ودعوتی ماحول کے تحت ان کے ذہن میں جب دین کی جدید تعبیر وتفہیم کے باب میں کچھ خدشات اور خطرات جنم لیتے ہیں، اور وہ کچھ تصورات اور اسالیب کے بارے میں اپنے تردد اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں، تب بھی دین اور قوت کے تعلق، احیاء اور اقامت دین کی طلب اور خواہش، اسلامی حکومت کے قیام اور غلبے کی تمنا کے اظہار پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے ایک حصے کے طور پر شائع ہونے والی ''سیرت سید احمد شہید'' میں وہ مقصد تالیف من وعن قائم رکھا گیا ہے جو مئی ۱۹۳۶ء میں رقم کیا گیا تھا۔ یعنی ''اسلام کی خدمت اور نوعِ انسانی کی سعادت کا ایک ہی لائحہ عمل ہے جو اس کتاب میں بیان کیا ہے، اور وہ وہی ہے جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے خلفائے راشدینؓ اور بعض مجددینِ امت نے عمل کیا، یعنی دنیا میں اسلامی شریعت اور خلافت کا صحیح نظام قائم کرنا، اور اسلام کے اخلاقی، روحانی، مادی اور سیاسی غلبے کی کوشش کرنا (ص ۳۷)۔''

www.abulhasanalinadwi.org

''سید صاحب کی سیرت پر ایک اجمالی نظر'' کے باب میں دعوت دین کا کام کرنے والے تمام بزرگوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ ''نفس کے مجاہدے کے ساتھ کفار سے جہاد'' اور ''شرعی حکومت'' کا قیام اسوۂ رسالت مآب کا جز و لاینفک ہے۔ دعوت اور خدمت کے سب ہی کام اہم اور لائق تحسین ہیں، لیکن ''ان سب کے حلقے اور عمل کے دائرے محدود ہیں'' اور ''سید صاحب نے اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا کہ حکومتِ الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام، قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر یہ سب کوششیں کوہ کندن و کاہ برآوردن ثابت ہوں گی (صفحات ۵۰-۵۱)۔''

مولانا علی میاں کا میدانِ عمل سیاست نہ تھا۔ ان کی جملہ کاوشیں دین کے ہمہ گیر اور جامع تصور کی تشریح و توضیح پر مبنی ہیں، اور وہ ہمیشہ ملت اسلامیہ کے عروج اور غلبے کا خواب دیکھتے رہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ جب ۱۹۸۰ء میں انہیں ''فیصل ایوارڈ'' دیا گیا تو اس کے ساتھ ملنے والی رقم کا نصف اُنہوں نے جہاد افغانستان کے لیے وقف کر دیا، اور باقی نصف تحفیظ القرآن کے مدارس کو عنایت کر دیا۔ ملت اسلامیہ کا کوئی بھی مسئلہ ہو، ان کے موقف میں ہمیشہ اسلام اور امتِ مسلمہ کے بہترین مفاد کو اولیت حاصل رہتی تھی۔ انہوں نے بھارت کے مسلمانوں کے لیے دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے ساتھ مسلم پرسنل لاء کے تحفظ، شاہ بانو کیس میں اسلامی قانون کی بالادستی، اسکولوں میں بندے ماترم کو ترانہ بنانے کے خلاف احتجاج کی قیادت کی، اور بابری مسجد کے سلسلے میں مجاہدانہ موقف اختیار کیا۔ عالم اسلام کے مسائل خواہ ان کا تعلق عرب دنیا سے ہو یا افغانستان سے، کشمیر سے ہو یا بوسنیا سے، انہوں نے حق اور انصاف کے مطابق پوری جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مولانا علی میاں کو پاکستان سے گہری محبت تھی، اور اسے اسلام کا گہوارہ دیکھنے کے متمنی تھے۔ وہ پاکستان کے اہل علم و دانش اور حکمرانوں پر زور دیتے تھے کہ اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر انہوں نے کلکتے کے ایک عام جلسے میں جو

www.abulhasanalinadwi.org

تقریر کی، اور جس طرح اپنے جذبات کا انھوں نے اظہار کیا، وہ پڑھنے کی چیز ہے (کاروانِ زندگی، جلد دوم، صفحات ۱۳۰ - ۱۳۶)۔ وہ پاکستان کو کیسا دیکھنا چاہتے تھے، اس سے ان کی کیا توقعات وابستہ تھیں، اہل پاکستان کے فکر و نظر میں کیا جھول ہے، اور انہیں حصولِ منزل کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ یہ ان کی متفرق تحریروں، اور بالخصوص ''حدیث پاکستان'' کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔

مولانا علی میاں نہ صرف میرے اور میری نسل کے مسلمانوں کے، بلکہ پوری امت مسلمہ کے محسن تھے۔ ان کی زندگی میں سلف کے بزرگوں کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی، اور وہ ایک خلق کے لیے چشمہ نور و ہدایت تھے۔ ان کا تعلق صرف بھارت سے نہیں، بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں سے تھا اور ہم سب ان کے اٹھ جانے سے اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہے ہیں۔ غم شدید ہے، مگر اللہ کے فیصلے پر قانع ہیں، اور ان کے لیے دل کی گہرائیوں سے مغفرت اور رفع درجات کی دعائیں کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مولانا علی میاں کی یاد میں منعقد ہونے والے اس سیمینار میں اہل علم ان کے فکر و دانش کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کریں گے اور کاروانِ دعوت و عزیمت کی حدی خوانی کا فریضہ انجام دیں گے۔

آخر میں اس دعا پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کو جنت کے اعلیٰ ترین درجے میں جگہ دے، اور اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو ان جیسے حق کے داعیوں اور احیائے دین کا جذبہ رکھنے والوں سے برابر سرفراز فرماتا رہے۔ (آمین)

www.abulhasanalinadwi.org

١

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

سید ابوالحسن علی ندوی

میری علمی اور مطالعاتی زندگی

— ۱ —

[۱۹۴۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ کے ترجمان ''الندوہ'' نے برصغیر کے مشاہیر اہل علم و دانش کو دعوت دی تھی کہ وہ طلبہ اور اہل ذوق کے لیے اُن کتابوں کی نشاندہی کریں جنھوں نے اُن کی سوچ اور اخلاق و کردار کی تعمیر میں خاص حصہ لیا ہے۔ مولانا علی میاں نے بھی (جب اُن کی عمر ۳۳ برس تھی) اپنے تاثرات و تجربات قلم بند کیے۔ یہ مضمون، دوسرے مضامین کے ساتھ مولانا محمد عمران خان نے ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' (اعظم گڑھ: مطبع معارف، س-ن) میں شامل کر لیا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۷۲ء میں ماہنامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) کے مدیر کی فرمائش پر مولانا علی میاں نے ۱۹۴۵ء میں لکھے گئے مضمون پر نظر ثانی کی، اور اس میں جا بجا اضافے کیے، تاہم جن کتابوں کا تذکرہ پہلی بار کیا گیا تھا، کم و بیش وہی رہیں، بعد میں اُنھوں نے اپنی علمی و تصنیفی اور تدریسی زندگی میں بلاشبہ سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا، جن پر تبصرہ کیا جانا مشکل تھا۔ مضمون پر نظر ثانی کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے بجا طور پر لکھا تھا: ''اس کا طرز واقعاتی اور سوانحی ہے، تنقیدی اور تحقیقی نہیں، اس لیے ذہن پر مطالعہ کے جو اثرات پڑے، ان کو بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ مصنفین کے خیالات، مسلک اور طرز فکر کی پوری ذمہ داری نہیں لی گئی، اور نہ کسی ایسی کتاب اور مصنف کا ذکر محض اس کے مفید یا بلند پایہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے جس کے مطالعہ کی نوبت نہیں آئی، یا ذہن و شعور نے اس سے کوئی گہرا اور دیرپا تاثر قبول نہیں کیا، اس لیے اس فہرست میں سے کسی کتاب یا مصنف کے نظر انداز ہو جانے کے معنی اس کی عدم افادیت یا تنقیص نہیں ہے۔'' مولانا نے نظر ثانی کرتے ہوئے جو چند حواشی لکھے تھے، وہ اُن کے نام کے اظہار کے ساتھ، باقی حواشی سے الگ کر دیے گئے ہیں۔ (مرتب)]

www.abulhasanalinadwi.org

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ ہے[۲] جس کے بزرگوں نے کبھی فصلِ خزاں میں بھی دنیا کو پیامِ بہار سنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اس خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دین داری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں، اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔

میرے والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی نے ۱۹۲۳ء کے شروع میں انتقال کیا، میری عمر اس وقت دس سال کی تھی، میرے بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب لکھنؤ میں میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے، اور میں اپنے وطن رائے بریلی میں اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ رہتا تھا، اور بھائی صاحب کی ہدایت کے مطابق خاندان کے بعض بزرگوں سے فارسی کتابیں پڑھتا تھا، اور لکھنؤ بھائی صاحب کے پاس آتا جاتا رہتا تھا۔

خاندان میں دستور تھا کہ تقریباً روزانہ اور ان دنوں میں خاص طور پر جب کسی حادثہ کی وجہ سے تسکین و مشغلہ کی ضرورت ہوتی، ایک گھر کی تمام بیبیاں ایک جگہ جمع ہو جاتیں، اور ہمارے ہی خاندان کے ایک بزرگ (سید عبدالرزاق صاحب کلامی، م ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ء) کی منظوم "فتوح الشام"[۳] پڑھی جاتی۔

سید عبدالرزاق صاحب کلامی مرحوم، حضرت سید احمد شہید کے ہمشیر زادہ منشی سید حمید الدین صاحب کے پوتے اور ان کے حقیقی بھائی سید عبدالرحمٰن صاحب کے نواسے تھے۔ واقدی کی عربی "فتوح الشام" کو کلامی صاحب نے بڑی قادر الکلامی اور جوش و دلی جذبہ کے ساتھ پچیس ہزار شعروں میں اردو میں نظم کیا ہے، چونکہ ان کو اس کا طبعی ذوق تھا، اور جہاد و حرارتِ ایمانی کی چنگاری اسی تنور سے منتقل ہوئی تھی جس نے ایک وقت میں سارے ہندوستان کو گرما دیا تھا، اس لیے نظم میں جوش و اثر اور کلام میں آمد ہے۔ حضرت خالدؓ سے شاعر کو عشق تھا، اور خواب میں بار بار ان کی زیارتیں ہوئی تھیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے ہوئے وہ بے قابو ہو جاتے ہیں، اور اشعار میں خاص روح اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ میری بڑی خالہ سیدہ صالحہ مرحومہ جو قرآن مجید

www.abulhasanalinadwi.org

کی بھی حافظہ تھیں، یہ منظوم ''فتوح الشام'' بڑے پر اثر و دلکش لہجہ میں پڑھتی تھیں، اور پڑھتے پڑھتے کتاب ان کو بہت رواں ہو گئی تھی۔ عموماً عصر کے بعد یہ مجلس ہوتی، بچے بھی کبھی اپنی ماؤں کے پاس کھیلتے کھیلتے یا کسی پیغام کے لیے آ جاتے، اور بے ارادہ کچھ دیر ٹھہر کر سنتے، کبھی بارادہ بیٹھ جاتے، اور کبھی مائیں اپنے پاس بٹھا کر سننے کا موقعہ دیتیں، پھر جب اس میں لطف آنے لگتا تو کھیل چھوڑ کر اس مجلس میں شریک ہوتے۔

میری خالہ مرحومہ جب سادہ و بے تکلف، لیکن پر اثر لہجہ میں یہ اشعار پڑھتیں، تو جہاد کا ایک سماں بندھ جاتا، دل امنڈ آتے، حضرت خالدؓ، حضرت ضرارؓ اور ان کی بہن حضرت خولہؓ بنت الازور اور دوسرے صحابہ کرامؓ و مجاہدین شام کی جاں بازی اور شجاعت کا ذکر آتا تو مجلس پر ایک کیف و سرور اور نشہ سا طاری ہو جاتا، کسی سخت معرکہ میں مسلمانوں کے گھر جانے اور کسی بہادر کے شہید ہونے کا تذکرہ ہوتا تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتیں، آنسوؤں کے یہ طوفان اٹھتے اور برستے تو ان کا چھینٹا ہمارے معصوم دلوں پر بھی پڑ جاتا، اور اس نرم مٹی کو تر کر جاتا۔ ''فتوح الشام'' کی ان زندہ مجلسوں نے دل پر یہ اثر چھوڑا کہ مجاہدین کی محبت و عظمت اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی قیمت کو کوئی نئی علمی تحقیق، اور جہاد کو مدافعانہ ثابت کرنے کی کوئی کوشش کم نہیں کر سکی۔ خون کے نقش کو سیاہی کے وہ نقوش کبھی نہیں مٹا سکے جو لیٹے لیٹے یا آرام سے بیٹھے بیٹھے کاغذ پر ثبت کیے جائیں، پھر وہ نقش جس کو بچپن کے پاک آنسوؤں نے پائیداری بخشی ہو۔

اتانی ھواھا قبل ان اعرف الھویٰ
فصادف قلباً خالیاً فتمکنا

دوسرا اثر یہ ہوا کہ اس قوم و مذہب (عیسائیوں) کے خلاف جس کے مقدر میں قیامت تک کے لیے اسلام کا عالم گیر حریف و مد مقابل بننا لکھ دیا گیا ہے، اور جس کی قائم مقامی اور وراثت موجودہ یورپ کے حصہ میں آئی ہے، ایک حریفانہ جذبہ اور عناد پیدا ہو گیا جس پر کسی ملک کے مقامی مسائل و حالات کبھی غالب نہیں آ سکے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس وقت شرفاء کے خاندانوں میں ''مسدس حالی'' کا عام رواج تھا۔ اس کے اشعار لوگوں کے نوکِ زبان تھے، تقریروں اور مواعظ میں جا بجا اس کے اشعار سے کام لیا جاتا، مضامین میں نقل کیے جاتے۔ میں نے بھی ''مسدس'' کو بڑے جوش و لطف سے بار بار پڑھا، اس کے اشعار اپنی تقریروں میں جو بچوں کے جلسوں میں کی جاتیں، اور ان انعامی مضامین میں جو مقابلہ کے لیے لکھے جاتے، بار بار نقل کیے۔ اس کا بہت سا حصہ زبانی یاد تھا۔ دل و دماغ پر ''مسدس'' کا اچھا خاصا اثر رہ چکا ہے، عام استعداد و معلومات میں اضافہ کے علاوہ اس کا ایک احسان یہ تھا کہ برسوں بعد مغربی مورخین و مصنفین کی یہ کوشش بالکل بے اثر رہی کہ جاہلیت عرب کی اتنی مدح سرائی کی جائے اور اس میں اگر خوبی کے کچھ ذرات تھے تو ان کو خردبین سے دیکھ کر پہاڑ بنا کر اس طرح پیش کیا جائے کہ معلوم ہو کہ عربوں میں اخلاقی انقلاب کی پوری تیاری تھی، اور کوہ آتش فشاں پھٹنے کو تھا کہ موقع شناسی سے بروقت اس کو چنگاری دکھادی گئی۔ اسلامی انقلاب کی پیغمبرانہ عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزہ کی اہمیت کو گھٹانے کی یہ علمی سازش مولانا حالی کے ان پُراثر اور سادے چند بندوں پر غالب نہ آسکی جن میں انہوں نے جاہلیت کا نقشہ اور اس کی اخلاقی پستی کی تصویر کھینچی ہے۔ نہ بعض قوم پرست عربوں کے مضامین اور تالیفات متاثر کرسکیں جو اپنی قومیت کے جوش میں کبھی کبھی جاہلیت کی طرف سے مدافعت کرنے لگتے ہیں، اور اس کے روشن پہلو کے دکھانے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔

میرے گھر کا ماحول دادا صاحب (مولوی سید فخر الدین صاحب خیالی) اور والد صاحب کی وجہ سے جو جید عالم اور عربی کے مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے، دینی کے ساتھ ادبی بھی تھا۔ بہت بچپن ہی سے اردو نثر و نظم کی درسی و غیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں، اس زمانہ میں عام طور پر مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کا اردو نصاب ''کمکِ اردو''، ''سوادِ اردو'' اور ''سفینۂ اردو'' رائج تھا۔ ہندوستان کا سررشتہ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں

www.abulhasanalinadwi.org

کرواسکا، ان میں ''سفینۂ اردو'' کا اثر آج تک دل و دماغ پر باقی ہے۔ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد، اور ذہنی بلوغ و ارتقاء کی بہت سی منازل طے کر لینے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آ جائے (جو افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے) تو شاید سب کام چھوڑ کر اُسی کو پڑھنے لگوں، اور بچپن کی یاد تازہ کروں، اور کم سے کم اپنی چند پسندیدہ نظمیں اور مضامین، مولوی ظفر علی خاں بی-اے علیگ کی نظم ''راجہ دسرت کی کہانی'' اور حیدرآباد کے طوفان پر ان کی نظم ''او نامراد ندی''، سید سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ''مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ'' کو ایک بار پڑھے بغیر [کتاب] ہاتھ سے رکھنی مشکل ہو جائے۔ اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف اور ذوق زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا، اور تحریر و انشاء میں کبھی مولویانہ خشکی پیدا نہ ہونے پائی۔ میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس و شگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیس و شیریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں، بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور دعوت و تلقین کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالب علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا، اور جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ قاضی سلیمان صاحب منصور پوری مرحوم کی سیرت ''رحمۃ للعالمین'' کا پہلا حصہ ہے، مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کی دونوں جلدوں کا بعض دوسری کتابوں کے ساتھ وی-پی رائے بریلی آیا ہے اور اس کے چھڑانے کے لیے اس وقت روپیہ نہ تھا، تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی، بار بار پڑھی، کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بعض خاص مقامات کا ہمیشہ خاص اثر پڑتا تھا، اسلام کے ابتدائی مبلغین کے واقعات حضرت مصعبؓ بن عمیر کی مکی و مدنی زندگی کا مقابلہ، ان کی والہانہ کیفیت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ طیبہ میں تشریف آوری اور حضرات انصار کی مسرت، استقبال اور جاں نثاری، انصار کا ایثار اور مہاجرین کے ساتھ ان کی دینی محبت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعات و حالات کا دل پر

www.abulhasanalinadwi.org

خاص اثر پڑتا تھا، ہل ٹہل کران کو پڑھتا تھا، لوگوں کو سناتا تھا اور اسی زندگی کی تمنائیں دل میں پیدا ہوتی تھیں۔ قاضی سلیمان صاحب کے درجات اللہ بلند فرمائے، اس عالم میں ہوتے تو کہتا کہ آپ کی کتاب کا مجھ پر بڑا احسان ہے، اس نے سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اس مزہ سے آشنا کیا جس کے بغیر یہ زندگی اور عالم خس وخاشاک ہے۔

در خرمن کائنات کردیم نگاہ

یک دانہ محبت است باقی ہمہ کاہ

انہی دنوں کے کچھ بعد میرے ہاتھ میں مولانا شبلی مرحوم کی ''الفاروق'' آ گئی۔ مطبع نامی۔ کانپور کی چھپی ہوئی، سراپا تصویر، پڑھی اور کئی بار پڑھی۔ عراق کی جنگوں بویب، جسر، قادسیہ وغیرہ کے میدان جنگ کی تصویر مولانا نے جن چھوٹے چھوٹے بے ساختہ وبرجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ فردوسی ''شاہنامہ'' میں مسلسل اشعار اور پرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کر سکا۔ ''الفاروق'' کے جاندار اور گرم جملے اور لفظ شمشیر وسناں کا کام کرتے ہیں۔ مولانا نے نظامِ خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی دلچسپی اور علمی تاثر نہیں ہے، لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔

مولانا کی دوسری کتاب جو اس دور میں پڑھی، ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرہ کتب میں تھیں۔ آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اوّل اوّل اسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا ہو جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی تصنیفات ''الغزالی''، ''سوانح مولانا روم'' اور ''المامون'' پڑھیں۔ غالباً اسی وقت سے ذہن نے یہ اثر قبول کیا کہ سوانح حیات اور تذکرہ نگاری کے لیے اس سے بہتر اسلوب اور زبان جدید اردو میں پائی نہیں جاتی، اور غیر ارادی طریقہ پر ان تذکروں اور ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے سلسلہ میں جو راقم کے قلم سے نکلا، اس کو اختیار کیا گیا۔ افسوس ہے کہ ''شعر العجم'' کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد

www.abulhasanalinadwi.org

میں آئی جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ اس تاخیر میں غالباً میری فارسی کی کم لیاقتی کو دخل تھا۔

عم محترم مولانا سید طلحہ صاحب حسنی مرحوم ایم-اے، استاد اورینٹل کالج -لاہور کی صحبت اور مجلسوں میں ''آب حیات'' سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہوگئے۔ اشخاص، شعراء اور ان کا کلام دماغ پر اس طرح نقش ہو گیا جس طرح بچپن کی دیکھی ہوئی چیزیں اور سنی ہوئی باتیں ذہن پر مرتسم ہو جاتی ہیں، اور ان کا دماغ پر کوئی بار نہیں ہوتا۔ ''گلِ رعنا'' گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اردو شاعری کی تاریخ اور شعراء کے متعلق اتنی معلومات ہوگئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہوگئی۔

میرے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید ابوالخیر صاحب برق لکھنؤ کی ٹکسالی زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ لکھنؤ کے محاورات اور صحت وصفائی زبان میں وہ سند کا درجہ رکھتے تھے، سخن شناس بھی تھے اور سخن سنج بھی، ابتداء میں شمس لکھنوی کو کلام دکھاتے تھے، پھر آغا ثاقب قزلباش لکھنوی کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہوگئے اور انھیں کے رنگ کی پیروی کی، ان کی صحبت میں زبان کا ذوق، اور اچھے برے کی تمیز پیدا ہوئی۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ سید حبیب الرحمٰن جامعہ ملیہ میں پڑھتے تھے، ان کو اردو شعر وشاعری کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ایک خاص ذوق یہ تھا کہ بچوں سے اساتذہ کے اشعار کا مطلب پوچھتے اور اردو میں تقریر وتحریر کے مقابلے کرواتے۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر مومن، غالب، ذوق اور لکھنؤ کے شعراء میں سے آتش اور امیر مینائی کے کلام سے ان کو خاص ذوق تھا، چنانچہ ان کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے، اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ اس زمانہ میں اودھ میں مشاعروں کا بڑا زور تھا، ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں کئی مشاعرے ہوئے، دیکھا دیکھی میں نے بھی کچھ موزوں کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ بڑے بھائی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بہت سختی سے روک دیا، اور یہ شغل

www.abulhasanalinadwi.org

بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

رائے بریلی میں گھر میں بعض عزیزوں کا ذخیرۂ کتب تھا جس میں مولوی محمد حسین آزاد کی ''نیرنگ خیال'' بھی تھی، عمر کے اس ابتدائی دور اور زبان و ادب کے اس ابتدائی ذوق میں آزاد کی نثر کا جو نثر اردو کا ایک مرصع نمونہ ہے، بہت اثر پڑا۔ بہت دنوں تک ''نیرنگ خیال'' اور ''آب حیات'' کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کیے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے، یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، شرر مرحوم اور رتن ناتھ سرشار کی بھی چند کتابیں پڑھیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے، بے کار و بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا برا اثر ضرور کرتی ہے، اس لیے اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے، لیکن ان کا کوئی خاص اثر یاد نہیں آتا۔

اردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد مرحوم کی کتاب ''یادِ ایام'' کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے، اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان کا بانکپن بھی موجود ہے جو میرے علم میں مصنف ''گلِ رعنا'' اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی تحریر کا مشترک جوہر ہے، اس طرز پر میرا مضمون جو اب یاد آتا ہے ''اندلس'' پر تھا۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے استاد شیخ خلیل [عرب] بن محمد بن شیخ حسین یمنی (محدث بھوپال) نے ہمیشہ کے لیے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے کے لیے سورۂ زمر بڑی توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھائی۔ عربی ادب، اور بالخصوص عربی شعر کا عرب صاحب مرحوم کو اللہ نے ایسا فطری ذوق بخشا تھا، جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ وہ اس قوم کے فرد تھے جس کے متعلق زبانِ نبوت نے شہادت دی ہے، کہ ایمان اس کے گھر کی دولت ہے (الایمان یمان)، عجم کا ''حسن طبیعت'' ننھیال سے اور عرب کا ''سوزِ دروں'' انہوں نے ددھیال سے پایا تھا۔ قرآن مجید پڑھتے تھے تو خود بھی روتے تھے، اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے، قصائد پڑھتے تھے، تو سوق عکاظ کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ توحید ان کا ذوقی مضمون تھا، دل کھول کر پڑھایا، اور دل کو توحید کے لیے کھول دیا، وہ

www.abulhasanalinadwi.org

دن ہے اور آج کا دن، اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے۔ "الا للّٰہ الدین الخالص "(سورہ زمر) کا نقش قائم ہے، اور اس کے سامنے ما نعبد هم الا لیقر بونا الی اللّٰہ زلفا (زمر)، (مشرکین کہتے ہیں کہ ہم اپنے معبودوں کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں) کا حیلہ اور دعویٰ، جو ہمیشہ کے نظام شرک کا سب سے بڑا فلسفہ ہے، تارِ عنکبوت معلوم ہوتا ہے۔

ادب میں شیخ خلیل عرب کا ایک مجتہدانہ نصاب تھا، جو ہندوستان میں بالکل نیا تھا، ان کو اپنا ذوق تلامذہ کی طرف منتقل کرنے میں خاص کمال حاصل تھا، انہوں نے مبادیٔ صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ مصر و بیروت کے سلسلہ قراءت (ریڈرس) المطالعۃ العربیہ، الطریقۃ المبتکرۃ (۱۵ اجزاء)، مدارج القراءۃ (ایک جزء) کے بعد ابن المقفع کی "کلیلہ و دمنہ"، "مجموعۃ من النظم و النثر" حصہ نثر کا ایک حصہ حفظاً اور حصہ نظم، نہج البلاغہ حصہ کتب، اور نظم میں "حماسہ"، اور معری کی "سقط الزند"، اور "دلائل الاعجاز للجرجانی" بڑے ذوق و شوق سے، نیز "مختصر تاریخ ادب اللغۃ العربیہ" پڑھائی، عربی کے قواعد زبان کی مشق میں سب سے بڑا احسان اس گمنام کے نامور ہم نام ابوالحسن علی الضریر کے رسالہ "الضریری" کا ہے، جو چند اوراق کی کتاب ہے۔ عرب صاحب نے اس کی عملی مشق کرائی، اور یہی مشق اس وقت تک کام آرہی ہے۔ اس تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک وقت میں مختلف علوم و فنون اور زبانوں کی تعلیم نہ تھی، صرف عربی زبان و ادب کی تعلیم تھی اور وہی اوڑھنا بچھونا، وہی مقصدِ حیات اور وہی ذوق طبع۔

عرب صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے محبوب و منتخب مصنفین اور ان کی محبوب و منتخب تصنیفات کو اس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے، گویا وہی زبان و ادب اور طرزِ ادا کا واحد نمونہ اور ادب و ذوق کا منتہیٰ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے، اور طالب علم ان کا رنگ اتارنے لگتے تھے۔ ابن المقفع اور جاحظ نثر میں، عبدالقاہر جرجانی ذوق، نقدِ ادب اور سخن فہمی میں، متنبی و بحتری شعر میں ان کے منتخب لوگ تھے، اس لیے ان کے طلبہ اپنی بڑی سعادت اور کمال سمجھتے تھے کہ ان میں ان کا رنگ اور انداز پیدا ہو جائے۔ راقم

www.abulhasanalinadwi.org

الحروف نے ابن المقفع اور صاحب نہج البلاغہ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی، اور اس کا بڑا فائدہ ہوا۔ عرب صاحب کا ایک تعلیمی نکتہ یہ بھی تھا کہ وہ طلبہ کے دماغ پر یہ نقش قائم کر دیتے تھے کہ ادب ونثر کا ترکہ صاحب ذوق طلبہ کی میراث ہے، جس کے استعمال کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں انہیں باک نہیں ہونی چاہیے، چنانچہ ان کی ہمت افزائی سے کبھی کبھی ان صاحب طرز انشاء پردازوں کے بعض بعض جملے اور تعبیریں اپنی تحریر میں نگینہ کی طرح جڑ کر انعام حاصل کیا۔

اس تعلیم کے انتہائی مرحلہ پر مصر کے مشہور صاحبِ طرز نثار سید مصطفی لطفی المنفلوطی کی کتاب ''النظرات'' عرب صاحب نے دیکھنے کو دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا، اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار رہوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اڑائی۔

میری مکرر خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں صاحب جیسا متبحر استاد نصیب ہوا، جو مولانا غلام احمد صاحب لاہوری، مولانا لطف اللہ صاحب کوئلی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری اور شیخ الاسلام شیخ حسین یمنی کے شاگرد، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے مجاز تھے۔ یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع مزاحم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے، مولانا کی صحبت تھی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ تھے، اور ندوۃ العلماء کا نادر علمی ذخیرہ اور مولانا کے علمی مآخذ تھے۔

مولانا کے یہاں تعلیم کی دوسری خصوصیتیں تھیں جن کی وجہ سے فن کا ذوق اور اس کا کچھ (بہ قدر استعداد و توفیق) عملی ملکہ حاصل ہو جایا کرتا تھا، ایک یہ کہ تعلیم بالکل ناقدانہ اور محدثانہ اصول پر تھی، مولانا کو مذہب حنفی پر کلیۃً اطمینان تھا، اور وہ اس کے زبردست وکیل وترجمان تھے، لیکن ان کا درس حدیث محدثانہ طرز اور نقد حدیث، اصول حدیث ورجال کی بحثوں پر مبنی تھا، اور اس میں ہندوستانی طرزِ تدریس حدیث سے زیادہ یمنی طرزِ حدیث، اور شوکانی کے طرزِ تالیف کا اثر تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

شوکانی کی تالیف ''نیل الاوطار'' اس کا ایک نمونہ ہے۔ محدثین میں خصوصاً [محمد بن] ابراہیم الوزیر اور محمد بن اسمٰعیل الامیر، اور علامہ مقبلی کی تالیف، اور اصول حدیث کے بعض نوادر ان کے خاص مآخذ تھے، جن میں ''تنقیح الانظار'' اور ''توضیح الافکار'' کے قلمی متن وشرح کے مسودات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ دوسری چیزوں کے مقابلہ میں علامہ ابن الترکمانی کی ''الجوہر النقی''، امام زیلعیؒ کی ''نصب الرایہ'' سے بہت مدد لیتے تھے، اور حدیث صحیح کا جواب حدیث صحیح سے اور نقد حدیث کے مسلمہ اصول ومجتہدانہ مباحث سے دیتے تھے، دوسری چیز یہ کہ ان کا درس عملی تھا، جس میں طالب علم استاد کے ساتھ شریکِ عمل ہوتے تھے۔ مولانا طلبہ ہی سے کتابوں کے نقول، مذاہب کے دلائل، رجال پر نقد وجرح کی بحثیں نکلواتے تھے، اس طرح تدریس وتالیف کا سلیقہ سکھاتے تھے۔

درس حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی ''شرح مسلم'' سے ہوا، جو ایک مبتدی طالب علم کے لیے بڑا اچھا استاد ہے۔ شروحِ حدیث سے فائدہ اٹھانے اور ذہن پر زور ڈالنے کا ملکہ اسی سے پیدا ہوا، ''فتح الباری'' سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی، اس وقت حافظ ابن حجر کی وسعت نظر، فن حدیث پر ان کی قدرت، اور اس کے وسیع ذخیرہ پر ان کا احتواء دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ کتاب مسلمانوں کا ایک علمی کارنامہ ہے، جس کی نظیر سے دوسری ملتوں کا مذہبی ذخیرہ خالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے کہیں وجد وسرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر ابوداؤد کی ''کتاب الادعیہ'' اور ترمذی کی ''کتاب الزہد والرقاق'' نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں ''احیاء العلوم'' دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں بڑے بھائی صاحب کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

۱۹۳۰ء میں شیخ خلیل عرب کی تجویز اور بھائی صاحب کی دعوت پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں تدریسِ ادب کے لیے ایک فاضل ومحقق صاحبِ زبان مراکشی عالم تشریف لائے، یہ علامہ شیخ تقی

www.abulhasanalinadwi.org

الدین ہلالی تھے، جن کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان وادب کے بہت سے مبادی و بدیہیات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق واصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے، اور عجمیت و ہندیت کے اثر سے کلیتہً آزادی نصیب نہ ہوتی۔ ان کو اگر نہ دیکھا ہوتا، تو قرن ثانی وثالث کی زبان کو مردہ اور صرف کاغذ کے نقش ونگار سمجھتے، اس ایک شخص میں سلف کی احتیاط اور علمی تورع (عدمِ تحقیق کی حالت میں بے تکلف لاادری کہہ دینا)، مغربِ اقصیٰ خصوصاً اہل شنقیط کا حفظ واستحضار، اہل لغت کا اتقان، علمائے نحو کی پختگی، اور اہل زبان کی شیریں نوائی اور خوش گفتاری جمع تھی، بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، ہر جملہ ادب کی جان ہوتا تھا جس کو آدمی جس ادب کی کتاب کے حاشیہ پر چاہے لکھ لے، میں نے ''اغانی'' اور جاحظ کی کتابوں کی زبان بولتے ہوئے ان کے سوا کسی کو نہیں سنا، جو لکھتے تھے، وہی بولتے تھے، اور جو بولتے تھے وہی عربی زبان کا روزمرہ اور محاورہ ہے۔

ہلالی صاحب سے عربی ادب وشعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس وسفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت وافادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں، ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ وایوان اور زبان کی دیوار کے نقش ونگار ہیں، ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے، جو تمدن وتخیل کی ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم و تربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے، اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جارہی ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ہلالی صاحب کہتے تھے کہ ''حریری'' اور ''متنبیّ'' و ''حماسہ'' ادب عربی کی اعلیٰ کتابیں ہیں جو بلادعربیہ میں زبان کی طویل اور مسلسل تعلیم اور زبان کی مشق کے بعد پڑھائی جاتی ہیں، اور عربی ادب کی تکمیل کرنے والے فضلاء ان کو پڑھتے ہیں، لیکن ہندوستان میں یہی کتابیں ادب کا کل سرمایہ اور جمع خرچ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان سے پہلے زبان کو ایک زندہ زبان کی طرح پڑھا جائے، ان کا یہ بھی اصرار تھا

www.abulhasanalinadwi.org

کہ زبان کو انسانی زبان کی طرح بغیر ترجمہ کی مدد کے پڑھنا چاہیے، اس پر شیخ نے دارالعلوم میں مسلسل تقریریں کیں، اور اپنے مدعا کو دلائل سے ثابت کیا۔

دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف ونحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے۔ زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف ونحو کے قواعد بے کار ہیں۔ مفردات، الفاظ وجمل مکان کی اینٹیں ہیں، اور نحو کا علم اصول تعمیر کے قواعد اور انجینئر ی کا فن۔ اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئرنگ اور اصولِ تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

ہلالی صاحب سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ زبان کا بہترین نمونہ تاریخ کی مستند کتابیں اور عہد عباسی کے ادباء کی غیر مصنوعی تصنیفات ہیں، اس کے لیے انہوں نے ابن قتیبہ کی ''الامامۃ والسیاسۃ''، ابن المقفع کی ''کلیلہ ودمنہ''، ابوالفرج الاصبہانی کی ''کتاب الاغانی'' اور جاحظ کے رسائل کی سفارش کی۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا۔ ادھر ہلالی صاحب کا فیض عام تھا، ادھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی عربی کا رسالہ ''الضیاء'' نکال رہے تھے، عربی زبان وتحریر، نقد وتبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہو رہا تھا۔ مصری، شامی، عراقی اور مغربی (الجزائری ومراکشی) رسائل و جرائد تبادلہ میں آتے تھے، پڑھے جاتے تھے، اور ان پر گفتگو رہتی تھی۔ یہ میری عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے اور عرب اساتذہ کی صحبت میں رہنے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا، اس لیے نہیں کہ ہندوستانی علماء کے بقول (جو سراسر غلط فہمی ہے) یہ کسی جدید عربی میں ہوتے تھے، بلکہ طرزِ ادا اور اشتقاق کی ناواقفیت کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بھائی صاحب کی مدد سے میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر، اور اظہار خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب وزبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

مصری وشامی ادباء وفضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربی زبان کے خزانہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ

www.abulhasanalinadwi.org

اپنے اخبارات ورسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان کے بقول عہد عباسی کا ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے، لیکن معنوی وذہنی حیثیت سے ذوق ودماغ پر ان مضامین کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا، اور ہمارے ہندی ذوق نے جس نے ہندوستان کے زیادہ سنجیدہ، زیادہ گہرے اور زیادہ طاقتور اسلامی ادبیات اور ماحول میں نشو ونما پائی تھی، عربوں کے قوم پرست اور وطنی افکار، مغرب سے ذہنی مرعوبیت، اور خیالات کی سطحیت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا، اور ذہن نے اس کی پستی اور کمزوری صاف محسوس کی۔ ان مضامین کو میں نے ہمیشہ روحانی اذیت اور ذہنی کوفت کے ساتھ پڑھا، اس حیثیت سے امیر شکیب ارسلان کی تحریروں اور خیالات میں نسبتاً کچھ گہرائی اور پختگی اور اسلامیت معلوم ہوئی، لیکن امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص اور علاج کی تجویز میں اس وقت جس شخص کے خیالات و افکار میں نسبتاً زیادہ بلند نظری اور باریک بینی معلوم ہوئی، اور جس کی فراست نے متاثر کیا، وہ سید عبد الرحمٰن الکواکبی کی تخیلی کتاب ''ام القریٰ'' ہے، جواب پرانی ہو چکی ہے، اور اس کے لائق مصنف کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں، لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہ قومیت عربیہ کے اولین نقیبوں میں ہیں، اور انہوں نے سب سے پہلے دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں میں بیزاری پیدا کرنے کی کوشش کی، دل پھیکا ہو گیا اور عقیدت میں کمی آئی۔

۱۹۲۷ء یا ۱۹۲۸ء میں رسالہ ''توحید'' امرتسر میں جو مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا، ''تیرھویں صدی کا مجدد اعظم'' کے عنوان سے حضرت سید احمد شہیدؒ کے متعلق مولوی محی الدین قصوری مرحوم کا ایک سلسلہ مضمون شائع ہوا۔ بھائی صاحب کے حکم سے ۱۹۲۹ء۔ ۱۹۳۰ء میں میں نے اس کا عربی میں آزاد ترجمہ کیا جو ہلالی صاحب کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا مرحوم نے ''المنار'' میں بھی شائع کیا، اور ''ترجمة الامام السید احمد بن عرفان الشهید'' کے نام سے علیحدہ رسالہ کی شکل میں بھی چھاپ دیا، اس موضوع سے یہ میرا پہلا تعلق تھا۔

میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہو چکا تھا، اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیمؒ کی ''زاد المعاد'' میرا

www.abulhasanalinadwi.org

کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق و معلم تھی۔ دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کر دیا جائے، اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے، تو میں کتاب اللہ اور ''زاد المعاد'' اپنے ساتھ رکھوں گا، اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے، روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد و احکام سکھائے، اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب ''قیام اللیل'' ہے۔ اس کتاب کا خاص کام یہ ہے کہ عقلی اور استدلالی طریق سے نہیں، بلکہ قلبی اور ذوقی طور پر دلچسپی اور شوق کا رخ بدل دیتی ہے، اور سارا کھیل دلچسپی اور انس ہی کا ہے، اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں، اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پر اثر تفسیر، اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کر جائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پر آشوب زمانہ میں دستگیری کی، یہ اور حافظ ابن قیم کی ''الجواب الکافی'' نوجوانی میں بہترین نگران اور اتالیق، اور اخلاقی محتسب و ناصح ہیں، زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں جس کتاب نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اٹھانے اور ان کے احترام اور طالب علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا، وہ صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی چھوٹی سی کتاب ''تعلیم المتعلم'' ہے۔ اسی طرح تحصیل علم میں علوئے ہمت، عزیمت اور ذوق علم پیدا کرنے میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کی کتاب ''علمائے سلف'' نے مہمیز کا کام دیا، اور دل و دماغ پر علمائے سلف کی عظمت و عزیمت کا نقش ثبت ہو گیا۔ میرے نزدیک ہر سچے طالب علم کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کو حرز جان بنا کر رکھنا چاہیے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تصنیفات کو الٹتے پلٹتے،

www.abulhasanalinadwi.org

ان کا ایک مسودہ ''ارمغان احباب''[۴] کے نام سے ہاتھ آ گیا، جو انہوں نے اپنی ۲۶ سال کی عمر میں لکھا ہے، اور ۱۳۱۲ھ کے طالب علمانہ سفروں کا روزنامچہ ہے، نہایت سادہ اور بے تکلف، لیکن اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردان خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا، جہاں والد مرحوم حضرت سیدنا لکھتے ہیں، وہاں دل جھوم جاتا تھا، اور دل ایک خاص کیف محسوس کرتا تھا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہل اللہ کی محبت وعقیدت پیدا کی اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا، جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، حضرت مولانا محمد علی بانی ندوۃ العلماء کا چھوٹا سا رسالہ ''ارشاد رحمانی'' ہے جس میں شیخ وقت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے کچھ حالات، حکایات وملفوظات اور سلوک وطریقت کے کچھ نکات ہیں۔ حضرت مولانا گنج مرادآبادی میرے والد مرحوم کے شیخ تھے، اور بچپن سے گھر میں آپ کا ذکر خیر سنا تھا۔ اس روحانی تعلق اور ذہنی ربط سے کتاب ذوق وشوق سے پڑھی، محبت کے اشعار، اور عاشقانہ کلمات دل میں چبھ گئے، اور تیرونشتر کی طرح دل میں اتر گئے۔ اس سے کچھ پیشتر یا بعد والد مرحوم کا ایک مختصر سا رسالہ یا مقالہ جو ''استفادہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا، بار بار پڑھا تھا، اس میں انہوں نے اپنے گنج مرادآباد کی حاضری کے حالات، اور وہاں کے مشاہدات، اور مولانا کے الطاف وعنایات کے واقعات قلم بند کیے تھے، اس نے مولانا کی محبت وعقیدت، اور اہل اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ و بزرگان دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے۔ ان مجموعوں میں حضرات چشتیہ کے ملفوظات میں سب سے زیادہ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات ''فوائد الفواد'' اور حضرات نقشبندیہ کے ملفوظات میں حضرت شاہ غلام علی کے ملفوظات ''درالمعارف'' کا قلب پر اثر پڑا۔ اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت و مطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے

www.abulhasanalinadwi.org

واقعات، اور بے ساختہ گفتگو اور خلوص کی گرمی و نرمی محسوس کی۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات و مباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بہ کثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا، البتہ درد و محبت اور سوز و گداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں، اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، درد و محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے۔

ہم نے اپنے آشیانہ کے لیے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

بزرگوں کی مجالس و ملفوظات کے سلسلہ میں تاریخی ترتیب کا لحاظ کیے بغیر یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ عرصہ کے بعد جب مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ان کی التفات و عنایات سے سرفراز ہوا تو ان کی زبان سے دینی حقائق و نکات، اور سلوک و تصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالم حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات و مجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائی ۵۔ اپنے علم و فہم کے مطابق یہ کہنے میں ذرا مبالغہ معلوم نہیں ہوتا کہ عرصۂ دراز سے تزکیہ و احسان اور دینی حقائق کے سلسلہ میں ایسے بیش قیمت ملفوظات، اور ایسے گہرے علوم و مضامین سننے میں نہیں آئے۔ **و الغیب عند اللہ ،** [اور] **وفوق کل ذی علم علیم۔**

طالب علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا، اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ و متکلم، ایک جامد و خاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب ۶، اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔ شاہ صاحب کے واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور ابن عبدالہادی وغیرہ کی بعض کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جا کر "احیاء العلوم مع تخریج عراقی"، "فضل علم السلف علی الخلف"، "دفائن الکنوز"، "تلبیس ابلیس"، "مختصر منہاج القاصدین" وغیرہ منگوائیں۔ "تلبیس

www.abulhasanalinadwi.org

ابلیس'' کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن و موثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنہوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل و دماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابلِ ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔

نظام و نصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی و تجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب و شیخ تقی الدین الہلالی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ماحول اور لٹریچر نے اس کا نشو و نما کیا، ندوۃ العلماء کا تخیل، اور دین و دنیا کی باہم آمیزی، اور علماء و اہل دین کی قیادت و اقتدار کی ضرورت و اہمیت کا احساس نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے اس خطبۂ صدارت سے وضاحت و قوت کے ساتھ ہوا جو موصوف نے ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۲۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ میں پڑھا تھا، اور میں نے اس کو غور سے بعد میں چھپا ہوا پڑھا، پھر مزید مطالعہ سے اس پر یقین اور اطمینان بڑھتا رہا، اور یہ دونوں چیزیں میرے علمی عقائد و نظریات کا جزو بن گئیں۔

مغربی تہذیب و نظام سے نفرت اصل میں بڑے بھائی صاحب ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی صاحب مرحوم بی۔ ایس۔ سی، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی صحبتوں اور مجلسوں میں پیدا ہوئی، جو اس سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے، اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی، اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب و ثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست و ہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ''سچ'' اور ''صدق'' کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت و مادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر کی پرانی کتاب ''معرکہ مذہب و سائنس'' (مترجمہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم) اور لیکی کی ''تاریخ اخلاق یورپ'' (مترجمہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی) نے بڑی مدد دی، اور اس

www.abulhasanalinadwi.org

سے بڑا مواد ملا جس سے اپنے مضامین واستدلال میں بہت کام لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے مضامینِ ترجمان القرآن اور ان کی کتاب ''تنقیحات'' نے اور زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کے ''ترجمان القرآن'' کے مضامین نے طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر پر بھی اثر ڈالا، اوران کی تحریروں نے ذوق وفکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اوراس کے حقیقی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی و اصولی تضاداور دونوں کے اتحاد کے عدم امکان کے متعلق سب سے زیادہ واضح اور پرمغز چیز محمد اسد صاحب کی کتاب Islam at the Crossroads معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشیں ہوا۔ عرصہ دراز کے بعدان کی دوسری فکر انگیز، لیکن دلچسپ کتاب Road to Mecca شائع ہوئی، جس کا عربی ترجمہ ''الطریق الی مکۃ'' انہوں نے ازراہ عنایت مجھے خود بھیجا، یہ اس اجمال کی تفصیل، اوراس نظریہ کی عملی تطبیق تھی جو انہوں نے اپنی پہلی کتاب میں پیش کیا تھا۔ میں نے ان کی اجازت سے اس کا ترجمہ اور تلخیص ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے شائع کیا، یہ کتاب ہر جویائے حق اور صاحب ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

۱۹۳۸-۳۹ء میں مصر کے فاضل مولف ڈاکٹر احمد امین کی ''فجر الاسلام'' (جلد-۱) اور ''ضحیٰ الاسلام'' (جلد-۳) کے مطالعہ کا موقعہ ملا، یہ عہد نبوی اور عہد اموی وعباسی کی فکری، ادبی، اخلاقی، سیاسی وعلمی تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج اخذ کیے ہیں، جزئیات سے کلیات قائم کیے ہیں اور ہر دور اور حیات انسانی کے ان مختلف شعبوں پر مجموعی نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب مصنف کی قوتِ ملاحظہ اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے، اور اگرچہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیتہً پاک نہیں، اوراس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کسی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے، اوراس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیے، مگر میری سادہ لوحی کہیے، یا ناقدانہ نظر کی کمی کہ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا پورا احساس اس وقت نہیں ہونے پایا، اس کا صحیح احساس وعلم اوراس سے اذیت اس وقت ہوئی جب

www.abulhasanalinadwi.org

میں نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی فاضلانہ کتاب ''السنۃ ومکانتھا فی التشریع الاسلامی'' پڑھی جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طلب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا توارد معلوم ہوا، کئی جگہ حواشی پر اختلاف یا اظہار خیال کیا، یا مصنف کو بے اختیار داد دی، لیکن سب سے زیادہ فائدہ جوان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرز تحریر کا ہے جس میں احمد امین اپنے معاصرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام کے ''تذکرہ'' سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل ودماغ پر قائم ہوئی، ''تذکرہ'' اور ''الہلال'' کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ ''ترجمان القرآن'' کی دوسری جلد سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشے سامنے آئے، اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ سورۂ یوسف پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادب عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمۂ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دارالعلوم میں سپرد ہوئی، تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے حواشی کی قدر آئی، جن میں انہوں نے مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔ اس میں مولانا کی سلامت فکر، حسن انتخاب اور تحریر کی شگفتگی بخوبی عیاں ہے۔ میں نے دیوبند کی ایک ملاقات میں مولانا سے اپنا یہ تاثر ظاہر کیا، مولانا کو بڑی مسرت ہوئی، اور بعض صاحبوں سے اس کو نقل کیا۔

جدید معلومات وتحقیقات نے تفسیر کے سلسلہ میں جو نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان کا حل تلاش کرنے میں، اور قرآنی اعجاز کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کرنے میں ''تفسیر ماجدی'' اور اس کے مصنف مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے تفسیری مضامین وتحقیقات سے بڑی مدد ملی، اور اپنے مطالعہ ومعلومات میں تحقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی تمام تصنیفات نقدِ کاملِ عیار، اور علم وانشاء کے لحاظ سے معیار ہیں، لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ''خطبات مدراس''

www.abulhasanalinadwi.org

ہے۔ اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے، تو اس کو زندہ جاوید بنادے، اور اگر مقبول ہو (جیسا کہ آثار سے بھی ظاہر ہے)، تو مغفرت کے لیے تنہا کافی ہے۔ بار بار مزے لے لے کر پڑھی، حدیث و سیرت کے نئے نئے پہلو سامنے آئے، اور اس عہد انقلاب میں اہل علم اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کے سامنے حدیث و سیرت پیش کرنے کی راہ معلوم ہوئی۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے۔ بہت سے لوگوں کا ان کے مخصوص طرزِ تحریر، اور بات سے بات نکالنے کی وجہ سے جی نہیں لگتا، لیکن میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا، اور اپنے علم میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ان کی کتاب ''النبی الخاتم'' سیرت پر بڑی البیلی کتاب ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری کتاب ''[ہندوستان میں مسلمانوں کا] نظام تعلیم و تربیت'' بڑی پر از معلومات اور موثر کتاب ہے۔ تیسری کتاب ''تدوین حدیث'' بڑی مبصرانہ اور نکتہ ورانہ تصنیف ہے۔ ان کا مضمون ''مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ'' بھی بڑی بصیرت و معلومات کا ذریعہ بنا، اور اس سے ان کے دوسرے مقالے جو ''الفرقان'' شاہ ولی اللہ نمبر میں شائع ہوا تھا، تاریخ ہند کے نئے گوشے سامنے آئے۔

''حیاتِ جاوید''، ''وقارِ حیات'' اور ''تہذیب الاخلاق'' کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی و سیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جس کی تکمیل ''حیاتِ شبلی'' سے ہوئی۔ مولوی سید طفیل احمد صاحب کی ''حکومتِ خود اختیاری'' اور ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی۔ ہندوستان کی اسلامی، دینی و علمی تاریخ کا سب سے بڑا خزانہ گھر میں موجود تھا، کبھی خیال نہیں آیا تھا، حیدر آباد سے اشاعت کی تحریک ہوئی، تو والد مرحوم کی تصنیف اور سرمایہ حیات ''نزہۃ الخواطر'' کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں۔ ان کتابوں سے ہندوستان کی آٹھ سو برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آ گئی، علماء و مشائخ، اہل درس و اہل تصنیف، اہل ذوق و اہل کمال، سلاطین و وزراء، امراء و رؤسا کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ

www.abulhasanalinadwi.org

کے ایسے قیمتی نوادر و نکات مفت میں مل گئے، جن کے لیے سینکڑوں کتابیں الٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا جس کو ہندوستان کا کوئی طالب علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو، نظر انداز نہیں کرسکتا، اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔ علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا کام نہیں لیا، جتنا ''نزہۃ الخواطر'' کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لیے تاریخ و تصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہیے، اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کرسکا، لیکن اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال مرحوم کا بڑا غلبہ رہا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبالؒ کے کلام کا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات اور تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح و جسم میں پیوست ہوچکی ہیں۔ اقبال اور ان کے کلام پر اردو میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو شاید کسی معاصر شخصیت اور اس کے فکر پر شائع نہیں ہوئیں، لیکن ان میں سب سے زیادہ پر مغز اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ''روح اقبال'' معلوم ہوئی۔

علامہ مرحوم سے ۱۳۵۶ھ /۱۹۳۷ء میں دوسری ملاقات کی، اور کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ پنجاب کے ایک رسالہ میں ''عارف ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلاد عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول کر رہتا، اور ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ علامہ مرحوم کی وفات کے بعد مصر میں پڑھے جانے کے لیے ایک مفصل و طویل مضمون علامہ مرحوم کی زندگی و خصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالم عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق ''روائع اقبال''۷ کے ذریعہ

www.abulhasanalinadwi.org

ہوئی، جس نے بلاد عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ ابتدائی استغراق و انہماک کے دور میں تنبیہ ہوئی کہ کسی انسان کے کلام سے اس قدر انہماک اور شیفتگی اچھی نہیں۔ اصل شغف اور انہماک کی چیز اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام اور کلام ہے جو قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے، اور جس کو جو کچھ ملا ہے، اسی سے ملا ہے، لیکن اب بھی ان کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں، اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اب بھی اس کو طاقت و خود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ''مذہب و عقلیات'' پر نظر پڑی جو ''بہ قامت کہتر و بقیمت بہتر'' کی صحیح مصداق ہے۔ ذوق و ذہن نے اس کو پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی اور کوتاہی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ، اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا، پڑھا، مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا: ''ان هم الا يخرصون'' اور ''بل كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه و لمّا يأتهم تأويله'' کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی۔ حافظ ابن تیمیہ کی ''تفسیر سورۂ اخلاص'' اور ''کتاب النبوات'' کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نے کیا۔

میرے معلم و مربی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم، جن کی اصابتِ رائے، خداداد سلامتِ فکر، استقامت اور گہرا علم زندگی کی ہر منزل، اور ہر موڑ پر میرا دستگیر رہا، برابر حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت شاہ ولی اللہ کی ''ازالۃ الخفاء'' کے مطالعہ کی تاکید فرماتے رہے، لیکن نوعمری کی سطحیت اور کم سنی کی عجلت کی وجہ سے کبھی دو چار صفحے سے زیادہ نہ پڑھ سکا۔ دفتر اول کا پہلا مکتوب جو حضرت نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کو لکھا ہے، اور جس میں اپنے بہت سے واردات اور راہ سلوک کے تجربات لکھے ہیں، ہمیشہ ہمت شکن ثابت ہوا، اور جس طرح بدشوق بچے

www.abulhasanalinadwi.org

ہمیشہ قرآن کی تلاوت میں پہلا پارہ پڑھ کر چھوڑ دیا کرتے ہیں، میں بھی اس مکتوب کے چند صفحات پڑھ کر کتاب ہاتھ سے رکھ دیا کرتا تھا، لیکن ایک بار اس کا عزم کرلیا کہ "مکتوبات" کا لفظ بہ لفظ مطالعہ کروں گا، چاہے بڑا حصہ سمجھ میں نہ آئے، چنانچہ اس کے چاروں [کذا، تینوں] دفتر پڑھے، لفظ بہ لفظ، دل لگا کر اور لطف لے لے کر پڑھے۔ بے استعدادی، قوتِ مطالعہ کی کمی اور علومِ عقلیہ و آلیہ کی بے بضاعتی قدم قدم پر عناں گیر رہی، لیکن ایک عامی کے حصہ میں جو کچھ آیا، اس پر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ

آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

ایک عرصہ کے بعد حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت مجدد اور حضرت مخدوم بہاری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آ گیا، وحی و نبوت کی قطعیت، مقامِ نبوت و منصب رسالت کی بلندی و برتری اور خصائصِ نبوت و انبیاء اور نبوت و ولایت کے لوازم و مابہ الامتیاز چیزوں کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، ان پر دقتِ فکر کے لحاظ سے یونان و عجم کا پورا فلسفہ سو بار قربان، اور وجد آفرینی اور کیف آوری کے لحاظ سے شعراء کے دواوین اور ادب کی بیاضیں ہزار بار نثار۔ مکتوبات مجددی کے تذکرہ کے آخر میں سنت و بدعت کے بارے میں جو مجددانہ کلمات و تحقیقات قلم سے نکلی ہیں، ان سے بڑا شرح صدر اور یقین کا اضافہ ہوا، نیز دورِ اکبری و جہانگیری میں دین کی نصرت و حمایت کے سلسلہ کے مکتوبات نے دینی حمیت و غیرت کو بیدار کیا، اور افسردہ قلب و جسم میں دین کی حرارت پیدا کی، انسانی تصانیف اور تحریروں میں جن پر زمانہ گزر چکا ہے، کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گزر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثیر موجود ہے جو عموماً لکھنے کے وقت ہوتی ہے۔

میرے محترم دوست اور دینی کاموں میں رفیقِ کار مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے "الفرقان" کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو اس بے بضاعت سے بھی فرمائش کی کہ اس میں

www.abulhasanalinadwi.org

حصہ لے۔ میں نے ''شاہ ولی اللہ بحیثیت مصنف'' کا عنوان اپنے لیے منتخب کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شاہ صاحب کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالی جائے، کچھ پہلے دیکھی تھیں، کچھ نہیں دیکھی تھیں۔ اس سلسلہ میں ''ازالۃ الخفاء'' کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی، یہ اپنی نکتہ آفرینی کا دوسرا نمونہ تھا۔ انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا، جتنا مکتوبات اور ''ازالۃ الخفاء'' سے، علم کا چشمہ ابلتا نظر آتا ہے، آدمی ایک نکتہ کا لطف نہیں لینے پاتا کہ دوسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے، اور دوسرے سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ تیسرا نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ آیات کی تفسیر و تطبیق میں اور خلافت کے خصائص، نیز دینی انحطاط و تغیر کی تدریجی تاریخ کی تدوین میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ علمی پختگی کے ساتھ کیا لطف و لطافت میں ادب و شاعری سے کم ہے؟

''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کے تلمیذ رشید اور پنجاب کے مشہور عالم و مصلح حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے پڑھی تھی، اور دماغ پر اس کی عقلیت، محکم استدلال اور شاہ صاحب کی باریک بینی کا اثر اسی سے قائم ہوا۔ ''حجۃ اللہ البالغۃ'' سے علمی و اصولی مباحث اور متکلمانہ و فلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی، اور اس حیثیت سے اس نے بڑا احسان کیا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی کتابوں سے۔ اگر اپنے فکر و مسلک کے لیے کسی مکتب خیال کا تعین ضروری ہے، تو میں انھیں کا نام لے سکتا ہوں، اور در حقیقت ہمارا تعلیمی و فکری نسب و شجرہ انھیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے نامور پوتے شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کی شہرۂ آفاق اور مسلم ذکاوت اور وفور علم کا اندازہ صرف ''منصبِ امامت'' سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنی طرز کی منفرد تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی مختصر تصنیف ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' (جس کو میں شاہ صاحب کی قلمی بیاض کہتا ہوں۔) کے بعض علمی اشاروں اور مختصر نکتوں نے قرآن مجید کے مطالعہ و تفسیر میں

www.abulhasanalinadwi.org

بڑی رہنمائی کی، اور شاہ صاحب کے بعض مختصر جملوں، اور تھوڑے لفظوں سے پورے پورے مضامین کے راستے، اور مطالعہ قرآن میں ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئیں۔

حضرت سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعہ "صراط مستقیم" (مرتبہ مولانا اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی) کو بہت دیر میں دیکھا، مگر تصوف کے اچھے ذخیرے اور ائمہ تصوف کے ملفوظات، خصوصاً حضراتِ چشت کے پورے سلسلۂ ملفوظات کے مطالعہ کے بعد دیکھا، اور معلوم ہوا کہ تصوف کے لٹریچر میں یہ بالکل ایک انقلابی کتاب ہے۔ سلوک راہِ نبوت، اور تقرب بالفرائض کے موضوع کے علاوہ جس کے سید صاحب امام تھے، اور جو اس عصر کے لیے تزکیۂ نفس اور قرب الی اللہ کی سب سے آسان، بے خطر اور وسیع شاہراہ ہے، طریقت وحقیقت اور سلوک وتربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں، وہ خدا داد ذکاوت، علومِ نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت اور دقت نظر کی دلیل ہیں، اہلِ ظاہر اور اہلِ معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا ہے، اور جو فیصلہ کن باتیں کہی ہیں، وہ ان کی اعلیٰ سلامت طبع، دماغی توازن واعتدال اور میانہ روی کی شاہد ہیں۔ کاش! اس کتاب کی شایانِ شان خدمت ہوتی، اور نئے طرز پر مرتب کر کے پیش کی جاتی۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علومِ نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم، اور تصنیفات سے پیدا ہو جاتی ہے، دور ہوئی۔ اس کی بری بھلی تمیز پیدا ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی علوم وحقائق ادا کیے جا سکتے ہیں، اور کتابوں کے راستہ کے علاوہ کچھ اور بھی راستے ہیں، جن سے وہ علوم آتے ہیں جو کتابوں کے صفحات میں مقید نہیں کیے جا سکتے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ مغز ہو اور چھلکے نہ ہوں، معانی ہوں اور زیادہ الفاظ نہ ہوں، متن ہو اور حواشی نہ ہوں۔

اس عصر کے عارف مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) سے ملا، تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبۃً سہولت ہوئی۔ حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی۔ میں نے ایک موقع پر

www.abulhasanalinadwi.org

عرض کیا کہ اگر میں نے حضرت سید احمد شہید کے حالات نہ لکھے ہوتے، اور حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی، مولانا نے اس کو پسند فرمایا، اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحب کی مجلسِ درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔ درسی و متداول، اور بعض غیر متداول ضخیم تفسیریں، بعض لفظ بہ لفظ دیکھیں، لیکن اصل فائدہ متنِ قرآن کے سادہ اور بار بار کے پڑھنے سے ہوا۔ اس سلسلہ میں اس کا اظہار ضروری ہے کہ قرآن مجید سے اپنا حصہ لینے میں ضروری علمی و لسانی واقفیت کے بعد دو چیزیں سب سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، ایک علوم نبوت و مزاج نبوت سے مناسبت رکھنے والے اشخاص کی صحبت جن کی معاشرت و زندگی کان خلقہ القرآن کا پرتو ہو، اور جنہوں نے انا القرآن الناطق (حضرت علیؓ کا مقولہ) کہنے والے کی قلبی و ذوقی وراثت میں حصہ پایا ہو۔ ان حضرات کے علوم کی تازگی و شگفتگی، بے آمیزی اور نکھار اور علم کی وسعت و گہرائی سے قرآن مجید کے الفاظ کی وسعت و عمق کا ایک قیاسی اندازہ ہوتا ہے۔ کئی الفاظ جو ''لسان العرب'' اور ''مفردات غریب القرآن'' سے اور کئی آیات جو زمخشری کی ادبی تفسیر ''کشاف''، امام رازی کی عقلی تفسیر ''فتوح الغیب'' اور ابن کثیر کی نقلی تفسیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں۔ الفاظ و معانی میں نئی وسعت اور قوت نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں، ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی جو کیفیات بیان کی گئی ہیں، ان کا احساس ہوتا ہے۔ قوموں نے اپنے پیغمبروں کو جو جواب دیے ہیں، کان وہی آوازیں سنتے ہیں، اور آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں۔ جو اشکالات اور شبہات علم کلام کی کتابوں نے، اور کتابی مطالعہ نے فرضی طریقہ پر پیدا کر دیے ہیں، وہ وہاں بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کے سمجھنے کے یہ دو طبعی طریقے ہیں۔

سنا ہے کہ جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے، تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے

www.abulhasanalinadwi.org

لگتا ہے۔ انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادباء اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی۔ سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش و نگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں، جن کا رنگ ہے خوشبو نہیں۔ انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے، اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو علومِ نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو، مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتی ہے۔ تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے جس کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا تک پہنچایا، اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں، اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔

دادیم ترا از منزل مقصود نشان
گر ما نہ رسیدیم شاید تو رسی

—— ۲ ——

[مولانا علی میاں ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری - پٹنہ تشریف لے گئے جہاں اُنہوں نے "خدا بخش سالانہ خطبہ" پیش کیا۔ "علم دائم کے رابطہ کی ضرورت و افادیت" کے موضوع پر خطبے کے آخر میں اُنہوں نے اپنے مطالعے کا ذکر کیا، یہی آخری حصہ پیش خدمت ہے۔ مولانا علی میاں نے اس میں اپنی علمی و مطالعاتی زندگی کی بعض محسن کتابوں کا تذکرہ دہرانے کے ساتھ مزید اضافے کیے ہیں۔ مرتب]

---- میں بجائے اس کے کہ ان کتابوں کا ذکر کروں جن سے معلومات حاصل ہوئی ہیں اور جن کا ممنونِ احسان ہوں اور جن کی وجہ سے محدود صلاحیت ہی سہی، لیکن اس درجہ کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ لکھ پڑھ سکتا ہوں، عربی میں بھی اور اردو میں بھی، ان کے بجائے ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا

www.abulhasanalinadwi.org

ہوں جنہوں نے گہرا اثر ڈالا اور ایک انقلاب انگیزی کا کام کیا، لوگوں نے ایسی کتابیں تو لکھی ہیں جن میں کتابوں کی فہرست آ گئی ہے کہ کیا کیا پڑھا، لیکن ضرورت تھی کہ ان کتابوں کے نام لیے جاتے، اور اچھے پڑھنے لکھنے والے دانشوران کتابوں کا ذکر کرتے جن کتابوں کے مطالعہ سے ان میں انقلاب پیدا ہوا۔

میں ان چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں۔ جنہوں نے میرے محدود رقبہ علم میں، رقبہ عمل میں اور رقبہ حیات میں، میرے دائرۂ فکر میں انقلاب برپا کیا، شاید بعض لوگوں کو کچھ خیال پیدا ہو، ان کے پڑھنے، ان کے دیکھنے کا، ورنہ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے، صفحات کے لحاظ سے، اپنی ضخامت کے لحاظ سے ناقابل شمار ہیں۔

سب سے پہلے ''مسدس حالی'' کا اثر پڑا، ''مسدس حالی'' میں حضورؐ کے بارے میں جو لکھا گیا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

اس کے بعد صحابہ کرامؓ کی تعریف بھی انہوں نے بڑے دلکش و دل نشیں انداز میں کی ہے۔

میرا خاندان ایک علمی خاندان تھا، میرے والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبؒ ہندوستان کے چیدہ ترین اور عظیم ترین مصنفین میں تھے جنہوں نے ایک کتاب آٹھ جلدوں میں ''نزہۃ الخواطر'' کے نام سے لکھی جس میں ساڑھے چار ہزار شخصیتوں کا حال ہے اور یہ بتا دوں کہ جتنی کتابیں لکھی گئیں، وہ ایک ایک صدی پر لکھی گئیں، ان کے نام بھی میں لیا کرتا ہوں۔

www.abulhasanalinadwi.org

بڑے بڑے فضلائے عرب اور بڑے بڑے مؤرخین اور سوانح نگاروں نے ایک ایک صدی کا انتخاب کیا، لیکن ایک ایسی کتاب جو پہلی صدی سے لے کر آخری صدی تک کے لوگوں کا حال بیان کرے، وہ خود بلادِ عربیہ میں نہیں لکھی گئی، چنانچہ خود ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے جو صدرِ جمہوریہ تھے، فرمایا کہ جب میں مصر کے دورہ پر گیا تو صرف آپ کے والد صاحب کی کتاب ''نزہۃ الخواطر'' لے گیا اور میں نے desk [ڈیسک] پر رکھ دی، جب کوئی مصری اسکالر آتا یا کوئی اخبار کا بڑا نمائندہ یا کسی جامعہ کا پروفیسر، وہ کہتا کہ کیا ہندوستان میں علم ہے؟ ہندوستان میں لوگ عربی جانتے ہیں؟ ہندوستان میں کوئی بڑا کام ہوا، کوئی بڑی خدمت ہوئی؟ میں کہتا یہ کتاب دیکھ لیجیے۔ مصر بھی ایسی کتاب نہیں پیش کرسکتا، اور میں بتاتا ہوں عالم عربی کے ایک سیاح کی حیثیت سے بھی اور وہاں کی جامعات میں جانے والے اور وہاں خطاب کرنے والے کی حیثیت سے بھی، کہ ایک کتاب بھی عالم عربی میں ایسی نہیں ملتی جو پہلی صدی سے چودہویں صدی پر محیط ہو، یا تو ایک صدی پر کتابیں ہیں یا پھر ایک ایک فن پر ہیں، مثلاً کوئی کتاب صرف ونحو پر ہے، کوئی شاعری پر ہے، کوئی طب پر ہے، لیکن انہوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی، پہلی صدی جب سے یہاں عرب آئے اور اسلام آیا، اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کے ناموروں کا اس میں ذکر ہے۔

دوسری کتاب لکھی ہے جو ان کا بڑا کارنامہ ہے اور ہندوستان کے لیے ایک شاہکار چیز ہے، وہ ہے ہندوستان کے علماء کی تصنیفات کی ڈائرکٹری۔ پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک کسی فن میں بھی کسی عالم نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس میں اس کا ذکر ہے۔ پوری ڈائرکٹری ہندوستان کے تیرہ سو برس چودہ سو برس کی جس میں سیکڑوں کتابوں کے نام ہیں، اس فن میں یہ کتاب ہے، اس کی یہ خصوصیت ہے۔ عالم عربی کی سب سے بڑی اکیڈمی، دمشق کی ''المجمع العلمی العربی'' جس کا نام تھا، اب ''مجمع اللغۃ العربیۃ'' ہوگیا ہے، اس نے اس کو شائع کیا، دو ایڈیشن وہاں سے شائع ہوئے ہیں، ہندوستان میں اس کا ترجمہ ہوا، اور ''اسلامی علوم وفنون: ہندوستان میں'' کے نام سے دار المصنفین

www.abulhasanalinadwi.org

کی طرف سے شائع ہوا جو سب سے مقتدر ادارہ ہے۔ عام طور پر ہوا یہی ہے کہ لوگوں نے پورا احاطہ نہیں کیا، اب اس کی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں ان کتابوں کا تذکرہ ہو جو منفرد (unique) ہیں، ان کی مثال عالم اسلام اور عالم عربی میں نہیں ملتی اور ایسی بہت سی چیزیں ہیں، پھر اس کے بعد ضرورت ہے کہ جن چیزوں سے متاثر ہوئے اور انقلاب ہوا، ان کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔

تو سب سے پہلے جو مجھے یاد ہے میری زندگی پر اثر ''مسدس حالی'' کا پڑا، انہوں نے صحابہ کرامؓ کا جہاں تذکرہ کیا ہے، پھر اسلام کی خدمت اور اس کی انقلاب انگیزی کا جہاں ذکر کیا ہے، اس کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے اکثر گھروں میں ''مسدس حالی'' پڑھی جاتی تھی، اس کے بہت سے شعر خواتین، بچیوں اور لڑکیوں کی زبان پر بھی تھے۔

اس کے بعد پھر جس کتاب کا اثر پڑا، وہ ہمارے خاندان کے ایک بزرگ سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی کتاب ''صمصام الاسلام'' ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ کم سے کم پٹنہ اور اس کے اطراف میں ضرور معروف ہیں اور محترم شخصیت ہیں، صادق پوران کا پیرو تھا اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں انگریزوں کے مقابلہ میں وہ کردار ادا کیا جو (میں ایک تاریخ داں کی حیثیت سے بھی اور ایک محب وطن کی حیثیت سے بھی کہتا ہوں) ہندوستان میں شاید کسی علاقہ نے اتنا بڑا حق ادا نہیں کیا۔ سید عبدالرزاق صاحب کلامی سید احمد شہید کے نواسہ ہوتے تھے اور میرے والد صاحب کے حقیقی پھوپھا تھے، انھوں نے ''صمصام الاسلام'' کے نام سے پچیس ہزار اشعار میں واقدی کی فتوح الشام کو منتقل کیا، وہ شاعرانہ حیثیت سے بھی بڑے بلند کلام ہیں۔ اس کتاب میں پچیس ہزار اشعار ہیں۔ خاندان میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی حادثہ پیش آتا، کوئی غمی ہو جاتی تھی تو اس کے اثر کو کم کرنے کے لیے مستورات جمع ہوتی تھیں اور ''صمصام الاسلام'' پڑھی جاتی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے میں اس میں شریک ہوتا تھا، اپنی کم سنی کے باوجود، کیونکہ میری خالہ صاحبہ یا میری ہمشیرہ وغیرہ پڑھتی تھیں تو حالت یہ ہوتی تھی، کہ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں اور چہروں کا

www.abulhasanalinadwi.org

رنگ بدل جاتا تھا، اور بالکل معلوم ہوتا تھا کہ اپنا غم بھول گیا ہے اور کسی کی شہادت کا ذکر آتا (خاص طور سے خواتین کی شہادت اور قربانیوں کا ذکر آتا) تو اپنا غم بھول جاتی تھیں، یہ بہت اچھا رواج تھا، اس وقت اس حادثہ کا اثر کم ہو جاتا تھا اور کسی کا کوئی وعظ یا تلقین یا کوئی اور کتاب اتنی مؤثر نہیں ہوتی تھی جتنی کہ ''صمصام الاسلام'' ہوتی تھی۔

پھر ''صمصام الاسلام'' کے بعد مجھے جس چیز نے متاثر کیا، وہ اکبر الہ آبادی مرحوم کا کلام ہے۔ ملک میں مغربی تہذیب کا دور آیا اور میں چونکہ لکھنؤ شہر کا رہنے والا ہوں جو تحریک خلافت اور تحریک آزادی کا بڑا مرکز رہا ہے، لیکن اس وقت انگریزی تہذیب کا اور انگریزی دانش کا، مغربی ثقافت (culture) کا اتنا اثر تھا کہ کوئی شخص اس سے بچا نہیں تھا، اس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اس وقت ایک لفظ چلا ہوا تھا ''ولایت''، اس سے آپ سمجھ جایئے کہ یہ کس ذہن کی غمازی کرتا ہے، جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا چاہتے تھے تو کہتے تھے یہ ولایت سے آئی ہے، میں ولایت سے آیا ہوں، اس وقت دو چیزیں میرے بڑے کام آئیں، ایک اکبر الہ آبادی کا کلام، اس نے اس طلسم کو توڑا اور اس کی اصل کمزوریوں کو دکھایا اور وہ کام کیا جو بڑے بڑے دانش کدوں نے بڑی بڑی علمی، دقیق اور عمیق اور بلند مرتبہ کتابوں نے کیا ہوگا، ان کا کلام جب پھیلا تو اس سے مغربی تہذیب کا تسلط، اس کی sovereignty کم ہوئی، ان کے چند شعر پڑھتا ہوں، جن سے آپ سمجھ جائیں گے کہ کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں۔

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

علوم مغربی کے بحر میں غوطہ لگانے سے
زباں گو صاف ہوجاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

---

www.abulhasanalinadwi.org

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

اکبرالہ آبادی کا بہت اثر ہوا، ایک اعتراف بالحق کے طور پر یہ بھی کہہ دوں کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا رسالہ ''سچ'' (جو بعد میں ''صدق'' کے نام سے نکلنے لگا) اکبرالہ آبادی کا بھی بڑا ترجمان تھا، میں جب تک رائے [بریلی] میں رہتا تھا، وہاں بھی ''سچ'' کا پرچہ آتا تھا، پھر وہ ''صدق'' کے نام سے نکلنے لگا اور میرا مولانا سے ذاتی تعلق اور رابطہ قائم ہوا، اس وقت لاہور سے ''زمیندار'' آتا تھا جس میں مولانا ظفر علی خاں کی نظمیں شائع ہوتی تھیں، وہ نظمیں ایسی زلزلہ انگیز ہوتی تھیں اور جذبات پر ایسی اثر انداز (زبان کے لحاظ سے بھی اور زورِ بیان کے لحاظ سے بھی) کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

اس کے بعد اقبال کے کلام نے دل ودماغ کو متاثر کیا، یہ عرض کردوں کہ اقبال کے کلام میں ''بانگ درا'' نے اتنا مجھ پر اثر نہیں ڈالا، اس وقت تو یہ چیز رائج تھی، اور آپ کو معلوم ہے اقبال کا کلام وقت کے فاصلہ سے شائع ہوتا رہتا تھا، مثلاً ابھی ''بانگ درا'' آئی ہے، پھر ''ضرب کلیم'' آئی ہے، ''بال جبریل'' آئی ہے اور دوسری کتابیں، لیکن مجھ پر سب سے زیادہ اثر ''بال جبریل'' کا پڑا ہے، ان کے اشعار پڑھتا تھا اور لطف لیتا تھا، پھر خدا نے ایسی توفیق دی کہ میں نے ان کا عالم عربی سے تعارف کرایا، میں جب مصر گیا ۱۹۵۱ء میں تو میں نے دیکھا کہ مصر میں بہت زیادہ غیر ممتاز شخصیتوں پر لکھا گیا ہے اور لوگ ان سے واقف ہیں، میں وہاں کے چوٹی کے لکھنے والوں سے ملا، جن میں ڈاکٹر احمد امین، عباس محمود العقاد، احمد حسن الزیات اور سید قطب وغیرہ تھے، لیکن میں نے دیکھا کہ سارا مصر اقبال سے ناآشنا ہے اور عالم عربی بھی ناآشنا ہے، تو میں نے وہاں سے آنے کے بعد اس کا بیڑا اٹھایا، ہمت کی کہ میں اقبال کو عربی میں پیش کروں، چنانچہ پہلے میں نے مضامین کی

www.abulhasanalinadwi.org

شکل میں یہ کام کیا، پھر پوری کتاب ''روائع اقبال'' کے نام سے لکھی اور مصر ہی نہیں، عالم عربی میں پہلی مرتبہ ان کا تعارف ہوا اور مجھے حیرت ہوئی کہ بعض عرب ادیبوں، دانشوروں کو اس کے صفحے کے صفحے یاد ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ امیر حسن نے جو اردن کے ولی عہد ہیں، وہاں ''موسسہ اہل البیت'' کے نام سے ایک اکیڈمی ہے، میں اس کا ممبر ہوں، انہوں نے ایک ڈنر کا انتظام کیا، اپنی طرف سے اعزاز کا، اس وقت میں تھا اور میرے بھانجے مولوی سید محمد واضح حسنی ندوی اور مفتی خلیلی صاحب تھے جو مسقط کے بہت بڑے عالم، بڑے مفتی ہیں تو مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے ''روائع اقبال'' کے صفحے کے صفحے زبانی سنانا شروع کر دیے اور پھر اس کے بعد وہاں بہت سے لوگوں کو اس سے بڑی دلچسپی ہوئی اور اس کتاب کا بڑا اثر پڑا، اور اقبال سے لوگوں کا تعارف ہوا اور انہیں حیرت ہوئی کہ ایسے شاعر سے ہم ناواقف تھے جو اسلام کا صحیح ترجمان ہے اور اس نے طاقت کا پیغام، خود اعتمادی کا پیغام، اور انقلاب انگیزی کا پیغام جو اب تک کسی شاعر نے نہیں دیا تھا، دنیائے اسلام کو دیا۔

پھر اس کے بعد سب سے زیادہ جس کا اثر مجھ پر پڑا، وہ سید احمد شہید کی تحریک کا تھا، وہ ہمارے گھر کی چیز تھی، خاندان کی چیز تھی، لیکن اس کا تذکرہ بہت کم ہو گیا تھا، کہیں کہیں مجلسوں میں اس کا تذکرہ ہوتا تھا، لیکن اسی زمانہ میں مولوی محی الدین صاحب قصوری نے جو مولانا آزاد کے خاص لوگوں میں تھے، امرتسر کے ایک پرچہ ''توحید'' میں جو مولانا داؤد صاحب غزنوی کی ادارت میں نکلتا تھا، ''عصر حاضر کا عظیم مجاہد سید احمد شہید'' کے نام سے مقالہ لکھا، میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب نے کہا کہ تم اس کا ترجمہ عربی میں کرو، اس وقت میری عمر ۱۶-۱۷ سال تھی، میں نے اس کا ترجمہ عربی میں کیا، اسی زمانہ میں عالم عربی کے بہت بڑے محقق ادیب اور نقاد استاد علامہ تقی الدین الہلالی مراکشی، جن کا حال یہ تھا کہ جب دو بڑے ادیبوں میں جو بڑے کہنہ مشق نامور لکھنے والوں میں تھے، کسی لفظ کے بارے میں اختلاف ہوتا تھا کہ لفظ صحیح ہے یا نہیں تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، چنانچہ امیر البیان امیر شکیب ارسلان جو ''حاضر العالم الاسلامی'' کی چار

www.abulhasanalinadwi.org

جلدوں کے مصنف ہیں اور علامہ سید رشید رضا میں جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد ہیں اور وہ جمال الدین افغانی کے شاگرد و ترجمان تھے، جب ان کا آپس میں اختلاف ہوتا تھا تو ان کی طرف رجوع کرتے تھے، اور وہ جو فیصلہ کرتے تھے مان لیا جاتا تھا، اس کے شواہد موجود ہیں۔ امیر شکیب ارسلان کی خودنوشت کتاب ''السید رشید رضا اواخاء اربعین سنۃ'' میں لکھا ہے، کہیں لفظ میں ہمارا اختلاف ہوا، ہم نے شیخ تقی الدین کی طرف رجوع کیا، انہوں نے یہ فیصلہ کیا، وہ لکھنؤ آئے تھے اور ندوۃ العلماء میں ان کو تعلیم کا عہدہ دیا جانے والا تھا۔ انہوں نے جو یہ مضمون دیکھا تو کہا کہ اگر تم کہو تو اسے علامہ سید رشید رضا کے پاس مصر بھیج دوں، اب خیال کیجیے، ۱۶-۱۷ سال کا نوجوان، اس کا مضمون علامہ سید رشید رضا جو شیخ محمد عبدہ کے شاگرد رشد ہیں، وہ ''المنار'' نکالتے تھے، انہوں نے اس مضمون کو رسالہ میں شائع کیا اور اس کے بعد انہوں نے لکھا کہ اگر مضمون نگار چاہیں تو ہم اس کو الگ رسالہ کی شکل میں بھی شائع کر سکتے ہیں، تو خدا کا شکر ادا کرنے کے سلسلہ میں کہتا ہوں کہ شاید ہندوستان میں یا بلادِ عجمیہ میں کم ایسا ہوا ہو کہ ۱۶-۱۷ سال کے نوجوان کی کتاب مصر میں شائع ہوئی ہو اور مستند سمجھی گئی ہو، چنانچہ ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے نام سے وہ رسالہ وہاں شائع ہوا اور پھر ہندوستان میں بھی پھیلا۔

مجھ پر سب سے زیادہ جس کا اثر پڑا ہے وہ حضرت سید احمد شہید کے واقعات تھے، میں بلا کسی مبالغہ کے اور بغیر کسی خودستائی کے کہتا ہوں کہ کچھ خاندانی تعلق بھی ہے کہ میں جب ان کے حالات پڑھتا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک گوشہ میں (جس زمانہ میں وہاں بجلی بھی نہیں آئی تھی چراغ جلا کر، لالٹین جلا کر میں کتاب پڑھتا تھا) ''وقائع احمدی''، جو ان کے حالات میں لکھی گئی ہے یا دوسری کتاب ''منظورۃ السعداء'' جو فارسی میں ہے مولانا سید جعفر علی صاحب بستوی کی، وہ جب پڑھتا تھا تو ایک دم سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کی کوئی گھٹا آ گئی ہے اور دعا کرنے کا وقت ہے اور آنسو جاری ہو جاتے اور دعا کرتا، ویسا اثر میں نے سیرت نبوی کے بعد کسی چیز میں نہیں دیکھا، مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہے سید احمد شہید کا اور پھر اس کے بعد اس کے نتیجہ میں میں نے

www.abulhasanalinadwi.org

''سیرت سید احمد شہید'' لکھی، پہلے ایک جلد تھی، اس پر علامہ سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھا، بڑا طاقتور مقدمہ ہے، پھر دو جلدوں میں میں نے کتاب لکھی اور اس وقت تک بحمد اللہ ۶، ۷ ایڈیشن نکل چکے ہوں گے اور پاکستان، ہندوستان میں بہت پھیلی، پھر اس کے بعد چودھری غلام رسول صاحب مہر (جو ایک بہت بڑے صحافی اور جرنلسٹ تھے) کہتے تھے کہ میں تیرہ چودہ سال سے یہی کام کر رہا ہوں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا کہ میں نے دو رکعت نماز پڑھ کر دعا نہ کی ہو، انہوں نے کتاب لکھی ''سیرت سید احمد شہید'' چار جلدوں میں، ان کی کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس کتاب نے ہزاروں انسانوں پر اثر ڈالا، ان کے عقائد میں بھی اصلاح ہوئی، ان کے جذبات میں بھی ایمانی طاقت پیدا ہوئی جو بہت کم چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

ابھی تک بہت کم لوگوں نے اس پر کوئی کتاب لکھی ہے کہ کس کتاب نے ان کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا، اگر کسی کتاب کا ذکر آتا ہے تو وہ ''مثنوی مولانا رومؒ'' ہے۔ خود اقبال مرحوم اس سے بڑے متاثر ہیں، وہ کہتے ہیں۔

پیر رومی مرشدِ روشن ضمیر
کاروانِ عشق و مستی را امیر

اور اردو میں کہتے ہیں۔

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

مولانا روم کے کلام کا بہت سے آدمیوں کے ذہنوں پر بڑا اثر پڑا ہے، مگر ان لوگوں نے تحریری شکل میں کوئی شہادت نہیں دی، لیکن اگر پوچھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پورے اس برصغیر میں اور پھر ایران میں سیکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس سے متاثر ہوئے ہیں، یہ تو عربی، فارسی، اردو کا ذکر کیا گیا۔

میں نے جب مغربی تہذیب کی تنقید کے مطالعہ کا ارادہ کیا، میرے بڑے بھائی صاحب نے

www.abulhasanalinadwi.org

جو بڑے مبصر تھے، مجھے انگریزی بھی پڑھوائی تھی۔ جہاں تک تاریخ، اخلاقیات اور دین کا تعلق ہے، اس میں میں نے مسلمانوں کے انحطاط، مسلمانوں کے مسند قیادت سے دست کش ہو جانے یا پیچھے ہو جانے سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، اس کا میں نے بالکل ایک تاریخی، غیر جانبدارانہ، ایک مبصرانہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا جو عربی زبان میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے نام سے چھپا جس کا اردو ترجمہ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'' کے نام سے شائع ہوا۔ عالمِ عربی میں میری جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی اور مقبول ہوئی، وہ یہی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' تھی، اس کے تقریباً پچیس ایڈیشن نکل چکے ہیں، قاہرہ اور دمشق اور کویت میں اور مختلف جگہوں پر اور اردو میں جس کے ترجمے بار بار شائع ہوئے ہیں۔ بعض ادیبوں نے اس کا ذکر کیا کہ جب مجھے کوئی زوردار چیز لکھنی پڑتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تحریر میں جوش ہو تو پہلے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے چند صفحے پڑھ لیتا ہوں، پھر قلم اٹھاتا ہوں، یہ استاذ انور الجندی کا مقولہ ہے جو اس وقت مصر کے اچھے نامور کاتب ہیں، تو اس وقت مجھے اس بات کی ضرورت ہوئی کہ غیر جانبدارانہ طریقہ پر اور غیر جذباتی طریقہ پر میں مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو سمجھوں اور کیا اس کا donation ہے، اس نے کیا دنیا کو عطا کیا اور کیا نقصان پہنچایا، اخلاقیات کے پہلو سے، دینیات کے پہلو سے، انسانیت کے پہلو سے، تو میں نے اس وقت انگریزی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس میں مجھے سب سے زیادہ جن کتابوں سے فائدہ ہوا، ان میں Conflict between Religion and Science ہے، یہ ڈراپر کی کتاب ہے، اسے میں نے غور سے پڑھا اور اس کے نوٹس لیے۔ اس میں [مصنف نے] بتایا ہے کہ کلیسا اور دربار کی جو جنگ ہوئی، جو کشمکش اور تقابل ہوا، اس سے کیا فائدہ پہنچا، کیا نقصان پہنچا اور اس نے کیا اثرات ڈالے، مغربی معاشرہ، مغربی ذہن پر۔ پھر کتاب پڑھی History of European Morals، اس سے مجھے معلوم ہوا کہ یونان کا کیا اثر پڑا ہے یورپ پر، یونان نے کیا دیا اور اس میں کیا افراط و تفریط تھی، ان کے دو بہت بڑے schools of thought تھے، ایک جسے رواقی کہتے ہیں اور ایک

www.abulhasanalinadwi.org

لذتی، بس جس میں آدمی کو مزا آئے وہی چیز لینی چاہیے، اسی کو اختیار کرنا چاہیے، یہ لذتی مکتب خیال ہے، مگر رواقی مکتب خیال ہے کہ نہیں، عقل سے کام لینا چاہیے۔ اس کتاب میں اس نے ثابت کیا ہے کہ لذتی اسکول نے یورپ پر زیادہ اثر ڈالا ہے، اس وقت یورپ فلسفۂ لذتیت کا کار بند نہیں، بلکہ پابند ہے۔

امام ابن تیمیہ کی کتاب میں نے پہلے پڑھی تھی، اس لیے بہت چیزوں کی مجھے تصدیق ہوئی، انہوں نے ایک بڑے کام کی بات کہی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ ایک چیز ہے ''نفی''، اور ایک ہے ''اثبات''۔ امام ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ یونان کی ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کے یہاں نفی زیادہ ہے، اثبات کم ہے، حالانکہ سارا عمل، جوشِ عمل، طاقت اور انرجی سارے ذہنی و اعصابی محرکات، اعصابیت پیدا ہوتی ہے اثبات سے، نفی سے پیدا نہیں ہوتی، قرآن کیا کہتا ہے ''لیس کمثلہ شئی'' ''وھو السمیع البصیر'' اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع وبصیر ہے، لیکن جب اس کی صفت بیان کرتا ہے تو کہتا ہے ھو الخالق الباری المصور لہ الاسماء الحسنی یسبح لہ مافی السموات والارض وھو العزیز الحکیم، اور پھر اس سے پہلے کی جو آیتیں ہیں ۵-۱۰ صفتیں بیان کی ہیں کہ اللہ یہ ہے، اللہ یہ ہے اور ان صفتوں کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے اور کائنات سے بھی ہے، اس سے آدمی میں ایک جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے، جذبۂ دعا پیدا ہوتا ہے، جذبۂ عبادت بھی پیدا ہوتا ہے، ایک اطمینان اور سکونِ قلب پیدا ہوتا ہے کہ میں جس خدا کا پرستار ہوں، وہ بڑا رحمان ورحیم ہے، وہ بڑا حکیم وبصیر ہے، وہ خالق ہے کائنات کا اور قادر ہے ہر چیز پر۔

پھر جس سے فائدہ پہنچا، وہ گبن کی مشہور کتاب ہے Decline and Fall of the Roman Empire- اس سے معلوم ہوا کہ رومۃ الکبریٰ کی سلطنت سے کیا غلطیاں ہوئیں، کیا اس میں ناہمواریاں پیش آئیں اور اس میں ضعف کے سرچشمے کیا تھے، کیوں اتنی بڑی رومۃ الکبریٰ جو دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہی تھی، اس کو زوال ہوا، اور پھر ایک کتاب Making of

www.abulhasanalinadwi.org

Humanity پڑھی، اس میں انسانیت کی تعمیر اور تخریب کی تاریخ پر بحث کی گئی۔

آخر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ لوگ ان کتابوں کی طرف توجہ کریں اور ان پر خامہ فرسائی کریں جنھوں نے ان کے اندر انقلاب [پیدا] کیا اور کس طرح سے انقلاب [پیدا] کیا؟ اور پھر ایسی منتخب اور مفید کتابوں کے پڑھنے کا مشورہ دیں۔---

—— ۳ ——

[ماہنامہ ''سیارہ'' (لاہور) نے مختلف اربابِ علم وادب سے اُن کے ذوقِ مطالعہ، تصنیف وتالیف اور ذہنی نشو وارتقاء کے حوالے سے ایک مفصل سوال نامے کے جواب حاصل کیے تھے۔ ذیل میں سوالنامہ، اور مولانا علی میاں کا جواب ماہنامہ مذکور کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۶۵ء سے نقل کیا جاتا ہے۔ مرتب]

سوالنامہ

۱- آپ کے اندر ذوقِ مطالعہ کب نمایاں طور پر متحرک ہوا؟ آغاز کیسے ہوا؟ اس کا نشو ونما کس طرح ہوا؟ کیسا ذہنی ماحول اس میں آپ کے لیے ممد ہوا؟ نظامِ تربیت کا اثر کہاں تک ہوا؟ کون سی شخصیتیں تھیں جنھوں نے آپ کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کیا اور اِس سفر میں رہنمائی دی؟ آپ کے مطالعہ کے مختلف دور؟ ذوق میں ارتقائی تبدیلیاں؟

۲- آپ کے پسندیدہ موضوعاتِ مطالعہ کیا رہے؟

۳- آپ اُردو کے علاوہ اور کن زبانوں میں مطالعہ کرتے ہیں (انگریزی؟ عربی؟ فارسی؟ بنگلہ؟ ہندی؟ پنجابی؟ سندھی؟ پشتو؟، بلوچی، دیگر زبانیں؟)۔

۴- اردو اور انگریزی کو تقابلاً سامنے رکھ کر فرمایے کہ دونوں میں کس زبان میں آپ کا مطالعہ زیادہ وسیع ہے؟

www.abulhasanalinadwi.org

۵- آپ کے پسندیدہ مصنفین؟ آپ کی پسندیدہ کتابیں؟ آپ کے پسندیدہ رسائل؟ پسندیدہ شعراء؟ پسندیدہ افسانہ نگار؟ پسندیدہ مزاح نویس اور طنز نگار؟

۶- آپ اپنی دُنیائے مطالعہ میں کس ایک مصنف کو بلند ترین مقام پر رکھتے ہیں جس کا آپ کی ذہنی نشو ونما پر سب سے زیادہ اثر پڑا ہو؟ (خصوصاً اردو لکھنے والوں میں سے)

۷- آپ کی نگاہ میں وہ بہترین کتاب یا تحریر جس نے آپ پر بہت زیادہ اثر ڈالا ہو؟ (خصوصاً اردو زبان میں)

۸- ایسے دو چار مقالات، نظموں یا افسانوں کا ذکر جن سے آپ کی فکری یا عملی زندگی متاثر ہوئی ہو؟

۹- اُردو رسائل کے اب تک جتنے خاص نمبر آپ کی نظر سے گزرے ہیں۔ آپ کو ان میں سے بہت زیادہ پسند کون سے رہے؟ خصوصاً اگر کسی ایک کو بہترین قرار دے سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

۱۰- یہ بھی فرمایئے کہ مطالعہ میں آپ کی پسند کے بالمقابل آپ کی ''ناپسند'' کیا ہے؟ کن چیزوں کے مطالعہ سے آپ کی طبیعت اِبا کرتی ہے؟ آپ کوئی ایسی نگارش بتائیں جس سے آپ کو نفرت محسوس ہوئی ہو؟

۱۱- بالعموم آپ کے مطالعہ کے اوقات کیا ہوتے ہیں؟ پروگرام کس طرح چلتا ہے؟ مطالعہ کی نشست کس طرح کی آپ کو پسند ہے؟ رفتارِ مطالعہ کیا ہوتی ہے؟

۱۲- تنہائی اور خموشی آپ کے مطالعہ کے لیے ضروری ہے، یا آپ ہجوم اور شور وشغب میں بھی پڑھ لیتے ہیں؟

۱۳- سفر میں آپ کا مطالعہ کا تجربہ کیا ہے؟

۱۴- کیا مطالعہ کے دوران آپ کتاب پر نشانات لگاتے ہیں؟ کیا آپ الگ نوٹ یا خلاصہ لکھتے ہیں؟

www.abulhasanalinadwi.org

۱۵- آپ کا حافظہ آپ کی وسعتِ مطالعہ کا ساتھ کہاں تک دیتا ہے؟ کیا آپ کو پڑھی ہوئی کتابوں اور مضامین کے مطالب اور اُن کے مصنفین کے نام پوری طرح یاد رہتے ہیں؟

۱۶- آپ اپنے مطالعہ، حاصلِ مطالعہ اور ذوقِ مطالعہ میں کیا اپنے گھر کے لوگوں، خصوصاً بچوں کو (اگر وہ ہوں) بھی حصہ دار بناتے ہیں؟ بچوں کی تربیتِ ذوق کے لیے آپ کے تجربات کیا ہیں؟

۱۷- کیا آپ کی ذاتی لائبریری ہے؟ اس کا حدود اربعہ کیا ہے؟ اِس میں اہم ترین کتابیں کون سی ہیں؟ خاص خاص کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے اگر آپ کو کوئی خاص معرکہ سر کرنا پڑا ہو تو درج فرمایئے۔ نمایاں شخصیتوں کی طرف سے ہدیہ میں آئی ہوئی کتابیں؟

۱۸- کتابیں مستعار دینے اور لینے کے متعلق آپ کے تجربات کیا ہیں، اور اس معاملے میں نظریہ و مسلک کیا ہے؟ کیا کچھ واقعات ایسے ہیں کہ بعض اہم کتابوں سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

۱۹- آپ ایک اوسط درجہ کے عام تعلیم یافتہ آدمی کو مشورہ دیں کہ وہ موجودہ مصروف زندگی میں مطالعہ کا پروگرام کیسے بنائے اور کتابیں کیسے فراہم کرے؟

۲۰- خاص طور پر ادبی مطالعہ کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ عام آدمی کے لیے؟ طلبہ کے لیے؟

۲۱- ادبی مطالعہ کے لیے نوجوانوں کو آپ کیا رہنمائی دیتے ہیں کہ وہ کن مصنفین اور کتابوں کو لازماً پڑھیں؟ نیز آپ اردو کے ایسے موجودہ رسائل کی نشاندہی کریں جن کا مطالعہ صحت مند فکر کی نشو و نما میں مدد ہو۔

۲۲- کیا آپ کسی بہتر اور موثر اسلوب سے لوگوں کو یہ بتا سکتے ہیں کہ صرف تفریحی مطالعہ کافی نہیں، اس کے ساتھ علمی، ادبی اور معلوماتی چیزوں کا مطالعہ ضروری ہے اور پروگرام میں توازن ہونا چاہیے؟

۲۳- ڈائجسٹوں کا جو دور ہمارے یہاں شروع ہوا ہے، اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ ایک

www.abulhasanalinadwi.org

رائے یہ ہے کہ اس طرز کے رسائل انگریزی رسائل کی جگہ لے کر اردو کے حق میں مفید پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ ادبی مطالعہ کے راستے میں حائل ہو رہے ہیں۔

۲۴- آپ کے سامنے ایک مسلمان معاشرہ ہے اور یہ واضح ہے کہ نوجوانوں کی بڑی بنیادی ضرورت ہے کہ وہ اسلام کے انقلاب آفریں نظریۂ حیات، اس کے ضابطہ و نظام، اس کے تہذیب و تمدن اور اس کی شاندار تاریخ کو جانیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ کن مصنفین اور کن کتابوں کی طرف رہنمائی دیتے ہیں؟

۲۵- کچھ لوگوں کی رائے میں قرآن ناظرہ پڑھنے کی بجائے سمجھ کر پڑھنا چاہیے، طوطے کی طرح رٹنے کا کیا فائدہ؟ آپ کی رائے اِس بارے میں کیا ہے؟

جواب

اس وقت اس حال میں یہاں [نہیں] ہوں کہ دماغ پر زیادہ زور ڈال سکوں یا کوئی مضمون پوری توجہ سے لکھوا سکوں، زیادہ وقت بستر پر پڑے ہوئے گزرتا ہے۔ اس وقت اتفاقاً آپ کے سوال نامے کا کاغذ نکل آیا اور ایک عزیز نے پڑھ کر سنایا۔ سوالات بڑی ذہانت سے مرتب کیے گئے ہیں اور طبیعت کو اکساتے ہیں۔ دل میں ان کے جواب دینے کی تحریک پیدا ہوئی، طبیعت کے مشورہ کو جو پاسبانِ عقل ہے، ذرا ہٹا کر دل کو تنہا چھوڑ دینے پر عمل کرنے کو جی چاہا۔ آپ نے انتخاب کی آزادی دے دی ہے، اس لیے ہلکے پھلکے سوالات کا جواب دے دیتا ہوں وہ بھی مختصر۔

نمبر ۱- قدیم شرفاء اور علماء کے دستور کے مطابق اور بعض خاص اسباب کی بناء پر اس سے کچھ زیادہ ہمارے گھر میں ایک وسیع موروثی کتب خانہ تھا۔ دادا صاحب اور والد صاحب رحمۃ اللہ علیہم (حکیم سید فخر الدین مصنف ''مہر جہاں تاب'' اور سید عبدالحئی مصنف

www.abulhasanalinadwi.org

''گلِ رعنا'' و ''نزہۃ الخواطر'') دونوں بڑے مصنف تھے۔ یہ کتب خانہ کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا جن میں عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کی کتابیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب (ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب مرحوم) بڑے اچھے مربی و ماہر نفسیات تھے۔ انہوں نے کتابوں سے مانوس کرنے کے لیے اور اس موروثی دولت کی قدر کرنے کے لیے کتابوں کو دھوپ دکھانے اور ان کی حفاظت و پرداخت کے کام میں پہلے شریک کیا، پھر اس کی ذمے داری ڈالی۔ پرانی کہاوت ''کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے'' کے مطابق پہلے کتاب و مصنف کا نام پڑھنے، پھر اس کو کہیں کہیں سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اور اس سے کتاب بینی کا جو بہت حد تک موروثی اور فطری تھی، چسکا پڑ گیا اور یہ شوق لت اور بیماری کی حد تک پہنچ گیا۔

نمبر۲- میرے لیے سب سے زیادہ ذوقی اور تفریحی موضوع جس میں کبھی طبیعت پر بار نہیں پڑتا اور جس سے سیری نہیں ہوتی، تذکرے، تراجم اور سوانح حیات کا موضوع ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دادا صاحب اور والد صاحب بڑے مؤرخ اور سوانح نگار تھے اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس مشغلے میں صرف ہوا۔ اس کے بعد دوسرے درجہ میں ادبیات، خاص طور پر وہ ادبی کتابیں جن میں تکلف، آورد اور صنائع و بدائع نہ ہوں، لیکن نظم سے زیادہ نثر کی کتابیں پڑھنے کا ذوق ہے، اور وہ عربی اردو دونوں میں یکساں ہے۔

نمبر۳- سب سے زیادہ عربی میں، دوسرے نمبر پر اردو اور بضرورت انگریزی میں مطالعہ کا اتفاق ہوتا ہے۔ جب سے نظر کمزور ہوئی، انگریزی مطالعہ برائے نام رہ گیا۔

نمبر۴-۵- پسندیدہ مصنفین، پسندیدہ تصانیف اور مضامین کے متعلق میرے مضمون ''میری محسن کتابیں''۸ میں خاصا مواد آ گیا ہے۔ مزاحیہ لکھنے والوں میں مجھے پرانے لکھنے والے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سب سے زیادہ پسند ہیں۔ پطرس کے بعض، اور پروفیسر

www.abulhasanalinadwi.org

رشید احمد صدیقی کے وہ مضامین جن میں زیادہ علمیت اور تفلسف نہیں ہے، پسند آتے ہیں، نیز ان کے مضامین کے مجموعوں میں سے "گنج ہائے گراں مایہ" بہت کامیاب اور دل آویز ہے۔

طنز نگاری میں مولانا عبدالماجد دریابادی خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر جہاں زیادہ تلخی اور تیزی نہیں ہوتی۔ یہ احتیاط مولانا آزاد کے یہاں زیادہ ہے اوران کے ادب کے وہ حصے اگر چہ کم ہیں، لیکن [ہیں] بہت لطیف اور سبک۔

نمبر ۶- یہ کہہ سکتا ہوں کہ چوں کہ ابتداء میں ندوۃ العلماء کی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی تصنیفات اور تحریریں زیادہ پڑھیں، اس لیے ان کا اثر زیادہ ہے۔ اردو انشاء اور نثر نگاری میں شاید سب سے زیادہ اور اولین اثر خود اپنے والد صاحب کا پڑا، خصوصاً ان کی کتاب "یادایام" اور "گلِ رعنا" کا۔ دوسرے نمبر پر مولانا شبلی کا۔

نمبر ۷-۸ کے جوابات بھی میرے مذکورہ بالا مضمون سے مل سکتے ہیں۔

نمبر ۹- اردو رسائل کے خاص نمبر نہ تو بہت زیادہ دیکھے اور نہ اس وقت ذہن میں محفوظ ہیں، لیکن اپنے ذوق اور حالات کے لحاظ سے "الفرقان" کا "مجدد نمبر" اور "شاہ ولی اللہ نمبر" زیادہ دلچسپی سے پڑھے۔

نمبر ۱۰- وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ ہے اور شدید ضرورت کے بغیر ان کے چند صفحات کا پڑھنا بھی میرے لیے دشوار ہے، وہ تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک مناظرہ اور تردید کی کتابیں، دوسرے خشک فلسفیانہ مباحث یا وحدۃ الوجود وغیرہ، اور فلسفۂ اخلاق کی متصوفانہ کتابیں، تیسرے قادیانی لٹریچر جو حسنِ انشاء، حلاوتِ تحریر اور عمقِ فکر سے یکسر خالی ہے۔

نمبر ۱۱- چوں کہ میری تحریر و تصنیف کا وقت صبح کو نماز فجر اور چائے کے بعد سے لے کر موسم گرما میں اس وقت تک کہ گرمی شدید نہ ہو اور موسم سرما میں ظہر کے قریب تک محدود ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس کے علاوہ سالہا سال سے کسی دوسرے وقت میں تصنیفی کام نہیں کیا کرتا، اس لیے پڑھنے کا وقت ظہر سے عصر تک اور سفروں میں تقریباً دن بھر (کھانے اور آرام کرنے کے علاوہ)۔ رات کا پڑھنا نظر کی کمزوری کی وجہ سے تقریباً بیس پچیس سال سے بالکل بند ہے سوائے اس زمانہ کے جس میں دارالعلوم کے اندر حدیث کا کوئی درس اپنے ذمے لے لیتا تھا، اس کے لیے بہت مطالعہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ لکھنے کا کام نہیں ہوتا یا لکھنے کے لیے مطالعہ کی ضروت ہوتی ہے تو فجر وظہر کے درمیان کا وقت بھی مطالعہ ہی میں صرف ہو جاتا ہے۔

میں میز کرسی پر یا ڈسک پر لکھنے کا کبھی عادی نہیں رہا۔ عام طور پر اس طرح لکھتا ہوں جس طرح آپ نے کاپی نویسوں کو لکھتے دیکھا ہوگا۔

رفتار مطالعہ عام طور پر سست ہے، طبیعت رواروی کے ساتھ پڑھنے پر قانع نہیں ہوتی، لیکن اس کا زیادہ تر انحصار موضوع اور مضمون کی نوعیت پر ہے، ادبی اور تاریخی چیزیں تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں اور علمی مباحث آہستہ رفتاری اور دقت نظر کے ساتھ۔

نمبر۱۲۔ عام طور پر شور وشغب اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں اور بعض اوقات لکھنے میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا، اور شاید بعض لوگوں کے لیے یہ بات موجبِ تعجب ہو کہ بعض اوقات اس سے مدد ملتی ہے۔ میں نے اپنے بعض اہم مضامین اور کتابیں تھرڈ کلاس کے مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں لکھی ہیں۔ جب طبیعت میں روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے اندر لکھنے کا تقاضا اور مضامین و خیالات کی چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو شور و ہنگامہ اس میں مخل نہیں ہوتا، لیکن جب ایسی کیفیت نہ ہو اور طبیعت بند و کند معلوم ہوتی ہو تو تنہائی اور خاموشی کی تلاش ہوتی ہے۔

نمبر۱۳۔ جب سے زمانہ قیام اور حضر کی مشغولیتیں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، کسی نئی کتاب کے مطالعہ کا زیادہ تر موقع سفر ہی میں ملتا ہے جو بکثرت پیش آتے ہیں، اور اس لحاظ سے

www.abulhasanalinadwi.org

سفر بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ صدہا صفحات کی کتابیں اکثر سفر ہی میں ختم ہوتی ہیں۔

نمبر۱۴- کتابوں پر نشان لگانے کی عادت بہت پرانی ہے اور یہ میں نے اپنے استاد اور بزرگ مولانا سید طلحہ صاحب ایم-اے، سابق استاد اورینٹل کالج-لاہور سے سیکھی ہے، لیکن نشان بڑی احتیاط سے سرخ پنسل سے لگاتا ہوں۔ اگر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے تو اس کے ٹھہرنے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ نشان کتاب میں بدنمائی نہ پیدا کرے، حاشیے پر اپنی رائے بہت خوش خط لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعض اوقات ناواقف کو ایسے حواشی چھپے ہوئے نظر آتے ہیں، ان نشانوں اور حواشی سے کتاب کے دوبارہ پڑھنے میں مدد ملتی ہے اور اس کے بہترین حصے تصویر کی طرح سامنے آجاتے ہیں۔

نمبر۱۵- میرا حافظہ خاندانی طور پر کمزور ہے، لیکن اپنے ذوقی مضامین میں حافظہ زیادہ رفاقت اور رواداری کا ثبوت دیتا ہے۔ غیر ذوقی مضامین میں اس سے بہت کم۔ میرے خیال میں حافظہ کا بہت کچھ تعلق ذوق و پسندیدگی سے بھی ہے۔

نمبر۱۶- اپنی پسندیدہ چیزوں میں ہم نشینوں اور عزیزوں کو شریک کرنا ایک فطری امر ہے اور شاید یہ بات میرے اندر بہت سے لوگوں سے بڑھی ہوئی ہوگی۔ مجھے اپنے بزرگوں کی اس عادت سے خود بھی فائدہ پہنچا اور میں سمجھتا ہوں کہ میرے عزیزوں اور اہل مجلس کے لیے بھی یہ بات اسی قدر مفید ہوگی۔

نمبر۱۷- ہم دونوں بھائیوں کو ایک بڑا وسیع اور متنوع کتب خانہ وراثت میں ملا جو کئی پشتوں اور ایک علمی خاندان کا اندوختہ اور ترکہ ہے، لیکن اس کی موجودگی میں بھی مجھے اپنے ذوق وضرورت کی کتابیں خریدنے کا شوق بچپن سے ہے اور اس سلسلے کے بچپن کے واقعات کسی حد تک مضحک اور کسی حد تک سبق آموز ہیں۔ اس شوق کا آغاز اس عمر سے ہو گیا تھا جس عمر میں عام طور پر بچوں کو کھلونوں اور مٹھائیوں کے خریدنے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ ذوق اور ثقاہت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس شوق میں بھی اصلاح و ترقی ہوتی

www.abulhasanalinadwi.org

گئی، چنانچہ خود اپنی خریدی ہوئی اور مصر و شام سے منگوائی ہوئی کتابوں کا بھی ایک ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، جو اگر چہ زیادہ وسیع نہیں ہے، مگر منتخب ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جن کی حیثیت کسی موضوع پر چھوٹے سے دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کی ہے اور جو اپنے موضوع پر خود ایک چھوٹے سے کتب خانے کا کام دیتی ہے۔

چوں کہ شروع سے عربی ادب وانشاء کا ذوق ہے، اس لیے ان میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کی کوئی علمی وفکری اہمیت نہیں ہے، مگر ان کے پڑھنے سے طبیعت میں شگفتگی اور لکھنے میں روانی پیدا ہوتی ہے، مثلاً ''اغانی'' کا خلاصہ اور ادباء کے مضامین کے مجموعے۔ اس منتخب ذخیرے میں ''دیوان غالب''، ''مثنوی'' کی کلید ''مرآۃ المثنوی''، کلام اقبال اور ''گلستان''، ''بوستان'' بھی ہے۔

بعض دفعہ مصر وشام کی کسی نئی چھپی ہوئی کتاب کے حصول کے لیے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے، وہ بھیجتے ہیں۔ بعض اوقات ایک کتاب جس کی قیمت آٹھ دس روپے سے زیادہ نہیں، کسی تصنیف کے سلسلہ میں ہوائی ڈاک سے منگوائی اور وہ پچاس ساٹھ روپے میں پڑی۔

اسلامی الفکر عرب مصنفین اکثر اپنی تصنیفات از راہ کرم ہدیۃً بھیجتے ہیں۔ اکثر سفروں میں علمی ہدایا مصنفین کے دستخطوں سے مزین ہو کر ملے ہیں جو اس ذاتی کتب خانہ کی زینت ہیں۔

نمبر ۱۸- کتابیں مستعار دینے کے سلسلے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ اس سلسلے میں اچھے اچھے اہل علم کی بے احتیاطی مشہور ومعلوم ہے۔ بعض مرتبہ مستعار لینے والے اپنی ذمے داری محسوس نہیں کرتے اور مستعار دینے والا بھول جاتا ہے کہ کتاب کس کو دی تھی۔ میرے ساتھ یہ المیہ بہت پیش آیا ہے۔ اس سے کمتر المیہ یہ ہے کہ مستعار لینے والے کتاب بے احتیاطی کے ساتھ پڑھتے ہیں، کتاب پر دھبے اور نشانات پڑ جاتے ہیں اور بعض

www.abulhasanalinadwi.org

ستم ظریف اس پر اپنے حواشی اور تأثرات ثبت کردیتے ہیں اور کتاب جی سے اتر جاتی ہے۔ مجھے دو مرتبہ ایک کتاب سے اس لیے دست بردار ہونا پڑا کہ اس پر دھبے پڑ گئے تھے یا حواشی نے اس کی رونق ورعنائی ختم کردی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کردوں کہ میں شروع سے کتاب کے بارے میں کچھ زیادہ نفاست پسند اور ذکی الحس واقع ہوا ہوں۔ کتاب پر پسینے کا ایک دھبہ یا کسی پڑھنے والے کی حاشیہ آرائی مجھے کتاب کے مطالعہ سے محروم کردیتی ہے اور بعض اوقات مستعار لینے والے ہی کو نذر کردیتا ہوں کہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔

نمبر ۱۹- میرے نزدیک ابتداء میں ادبی مطالعہ کی اہمیت بہت ہے۔ خوش قسمتی سے جن لوگوں کو ابتداء میں اچھی ادبی کتابوں کے مطالعہ کا موقع مل جاتا ہے اور ان کا ادبی ذوق کسی حد تک بن جاتا ہے، یا ان کے اندر ادبیت کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں، وہ خواہ فلسفہ کا موضوع اختیار کریں یا دینیات کا میدان، ان کی تحریر میں شگفتگی اور شیرینی باقی رہتی ہے اور وہ زیادہ کامیاب مصنف ثابت ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک ہر مرحلے میں کسی نہ کسی قدر ادبی مطالعے کا عنصر شامل رہنا چاہیے۔

نمبر ۲۱- ادبی مطالعہ اور تحریروں کی مشق کے لیے اس وقت نوجوانوں کو مولانا شبلی، مولانا حالی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید عابد حسین، چودھری غلام رسول مہر، مولانا شاہ معین الدین ندوی کی کتابوں اور تحریروں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ اس سے زیادہ ادبی ذوق اور زبان سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو تو پھر کچھ تحدید نہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور خالص ادیبوں کو بھی پڑھنا ہوگا۔ یہ نام تحریر کی پختگی، شگفتگی اور زبان کی صحت کے لحاظ سے پیش کیے گئے ہیں۔ کسی کے مخصوص خیالات وافکار سے یہاں بحث نہیں۔

نمبر ۲۲- محض تفریحی ادب کے مطالعہ سے ذہن میں سطحیت، علم اور فکر میں بے مغزی اور

www.abulhasanalinadwi.org

معلومات میں تہی مائیگی پیدا ہوتی ہے اور ایسا آدمی کوئی وقیع اور موثر کام نہیں کرسکتا۔ تفریحی ادب کا وہی حصہ ہونا چاہیے جو نمکیات وفواکہ کا ہوتا ہے، اور بعض اوقات اس سے کہیں زیادہ فلسفیانہ اور فکر انگیز مباحث کا مطالعہ بھی ذہن میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ بھی شامل رہنا چاہیے۔

نمبر۲۳- اردو ڈائجسٹوں کا سلسلہ مفید اور ہمت افزائی کا مستحق ہے، لیکن ان میں مزید محنت اور حسن انتخاب کی ضرورت ہے۔ اردو کی اشاعت و ترقی کے لیے یہ سلسلہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ ان میں اگر ادبی عنصر کا اضافہ اور ادبی شخصیات اور کلاسیکل ادب کے تعارف کا سلسلہ بھی شروع کر دیا جائے اور وہ شوق انگیز اور مطالعہ کے لیے مہمیز ہو تو اس سے یہ خطرہ بھی باقی نہیں رہے گا کہ لوگ قدیم مستند ادب سے بے تعلق ہو جائیں گے۔

نمبر۲۴- اس سلسلہ میں دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین، اسلامک پبلی کیشنز، اقبال اکیڈمی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام جیسے اداروں کی مطبوعات کا مطالعہ مفید ہو گا۔ اس سلسلہ میں تواضع اور انکسار کو برطرف رکھ کر ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے سلسلے کے مطالعہ کا مشورہ بھی دوں گا۔

نمبر۲۵- میرے نزدیک ابتداء میں ناظرہ قرآن شریف پڑھنا بہت ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین تعلیم کی رائے کے مطابق تھوڑی سی اردو پڑھا کر قرآن شریف کا پڑھانا زیادہ بہتر ہوگا یا عام دستور کے مطابق قرآن شریف ہی سے ابتداء کرانا زیادہ بہتر ہے۔ بہر حال مجھے اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ سمجھ کر قرآن شریف پڑھنے کی استعداد پیدا ہونے کے انتظار میں ناظرہ پڑھانے کو بالکل موقوف رکھا جائے۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھنا اور محض تلاوت خود ایک بڑی عبادت اور ایک امرِ مقصود ہے، سمجھ کر پڑھنا یہ ایک الگ کام اور ضرورت ہے۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

حواشی

۱- ماہنامہ ''الحق'' (اکوڑہ خٹک) مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲۷

۲- خانوادہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی، جس کے ایک فرد حضرت سید احمد شہید بانیٔ ''تحریکِ اصلاح و جہاد'' تھے۔

۳- یہ کتاب بڑی تقطیع پر ''صمصام الاسلام'' کے نام سے مطبع نولکشور۔لکھنؤ کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ بہت سے دیندار خاندانوں میں وہ بڑے ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھی (ابوالحسن علی)۔

۴- یہ سفرنامہ پہلے ماہنامہ ''معارف'' (اعظم گڑھ) میں بالاقساط شائع ہوا، پھر انجمن ترقی اردو۔دہلی، اور مکتبہ ندوۃ العلماء۔لکھنؤ کی جانب سے ''دہلی اور اس کے اطراف'' کے نام سے چھپا۔

۵- یہ مجالس مکتبہ الفرقان۔لکھنؤ کی طرف سے ''صحبتے با اہل دل'' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں، اور اس وقت تک اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں (ابوالحسن علی)۔

۶- آپ حضرت شاہ پیر محمد صاحب سلونی چشتی نظامی کی اولاد میں سے تھے، زندگی گمنامی میں بسر کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس حدیث کی خدمت قبول فرمائی اور کئی سال وہاں شیخ الحدیث رہنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں انتقال کیا (ابوالحسن علی)۔

۷- --- اس کا ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں کے قلم سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام۔لکھنؤ نے ''نقوش اقبال'' کے نام سے شائع کیا ہے۔(ابوالحسن علی)

۸- اِس کتاب کے زیرِنظر حصے ''میری علمی ومطالعاتی زندگی'' کا آغاز اِسی مضمون سے کیا گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سید رضوان علی ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

—— سوانحی خاکہ ——

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک عالمگیر شہرت کی شخصیت تھے، ہندوستان اور عالم عرب کی تو وہ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں تنہا علمی و دینی نمائندہ شخصیت تھے۔ وہ ہندوستان یا برصغیر میں مولانا علی میاں یا صرف علی میاں اور عالم عرب میں شیخ ابوالحسن یا الشیخ الندوی کے نام سے مشہور تھے۔ (نام کے آخر میں ''میاں'' کا لفظ ہندوستان میں سیدوں کے نام بعد لگایا جاتا ہے اور کنیت عرب ممالک میں احتراماً استعمال ہوتی ہے)۔ حجاز مقدس کے اہل علم و معرفت مولانا مرحوم کو بجا طور پر برکۃ العصر (اپنے زمانے کی برکت) کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کا امتیازی وصف، وسیع العلم اور کثیر التصانیف ہونے کے ساتھ، اسلام اور ملت اسلامیہ کے لیے ان کا سوزِ دروں اور ان کی للّٰہیت و انابت الی اللہ تھی۔ مولانا مرحوم کے علمی شغف، کثرتِ مطالعہ، لاتعداد تصانیف، تواضع و انکسار، سادگی و بلند حوصلگی، زہد و استغناء عن الخلق، عزیمت و ہمت، قوتِ ایمانی، ہمہ وقت کی فکری و عملی سرگرمی اور سب سے بڑھ کر تعلق مع اللہ اور دعوتِ اسلامی کے لیے ان کی بے قراری اور تڑپ کو یاد کرتا ہوں تو ان کی رحلت پر مجھے جگر مراد آبادی مرحوم کا آخری زمانے کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اور غالب کی زبان میں:

www.abulhasanalinadwi.org

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مولانا مرحوم ایک علمی و ادبی خاندان کے فرد تھے اور اس زبان سے مانوس۔ کافی پہلے ۱۹۵۰ء میں جب میں ان کے ساتھ پہلے حج پر گیا تھا تو صحن حرم میں بیٹھے ہوئے طواف کرنے والوں کے جھرمٹ میں کعبہ کو دیکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر فارسی کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

از صدسخن پیرم یک حرف مرا یاد است
عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

اور مصرعہ ثانی ''عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است'' کو مکرر، سہ کرر دہراتے تھے۔

اب مولانا مرحوم کی رحلت کے بعد نہ صرف مسلمانانِ ہند کی بے شمار اہم تنظیمیں جن کے وہ صدر اور روح رواں تھے، بلکہ حجاز مقدس، اوکسفرڈ، لکسمبرگ وغیرہ کی اسلامی عالمی اور علمی تنظیمیں جن کے مولانا مرحوم صدر یا رکنِ تاسیسی (فاؤنڈر ممبر) تھے، اور دنیائے اسلام بلکہ یورپ وامریکہ کے وہ منبر ومحراب مرحوم کو یاد کر کے روئیں گے، جہاں سے مولانا نے بڑی دردمندی، دل سوزی اور اخلاص کے ساتھ مسلمانوں کو اللہ کا پیغام سنایا اور ''معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز'' کی صدا دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا علی میاں مرحوم کو جو محبوبیت ومقبولیت عطا فرمائی تھی، وہ بیسویں صدی کے نصف اخیر میں برصغیر کی حد تک، بلکہ پورے عالم عرب میں کسی مسلمان مفکر و عالم کو حاصل نہ ہوئی۔ شہید حسن البنا کو مصر میں ایسی ہی محبوبیت ومقبولیت حاصل تھی، لیکن وہ ۱۹۴۹ء میں شہید کر دیے گئے تھے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس تمام شہرت اور مولانا مرحوم کے پاکستان میں متعدد دوروں کے باوجود مولانا کی رحلت پر اب تک پاکستانی اخبارات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں مولانا کے سوانح حیات سے متعلق معلومات ناقص یا بعض اوقات غلط ہیں، اور ان کو زمانی ترتیب میں تو پیش ہی نہیں کیا گیا۔ کراچی کے مجلّہ ''تہذیب'' میں اپنے مضمون میں میں نے اس کی مختصر کوشش کی تھی،

www.abulhasanalinadwi.org

لیکن ایک عام مضمون میں اس کی زیادہ گنجایش نہیں ہوتی، اس لیے اس حیثیت سے وہ اور میری دوسری تحریریں بھی تشنہ تھیں، بعض دوسرے مصنفین کی جو تحریریں جرائد و مجلات میں چھپی ہیں، ان میں نقص کے ساتھ اغلاط بھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مضمون نگار صاحبان نے مولانا مرحوم کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروانِ زندگی'' کی سات مطبوعہ جلدیں نہیں پڑھی ہیں۔ ادارہ تحقیقات اسلامی- اسلام آباد نے یہ سیمینار منعقد کر کے ایک اچھا موقع فراہم کیا ہے کہ مولانا مرحوم کی شخصیت، خاندان، افکار و تصنیفات اور داعیانہ عملی سرگرمیوں سے متعلق مستند معلومات جمع کیے جاسکیں۔

خاندان

مولانا برصغیر میں پھیلے ہوئے کثیر سادات (جو سیدنا حسینؓ کی ذریت میں ہیں) کے برخلاف سیدنا حسنؓ کی اولاد میں سے تھے، سیدنا حسنؓ کے پوتے عبداللہ المحض کے پوتے عبداللہ بن محمد النفس الزکیہ جو عبداللہ الاشتر کے لقب سے مشہور تھے، اہل بیت میں سے پہلے شخص تھے جو ہندوستان آئے۔ مولانا علی میاں انہی عبداللہ الاشتر کی نسل سے تھے۔ مولانا مرحوم کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے اپنی بے نظیر کتاب ''نزہۃ الخواطر'' کی پہلی جلد میں ان کے حالات کسی قدر تفصیل سے دیے ہیں اور ان کو ''جدنا الکبیر'' (ہمارے بڑے دادا) کہہ کر یاد کیا ہے۔ یہ اپنے والد محمد النفس الزکیہ کی انقلابی تحریک کے دوران میں عباسی خلیفہ ابوجعفر المنصور کی تیغ خون آشام سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے والد کے مشورے سے سندھ آئے تھے، کیونکہ اس زمانے میں سندھ کا عباسی گورنر اہل بیت کا وفادار تھا، مدینہ اور بصرہ میں عبداللہ الاشتر کے والد اور چچا کی انقلابی تحریک کی ناکامی کے بعد منصور نے سندھ کے گورنر کو عبداللہ الاشتر کی گرفتاری کے لیے لکھا، اس نے محمد النفس الزکیہ کے خاندان سے اپنی محبت کے سبب ان کو دریائے سندھ کے پار کچھ کے راجہ کے پاس بحفاظت بھیج دیا۔ منصور نے دوسرا گورنر بھیجا اور عبداللہ الاشتر کو گرفتار کرنے کے لیے

www.abulhasanalinadwi.org

لکھا، اور اس نئے گورنر سے ایک معرکے میں عبداللہ الاشتر دریائے سندھ کے کنارے شہید ہوگئے، ان کے ساتھیوں نے منصور کے فوجیوں کے ہاتھوں لاش کی بے حرمتی کے خوف سے اسے دریائے سندھ میں بہادیا۔ (کلفٹن-کراچی میں کنارۂ سمندر عبداللہ غازی کے مزار کو عبداللہ الاشتر کا مزار سمجھنا سراسر غلط ہے، جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ''تحقیقات وتأثرات'' میں اسے بدلیل ثابت کیا ہے)۔

اس طرح عبداللہ الاشتر مولانا علی میاں کے پہلے جدامجد تھے جن کا خون سندھ کی سرزمین پر بہا، دوسرے جدامجد اس کے صدیوں بعد سید احمد شہیدؒ تھے، جنھوں نے انیسویں صدی کے اوائل میں صوبہ سرحد کو سکھوں کے تسلط سے آزاد کرایا تھا اور وہاں ایک سچی اسلامی حکومت قائم کی تھی، پھر وہ سکھوں سے لڑتے ہوئے اپنوں کی غداری کے سبب ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ (وادی کاغان) میں شہید ہوئے۔

مولانا کے وہ جداعلیٰ جن کی ذریت سے براست مولانا سید ابوالحسن علی مرحوم تھے، وہ امیر کبیر سید قطب الدین تھے، جو فتنۂ تاتار کے زمانے میں بغداد سے براہ غزنی دہلی تشریف لائے جہاں خاندان غلاماں کی حکومت عراق وایران کے ستم رسیدہ مسلمانوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ ''طبقات ناصری'' اور ''تاریخ فیروز شاہی'' (از ضیاء الدین برنی) کے مطابق امیر قطب الدین یہاں کچھ عرصہ شیخ الاسلامی کے منصب پر فائز رہے، اور پھر چونکہ جہاد وفتح کا زمانہ تھا، اپنے پانچ سو رفقاء اور ایک لشکر کے ساتھ مشرق کی سمت میں جہاد پر نکلے، آپ نے الہ آباد کے قریب قلعہ کڑہ اور مانک پور شہر فتح کیا۔ یہ بہرام شاہ کا زمانہ تھا جس نے یہ علاقہ امیر قطب الدین کو بطور جاگیر دے دیا، ان کا انتقال ۶۷۷ھ میں ہوا۔ ان کی اولاد واحفاد میں کافی اہل علم وفضل ہوئے جو اس علاقے میں مقیم رہے۔ گیارہویں صدی ہجری/ سترہویں صدی عیسوی میں اس خاندان کے ایک مشہور عارف باللہ بزرگ شاہ علم اللہ کڑہ مانک پور سے آکر شہر رائے بریلی کے باہر سیئی ندی کے کنارے آباد ہوئے۔ شاہ علم اللہ مشہور ومعروف صوفی بزرگ سید آدم بنوریؒ کے مرید وخلیفہ

www.abulhasanalinadwi.org

تھے، اگر چہ ان کا ارادہ مکہ مکرمہ ہجرت کا تھا، لیکن اپنے مرشد کے اشارے پر اس ویران جگہ آ کر آباد ہوئے اور اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ مل کر اپنے ہاتھوں سے بغیر مینار کے ایک چھوٹی سی مسجد ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں ندی کے کنارے بنائی۔ یہ بستی تکیہ (خانقاہ) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس موقع پر مغل بادشاہ عالمگیر نے، صاحب ''نزہۃ الخواطر'' کے بیان کے مطابق ان کو ایک جاگیر پیش کرنا چاہی، لیکن آپ نے قبول نہیں فرمائی، اور زہد وفقر اور علم وفضل کی زندگی کو پسند فرمایا۔ شاہ علم اللہ کی وفات ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء میں ہوئی۔ آپ کی دو تصانیف ''عنایۃ الہادی'' اور ''العطیات'' کا ذکر مولانا حکیم سید عبدالحی نے ''نزہۃ الخواطر'' میں کیا ہے۔ تکیہ کلاں (رائے بریلی) میں یہ قدیم چھوٹی مسجد اسی طرح آج بھی موجود ہے، اگر چہ اس میں مولانا علی میاںؒ کے آخری زمانے میں جمعہ ورمضان میں نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے کچھ توسیع کردی گئی ہے، انہی بزرگ کے نام پر اسے دائرہ شاہ علم اللہ کہا جاتا ہے۔

شاہ علم اللہ کے بعد اس خاندان میں گو علم وفضل اور زہد وفقر کا چرچا رہا، لیکن ایک دوسری عظیم شخصیت اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں سید احمد شہید ہوئے جو ''شہید بالاکوٹ'' کی شناخت سے بھی مشہور ہیں۔ مولانا علی میاں عصر حاضر میں وہ پہلی شخصیت ہیں، جنھوں نے اپنے ان جد امجد کو دنیائے علم میں پہلے عربی میں اور پھر اردو میں کما حقہٗ متعارف کرایا، یعنی عنفوانِ شباب، سولہ سال کی عمر میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے ایک مقالے کا عربی میں ترجمہ کیا جو ۱۹۳۱ء میں مصر میں سید رشید رضا کے مجلّہ ''المنار'' میں شائع ہوا اور علیحدہ سے ایک رسالے کی شکل میں طبع ہوا۔ پچیس سال کی عمر میں یعنی ۱۹۳۹ء میں مولانا مرحوم نے سید احمد شہید پر ایک مبسوط کتاب تصنیف کی جس نے ملک کی انتہائی اہم علمی و دینی شخصیات جیسے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ۱۹۶۹ء میں مولانا مرحوم نے کتاب کی دوسری جلد لکھی اور پہلی جلد میں کافی اضافہ کیا۔ اس دوران میں مولانا غلام رسول مہر اور بعض دوسرے مصنفین کی کتابیں اردو اور انگریزی میں سید احمد شہید پر

www.abulhasanalinadwi.org

شائع ہوئیں، لیکن مولانا علی میاں کی کتاب خاندانی قلمی مآخذ اور احاطۂ علمی کے سبب ابھی تک اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔

سید احمد شہید کی شہادت کے ۸۳ سال بعد اس خاندان میں وہ بچہ ہوا جس کا نام علی رکھا گیا اور جس نے بڑے ہو کر اس خاندان کا نام نہ صرف برصغیر، بلکہ پورے عالم میں روشن کیا۔ مولانا علی میاں کے دادا سید فخر الدین خیالی ایک ثقہ عالم، صاحب حال بزرگ اور مصنف تھے، انہوں نے متعدد تصانیف فارسی اور اردو میں یادگار چھوڑی ہیں، جو غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں ایک کتاب بہ عنوان ''مہر جہاں تاب'' ہے جس کی صرف پہلی جلد کی تکمیل ہو سکی۔ یہ فارسی زبان میں ایک انسائیکلو پیڈیا ہے، یہ کتاب بڑے حجم کے تیرہ سو صفحات پر مشتمل ہے، اس میں تمام علوم وفنون کے ذکر کے ساتھ انبیائے کرام، ائمہ اہل بیت، صحابہ وتابعین اور حکماء کے ساتھ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے شعراء کا ذکر بھی ہے۔ دوسری جلد مصنف ساری دنیا کے جغرافیے اور تاریخ پر لکھنا چاہتے تھے، لیکن آدھی کتاب لکھنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ فارسی زبان رو بہ زوال ہے، ان کی طبیعت افسردہ ہو گئی اور دوسری جلد کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ مصنف کی اور بھی متعدد کتب فارسی اور اردو میں ہیں۔ فارسی میں ایک کتاب شاہ علم اللہ کی سیرت پر ''سیرۃ علمیہ'' کے نام سے ہے۔ وہ شاعر بھی تھے، ''خیالی'' تخلص کرتے تھے، فارسی اور اردو زبانوں میں ایک ضخیم دیوان چھوڑا ہے، ''مسدس حالی'' کے جواب میں ''مسدس خیالی'' بھی لکھی ہے، سال وفات ۱۳۲۶ھ/ ۱۹۰۸ء ہے (نزہۃ الخواطر جلد ہشتم میں اُن کا تفصیلی سوانحی خاکہ ہے، نیز محمد الحسنی ندوی نے ''تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی'' کے نام سے اُن کی سوانح حیات مرتب کی ہے)، افسوس کہ ان کی کتابیں طبع نہیں ہو سکیں۔

مولانا علی میاں کے والد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب بھی اپنے والد مولانا فخر الدین کی طرح کثیر التصانیف عالم وادیب تھے۔ ان کا امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے فصیح وبلیغ عربی زبان میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں ''نزہۃ الخواطر'' سب سے زیادہ مشہور اور ضخیم ہے۔ آٹھ جلدوں میں

www.abulhasanalinadwi.org

کافی عرصہ پہلے حیدرآباد-دکن کے دائرۃ المعارف العثمانیہ سے شائع ہوئی تھی۔ ایک نیا ایڈیشن بڑے سائز کی تین جلدوں میں حال ہی میں دمشق سے شائع ہوا ہے، لیکن اس کا نام ''الاعلام بمافی الہند من الاعلام'' رکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' دمشق کی المجمع العلمی (موجودہ مجمع اللغۃ - دمشق) سے شائع ہوئی ہے، دوبارہ پہلے ایڈیشن کی تصحیح ناچیز راقم کے ہاتھوں ہوئی۔ تیسری عربی کی انتہائی معلوماتی کتاب ''الہند فی العہد الاسلامی'' دائرۃ المعارف العثمانیہ۔ حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب اردو میں اپنے ''تذکرہ شعرائے اردو موسوم بہ گل رعنا'' کی وجہ سے مشہور ہیں، یہ اہل نظر کے نزدیک محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' سے زیادہ جامع اور وقیع ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور اردو کتب بھی شائع شدہ ہیں۔ مولانا علی میاں نے اپنے والد پر ''حیاتِ عبدالحی'' کے نام سے ایک کافی مفصل کتاب لکھی ہے، جو دہلی اور کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ مولانا حکیم عبدالحی صاحب، علامہ شبلی کے ساتھیوں میں تھے، ان کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

مولانا علی میاں کی والدہ سیدہ خیر النساء ایک انتہائی پاکباز اور نیک سیرت خاتون تھیں، حافظ قرآن تھیں، اور شاعرہ بھی تھیں۔ ان کا حمد ونعت کا ایک مجموعہ چھپا ہوا ہے اور ''حسن معاشرت'' کے نام سے خواتین کے لیے ان کی ایک مفید اور مختصر کتاب بھی مطبوعہ ہے۔ مولانا علی میاں اپنی والدہ سے بہت محبت اور ان کا بہت احترام کرتے تھے، کیونکہ مولانا لڑکپن میں یتیم ہو گئے تھے، اور ان کی والدہ ہی نے ان کی تربیت کی تھی۔ مولانا علی میاں نے اپنی والدہ پر بھی ایک کتاب ''ذکر خیر'' کے نام سے لکھی ہے۔ اس طرح قدیم سے ''ایں خانہ تمام آفتاب است'' کا مصداق ہے۔

ولادت وتربیت

مولانا علی میاں مرحوم ۶ محرم ۱۳۳۳ھ/ ۲۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی پہلی بیوی کی وفات ہوگئی تھی۔ مولانا مرحوم دوسری بیوی سے تھے۔ جنہوں نے اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

شادی سے قبل خاندان میں دوطرف رشتے کے بارے میں اختلاف کے دوران میں ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک طرف مولانا کے والد مولانا عبدالحی صاحب عالم و متقی، لیکن مالی حیثیت سے کمزور شخص تھے، دوسری طرف والدہ کے چچا کے بیٹے تھے جو بہت فارغ البال اور زمیندار گھرانے سے تھے۔ والدہ نے نسبت سے قبل جو خواب دیکھا تھا، اس میں ان کو ایک آیت سنائی گئی جوان کے دل پر ثبت ہوگئی اور جب اس کا ترجمہ انہوں نے دیکھا تو بہت مطمئن اور خوش ہوئیں۔ ان کے والد مولانا ضیاء النبی تو اس آیت اور اس میں پنہاں بشارت کو سن کر رونے لگے، آیت تھی: **فلا تعلم نفس ما أخفي لهم من قرة أعين جزآءً بما كانوا يعملون** (السجدہ: ۱۷) اور یہ قرۃ اعین (آنکھوں کی ٹھنڈک) شادی کے بعد مولود ہونے والے علی میاں تھے۔

یہ رشتہ ہو گیا، مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب کی دو صاحبزادیوں کے بعد علی میاں پیدا ہوئے، لیکن جب ان کی عمر صرف نو سال کی تھی تو ۱۹۲۳ء میں والد کی وفات ہوگئی۔ مولانا مرحوم کے سوتیلے بڑے بھائی عبدالعلی اس وقت لکھنؤ میں میڈیکل کالج کے طالب علم تھے اور کالج کی طرف سے دوسرے طلبہ کے ساتھ مدراس گئے ہوئے تھے۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان کی والدہ کو بہت دخل تھا، اور ساتھ ہی ان کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کو۔ رائے بریلی میں تربیت کی ذمہ داری والدہ محترمہ نے لے رکھی تھی، اور لکھنؤ میں برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی نے۔

تعلیم

مولانا کی ابتدائی تعلیم، یعنی اردو، فارسی اور حساب وغیرہ کی تعلیم گھر پر اپنے اعزہ یا بعض ٹیوٹروں کے ذریعے ہوئی۔ مولانا کے والد صاحب لکھنؤ میں رہتے تھے، جہاں ان کا مطب تھا اور ندوہ کی نظامت (سکریٹری شپ) کے فرائض کی انجام دہی ان کا مشغلہ تھا، اور اس کے علاوہ مستقل تصنیف و تالیف۔ مولانا کی رسم بسم اللہ تکیہ کلاں میں ہوگئی تھی، پہلے پورا ناظرہ قرآن پڑھا اور پھر لکھنؤ میں یہ تعلیم جاری رہی۔ ۱۹۲۳ء میں والد صاحب کی وفات کے بعد مولانا کا خاندان

www.abulhasanalinadwi.org

رائے بریلی منتقل ہوگیا۔ والدہ، دو بڑی بہنیں اور خود مولانا۔ بڑے بھائی جو میڈیکل کالج کے چوتھے سال میں تھے، لکھنؤ میں رہے۔ کرائے کا مکان مالی وسائل نہ ہونے کے سبب خالی کرنا پڑا جو امین آباد یعنی شہر کے وسط میں تھا اور اسی میں نیچے مولانا حکیم سید عبدالحی کا مطب تھا۔ والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں (بھوپال) کے فرزند نواب سید نورالحسن مولانا کے والد کے انتہائی عزیز اور گہرے دوست تھے جن سے کچھ خاندانی تعلق بھی تھا، مولانا علی میاں کے بڑے بھائی والد کی وفات کے بعد ان کے کہنے پر ان کی کوٹھی کے ایک حصے (annexe) میں منتقل ہوگئے۔ رائے بریلی میں مولانا کی تعلیم وتربیت والدہ کے زیرنگرانی جاری رہی، جہاں انہوں نے مولانا کو قرآن کی بعض بڑی سورتیں حفظ کرائیں اور کڑی دینی واخلاقی تربیت پوری توجہ کے ساتھ کی۔

پھر بڑے بھائی عبدالعلی صاحب نے مولانا کو لکھنؤ اپنے پاس بھوپال ہاؤس میں بلا لیا، جہاں مولانا کوٹھی کے دوسرے بچوں کی طرح رہتے تھے، نواب نورالحسن خاں کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کی بیگم مولانا کا اپنے پوتوں کی طرح خیال رکھتی تھیں۔ بچپن میں نوابی کے اس ماحول میں رہنے کے سبب مولانا کی نگاہ سیر ہوگئی تھی، اور بعد میں دولت وثروت اور جاہ ومنصب کے مناظر نے انہیں کبھی مرعوب نہیں کیا۔ مولانا مرحوم نے اپنے ابتدائی بچپن کے حالات وکوائف کافی تفصیل کے ساتھ بڑے دلآویز اور دلچسپ انداز میں اپنی خودنوشت سوانح حیات ''کاروانِ زندگی'' کی جلد اول میں تحریر کیے ہیں، جن میں خاندانی شرافت، معصومیت، طبعی دینی و دعوتی میلان، کتب خوانی اور خرید کتب کے واقعات بڑے اثرانگیز ہیں۔

مولانا کی ابتدائی عربی کی تعلیم بھی رائے بریلی میں شروع ہوگئی تھی، صرف ونحو کی معروف کتابیں خاندان کے بعض لائق بزرگوں سے پڑھی تھیں، لیکن عربی کی باقاعدہ تعلیم ان کے سوتیلے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی کی نگرانی میں ہوئی جو اب ایم-بی-بی-ایس کر چکے تھے۔ وہ اسی مکان میں مطب کرتے تھے، جہاں کبھی ان کے والد صاحب کا حکمت کا مطب تھا، اور مکان کے ایک حصے میں اہل خانہ رہتے تھے۔ مولانا کی باقاعدہ عربی تعلیم خلیل بن محمد عرب کے پاس ہوئی، ان یمنی

www.abulhasanalinadwi.org

النسل عرب کے دادا حسین بن محسن الیمنی بھوپال میں مولانا حکیم عبدالحی کے حدیث میں استاد رہے تھے۔ یہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے پڑوسی اور لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی ادب کے پروفیسر تھے، درس نظامی اور عام ہندوستانی طریقہ تعلیم کے بالکل برعکس انہوں نے مجتہدانہ طور پر اپنا نصاب تعلیم ترتیب دیا تھا، اس میں مصر کی مطبوعہ بعض عربی کی ریڈرس وغیرہ تھیں، ان کو پڑھانے کا خاص ملکہ اور ذوق تھا، مولانا کی عربی زبان میں بچپن میں مہارت ان کی مرہون منت تھی جس کا مولانا مرحوم نے کھل کر اپنی خودنوشت میں اعتراف کیا ہے۔ اس زمانے میں مولانا پرائیویٹ ٹیوٹر سے انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ سال دو سال کی اس پرائیویٹ عربی وانگریزی کی تعلیم کے بعد ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے مولانا کو لکھنؤ یونیورسٹی کے فاضل ادب (عربی) کی کلاس میں اگست ۱۹۲۶ء میں داخل کرادیا۔ مولانا اس وقت یونیورسٹی میں سب سے کم عمر طالب علم تھے، یعنی اس وقت مولانا کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ مولانا نے بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ داخلے کے امتحان کے وقت کمرۂ انتظار میں بیٹھے ہوئے بعض باریش بڑی عمر کے طلبہ نے مولانا سے پوچھا: ''صاحبزادے! اپنی والدہ سے بھی یہاں آنے کی اجازت لے کر آئے ہو''۔ یہ ان کی صغرسنی پر ایک طنز تھا۔

محض نحو میں یا فلسفۂ نحو میں کمزور ہونے کے سبب مولانا ۱۹۲۸ء کے امتحان میں کامیاب نہ ہوسکے، ورنہ ادب منثور ومنظوم، بلاغت، انشاء وغیرہ میں فرسٹ کلاس کے مارکس تھے۔ بہرحال آیندہ سال مولانا فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ عنفوان شباب کی اس اولین کامیابی پر بطور انعام ہی مولانا مرحوم کی پھوپھی نے ان کو جون ۱۹۲۹ء میں لاہور بلایا تھا، اور یہی وہ سال ومہینہ تھا جس میں انہوں نے لڑکپن کی اس عمر میں اپنے پھوپھا مولانا طلحہ صاحب حسنی ایم-اے، استاذ عربی، اورینٹل کالج کے ساتھ علامہ اقبال سے پہلی ملاقات کی تھی۔ مولانا مرحوم اس بچپن میں علامہ اقبال کی ایک نظم ''چاند'' کا ترجمہ عربی میں کرچکے تھے جو انہوں نے علامہ کو سنایا، اور علامہ یہ جاننے کے لیے کہ کیا

www.abulhasanalinadwi.org

واقعی یہ لڑکا اتنی اچھی عربی جانتا ہے، ان سے عربی ادب کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور جوابات سن کر وہ بہت مطمئن اور خوش ہوئے۔

بعض لوگ جنہوں نے مولانا کی وفات کے بعد ان پر مضامین تحریر کیے ہیں، انہوں نے مولانا مرحوم کو دوران تعلیم میں صرف ندوہ، دیوبند اور مدرسہ قاسم العلوم-لاہور کا طالب علم بتایا ہے جو درست نہیں، بلکہ مولانا مرحوم کی اعلیٰ اور منظم تعلیم کی ابتداء لکھنؤ یونیورسٹی سے ہوئی، جہاں ان کے محبوب وشفیق ذاتی استاد خلیل عرب صاحب عربی ادب کے پروفیسر تھے۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ مولانا مرحوم کی تعلیم ان کے شفیق بڑے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے زیر نگرانی جو خود میڈیکل تعلیم سے قبل ندوہ اور دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، عام روش سے ہٹ کر ابن خلدون کے نظریۂ تعلیم کے مطابق ہوئی، یعنی ایک وقت میں ایک ہی علم کی مکمل تحصیل کی جائے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم جن سے مجھے زمانۂ قیام ندوہ میں تعارف اور ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا، فارسی وعربی کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور بڑے صائب الفکر انسان تھے، جس طریقے سے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو تعلیم دلائی تھی، اسی طریقے پر بعد میں اپنے بیٹے محمد الحسنی کو تعلیم دلائی جو جواں عمری میں عربی کا ایک بے مثال ادیب ومصنف تھا، اور اپنے چچا مولانا علی میاں کا گویا مثنیٰ تھا، افسوس کہ محمد الحسنی نے چالیس سال کی جواں عمری میں انتقال کیا۔

۱۹۲۹ء میں فاضل ادب عربی (لکھنؤ یونیورسٹی) سے فراغت کے بعد مولانا مرحوم نے مشہور محدث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا شبلی جیراج پوری سے دو سال تک حدیث وفقہ پڑھی، مولانا نے لکھا ہے کہ ان کا قیام بھی مولانا حیدر حسن خان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں تھا، جسے دارالحدیث کہنا چاہیے۔مولانا حیدر حسن خاں صاحب سے مولانا نے حرفاً حرفاً صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی پڑھی۔فقہ کی تعلیم جو ۲۹-۱۹۲۸ء میں شروع ہو چکی تھی، اس کا استحکام اور تکمیل بھی اس دوران میں ہوئی۔مولانا کے اس بیان سے مخالفینِ ندوہ کے اس الزام کی نفی ہوتی ہے کہ ندوہ میں صرف تاریخ وادب پر ہی زور دیا جاتا تھا۔خود میں نے ندوہ میں ایک سالہ تعلیمی

www.abulhasanalinadwi.org

قیام کے دوران میں مرحوم مولانا شاہ حلیم عطا سے تلمذ کیا اور ان سے صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ مولانا حیدر حسن خاں صاحب کے بعد وہی حدیث کے انتہائی وسیع المطالعہ اور باکمال استاد تھے، ان کا علم متحضر تھا اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم کی کتابوں کے تو گویا وہ حافظ تھے، اسی طرح علوم قرآن ان کو متحضر تھے۔ مولانا علی میاں نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں انہیں ''فنافی العلم'' لکھا ہے۔

یہاں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی ادب کی تعلیم کے ساتھ مولانا مرحوم پرائیویٹ طور پر انگریزی زبان کی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھے اور فاضلِ ادب سے فراغت کے بعد پوری طرح اس میں انہماک تھا اور میٹرک اور اس کے بعد انٹر کی تیاری کر رہے تھے، بعض اعزہ کا مشورہ تھا کہ مولانا انڈین سول سروس کے امتحان کی اس کے بعد تیاری کریں۔ مولانا مرحوم کے خاندان میں بیسویں صدی کے شروع میں بعض قریبی اعزہ نے لندن سے بیرسٹری اور ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کی تھیں، ایک حقیقی ماموں زاد بھائی ۱۹۲۱ء میں تعلیم کے لیے امریکہ گئے اور انجینئرنگ کے ساتھ نیویارک سے کامرس میں بی۔اے کی ڈگری لے کر آئے، ایک عزیز آئی۔سی۔ایس تھے، غرض ماحول کچھ اسی قسم کا تھا، لیکن مولانا مرحوم کی قدسی صفات والدہ نے رائے بریلی سے خطوط لکھ کر مولانا کو اس سے باز رکھا اور اپنے ان بزرگوں کی یاد دلائی جنہوں نے دینی علوم میں کمال پیدا کیا اور دارین کی سعادت حاصل کی۔ مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ والدہ ماجدہ کی نصیحت اور دعاؤں کے طفیل انگریزی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا اور ندوہ میں وہ مستقل طور پر حدیث و فقہ کے طالب علم بن گئے، لیکن مولانا کو انگریزی زبان میں اس حد تک مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ بعد کو بہ سہولت تصنیف و تالیف میں ضروری انگریزی مآخذ سے براہ راست استفادہ کر سکیں، اور ضرورت کے وقت گفتگو اور مافی الضمیر بیان کر سکیں۔ مولانا مرحوم کی کتابوں میں بکثرت انگریزی مآخذ کے حوالے ملتے ہیں۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں مولانا مرحوم مولانا احمد علی لاہوری سے استفادے کے لیے لاہور

www.abulhasanalinadwi.org

آئے، جن کا درسِ قرآن مشہور تھا اور دیوبند وغیرہ کے فارغ التحصیل طلبہ قرآن کے ایک مخصوص کورس کے لیے ان کے مدرسہ قاسم العلوم آتے تھے۔ مولانا علی میاں پہلی بار آئے تو درس کا زمانہ ختم ہو چکا تھا، پھر بھی مولانا احمد علی نے انہیں خاص طور پر سورہ بقرہ کے کچھ حصے کی تفسیر پڑھائی، دوسری بار ۱۹۳۱ء میں ان سے ''حجۃ اللہ البالغہ'' پڑھنے کے لیے آئے، اور اس کا تحریری امتحان پاس کیا۔ مولانا احمد علی، مولانا عبیداللہ سندھی کے خاص شاگرد اور ان کے علم کے حامل تھے، اور مولانا عبیداللہ سندھی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی فہم وتدریس اور اسرار ورموز کے ہندوستان میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔

۱۹۳۲ء میں مولانا مرحوم مولانا حسین مدنی سے حدیث پڑھنے کے لیے دیوبند گئے، وہاں اُن کا چار ماہ قیام رہا، مولانا مرحوم نے ان سے صحیح بخاری اور ترمذی پڑھی۔ دسمبر ۱۹۳۲ء/ رمضان ۱۳۵۱ھ میں مولانا مرحوم مولانا احمد علی کے درس میں شرکت کے لیے وقت پر آئے، تین ماہ کے کورس کے بعد اوائل مارچ میں امتحان ہوا، دہلی سے خواجہ عبدالحیٔ فاروقی تحریری امتحان کی کاپیاں جانچنے کے لیے آئے تھے۔ مولانا نے ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے کہ ان کو ۷۵ فیصد نمبر ملے تو اس پر بڑی عمر کے دوسرے طلبہ نے احتجاج کیا، جس پر مولانا احمد علی نے کاپیاں خود جانچیں اور مولانا کے نمبر بڑھا کر ۹۸ فیصد کر دیے۔

تدریسی ودعوتی زندگی

۱۹۳۴ء میں ۲۰ سال کی عمر میں مولانا ندوہ میں عربی ادب اور تفسیر و حدیث کے استاد ہو گئے۔ منطق و تاریخ اسلامی کے دروس بھی ان کے پاس تھے۔ اسی زمانے میں ان کے بعض رفقائے درس بھی رفقائے تدریس تھے، جن میں قابل ذکر مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، شیخ محمد العربی اور بعد میں مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور مولانا ابواللیث ندوی (جو بعد میں امیر جماعت اسلامی ہند ہوئے) وغیرہ تھے۔

۱۹۳۷ء میں مولانا مرحوم ایک مرتبہ پھر لاہور آئے، تو علامہ اقبال سے کئی گھنٹے ان کی

www.abulhasanalinadwi.org

ملاقات رہی، علامہ بیمار تھے اور ان کا ملازمِ خاص علی بخش آ کر انہیں زیادہ گفتگو سے ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق منع کرتا تھا، مگر علامہ اقبال اسے اشارے سے واپس کر دیتے تھے۔ درحقیقت اصل اقبال کو مولانا مرحوم نے جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے، ۱۹۳۵ء میں ''ضربِ کلیم''، ''بال جبریل''، ''اسرارِ خودی''، ''جاوید نامہ'' وغیرہ، ''بانگ درا'' کے بعد کے دواوین پڑھنے کے بعد جانا ، اور اقبال سے مولانا کی شیفتگی اور فکری وقلبی تعلق بہت بڑھ گیا۔ مولانا مرحوم کو علامہ اقبال کے سیکڑوں اشعار یاد تھے اور وہ ہم طلبہ کے سامنے انہیں مناسب مواقع پر بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے تھے، خاص طور پر وہ اشعار جن میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر یا ان کی طرف اشارہ ہے یا جن میں علامہ اقبال فرنگی فکر وتہذیب پر عالمانہ تنقید کرتے ہیں۔

۱۹۴۰ء کے لگ بھگ سید مودودی سے مولانا مرحوم کا تعلق ہوا، انہی نے سید مودودی کو ندوہ آنے کی دعوت دی، جہاں سید مودودی نے اسلامی نظامِ تعلیم پر ایک اہم اور طویل لکچر دیا، تین روز مہمان خانہ ندوہ میں سید مودودی مقیم رہے اور ندوہ کے طلبہ واساتذہ سے ان کا تعارف ہوا۔ اس درمیان میں مولانا کا باقاعدہ جماعت اسلامی سے تعلق ہوا اور وہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک لکھنؤ کی مقامی جماعت اسلامی کے امیر رہے۔

اس دوران میں مولانا مرحوم کا تعارف مولانا محمد الیاس کی دینی دعوت سے ہوا اور ان سے ذاتی ملاقاتیں بھی، مولانا ان کی ذاتی سیرت، انابت الی اللہ، اسلام کی اشاعت کے لیے ان کے دل میں صحابہؓ جیسی تڑپ اور ان کے زہد وورع سے بہت متاثر ہوئے۔ مولانا مرحوم کا رجحان ان کی طرف ہوا، اور وہ خود سید مودودی کے مشورے سے یکسو ہو کر مولانا محمد الیاس کی دعوت یا جماعت تبلیغ سے وابستہ ہو گئے، اور اسے انہوں نے ندوہ میں بھی عام کیا۔ ''مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت'' نامی کتاب بھی تقسیم سے قبل مولانا نے تصنیف کی، مگر مولانا مرحوم نے جب اس کام یا دعوت کو پھیلایا تو اس کی چھ باتوں پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ قرآن وحدیث اور دینی کتابوں اور علماء سے علم وبصیرتِ دینی حاصل کرنے پر زور دیتے رہے، بعض دوسرے علماء یا ارکان جماعت اسلامی کے

www.abulhasanalinadwi.org

برعکس جو جماعت کو چھوڑ چکے تھے، مولانا مرحوم نے کبھی جماعت یا سید مودودی کے خلاف کوئی دشنام طرازی نہیں کی، اور اختلاف نظر کے باوجود سید مودودی کی وفات پر انہوں نے بہت اچھا اور طویل تعزیتی مضمون لکھا جوان کی کتاب ''پرانے چراغ'' کی جلد دوم میں شامل ہے۔

مولانا مرحوم کو سید مودودی کی زندگی میں جب لاہور آنے کا موقع ملا تو سید مودودی سے ملتے رہے، اور آخر زمانے تک انہوں نے دو بار برطانیہ کے سفر میں لیسٹر کی اسلامک فاؤنڈیشن میں تقریریں کیں اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں پروفیسر خورشید احمد صاحب، خرم مراد صاحب مرحوم اور دیگر ارکانِ جماعت سے ملتے رہے۔ وہ تنگ نظری اور مذہبی تعصب سے کوسوں دور تھے، اگر چہ علمی طور پر انہوں نے سید مودودی کی بعض تحریروں سے اختلاف تحریری شکل میں کیا، لیکن یہ علماء کا شیوہ ہمیشہ سے رہا ہے۔

مولانا علی میاں اور عالم عربی

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند سے قبل مولانا نے پہلا حج والدہ کے ساتھ کیا اور چھ ماہ حرمین شریفین میں مقیم رہے، وہاں کے علماء سے ربط وضبط پیدا کیا اور اپنی زیر تصنیف کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے لیے وہاں مزید معلومات عربی کتابوں اور مجلات سے جمع کیں اور اپنی اس کتاب کی اشاعت کی کوشش کی، لیکن یہ کتاب بعد میں یعنی ۱۹۵۰ء میں مصر کے ایک انتہائی مؤقر ادارۂ نشر واشاعت سے شائع ہوئی۔

۱۹۵۰ء میں مولانا مرحوم نے اپنے مرشد شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ساتھ دوسرا حج کیا، اس حج میں راقم الحروف، مولانا مرحوم کے بھانجے مولوی محمد رابع صاحب (اب ناظم ندوۃ العلماء)، مولوی عبداللہ عباس ندوی (اب مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی) اور سہارنپور کے ایک غیر ندوی طالب علم بھی مولانا مرحوم کے ساتھ تھے۔ ہم چاروں کا ارادہ وہاں عربی زبان وادب میں مہارت کے لیے ایک سال ٹھہرنے کا تھا، باقی تینوں حضرات تو دوسرے حج کے بعد واپس آ گئے،

www.abulhasanalinadwi.org

خاکسار راقم الحروف وہاں تقریباً تین سال تعلیم کے لیے مقیم رہا۔ مولانا مرحوم کا یہ سفر حجاز بہت اہم تھا، کیونکہ یہاں چار ماہ کے قیام میں مولانا مرحوم کا تعلق یہاں کی اعلیٰ علمی وادبی شخصیتوں سے ہوا، خاص طور پر وہ ادباء جو مصر سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اور معاشرے میں اعلی مقام رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے دل کھول کر مولانا کا استقبال کیا، وہ مولانا کی شخصیت، علم اور ادبی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اسی زمانے میں مولانا نے سعودی ریڈیو سے متعدد تقاریر کیں جو کتابچوں کی شکل میں طبع ہوئیں۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں مولانا نے حجاز سے اپنے دو قدیم ندوی شاگردوں کی معیت میں (جو سال بھر سے حجاز میں مقیم تھے) مصر کا بحری جہاز سے سفر کیا۔ ہم لوگوں نے مولانا کو جدہ سے رخصت کیا تھا، مصر میں پانچ ماہ مولانا کا قیام رہا، اس درمیان میں دس دن کے لیے سوڈان گئے۔ ۲۴ جون ۱۹۵۱ء کو مولانا بذریعہ طیارہ دمشق پہنچے، اور ۱۲ اگست تک مولانا کا قیام دمشق میں رہا، اس درمیان میں دو بار اردن بھی گئے اور فلسطین کے شہروں القدس، الخلیل وغیرہ بھی جانا ہوا۔ ملک عبداللہ شاہ اردن سے بھی ان کی دو ملاقاتیں ہوئیں، ان کے ساتھ کھانا کھایا، اور ۱۲ اگست ۱۹۵۱ء کو مولانا مرحوم کی واپسی بذریعہ ہوائی جہاز مدینہ منورہ ہوئی، ایرپورٹ پر ہم تین رفقاء، دو ندوی اور ایک سہارنپوری، موجود تھے۔

مولانا مرحوم کا مصر، سوڈان، شام، اردن اور لبنان کا یہ سفر انتہائی اہم تھا۔ ان کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' مصر میں ۱۹۵۰ء میں چھپ چکی تھی اور اس کے ذریعے اہل علم و تحقیق کے حلقوں اور دینی تنظیموں میں ان کا اجمالی تعارف ہو چکا تھا۔ مصر میں، اور پھر شام میں سارا عالم عرب اپنی تمام علمی بلندیوں اور مادی رعنائیوں کے ساتھ ان کے سامنے تھا۔ مولانا کی ملاقات تمام بڑی علمی و ادبی اور دینی شخصیات سے ہوئی، یونیورسٹیوں میں اور ریڈیو پر، نیز بہت سی دینی واجتماعی تنظیمات وتحریکات، اخوان المسلمین اور شبان المسلمین، قاہرہ یونیورسٹی میں ان کی تقریریں ہوئیں، اخوان تو ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ وہ مولانا کا اپنے ہی ایک مرشد کی طرح احترام کرنے لگے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس سفر سے مولانا عالم عرب میں پوری طرح متعارف اور محترم المقام ہوگئے تھے۔ شام سے مولانا نے ایک مختصر سفر ترکی کا بھی بذریعہ ریل کیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اس سفر کے دوسرے حج (اور بحیثیت مجموعی مولانا کے تیسرے حج) کے بعد ان کی واپسی ہندوستان ہوئی۔ مولانا کے اس طویل سفر کی ڈائری ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' کے نام سے مصر میں چھپی اور اردو میں اس کا ترجمہ ''شرق اوسط کی ڈائری'' کے نام سے چند بار چھپا ہے۔

حجاز مقدس و مصر و شام وغیرہ کے سفر سے واپسی پر ۱۹۵۱ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کی تجویز پر مولانا ندوۃ العلماء کے نائب معتمد تعلیم مقرر کیے گئے، اور ۱۹۵۳ء میں علامہ کی پاکستان میں وفات پر ندوہ کے معتمد (سیکرٹری) تعلیم قرار پائے، اور ۱۹۶۱ء میں برادر بزرگ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی وفات پر ندوہ کے ناظم بنائے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ میں ''تحریک پیام انسانیت'' کی بنیاد ڈالی، جس کے ذریعے مولانا نے دسیوں ہندو۔ مسلم مخلوط اجتماعات میں خطاب کر کے اور رسائل لکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کی بدگمانیاں دور کرنے اور عداوت کم کرنے کی کوششیں کیں۔

علمی و دعوتی زندگی

مولانا کی علمی اور دعوتی زندگی پورے انہماک کے ساتھ پہلو بہ پہلو چلتی رہی اور دعوتی اسفار کی کثرت کے باوجود تصنیفی سرگرمی سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ درحقیقت یہ ایک خاندانی میراث تھی، فرماتے تھے لکھنا تو ہماری طبیعتِ ثانیہ بن گیا ہے، ۱۴ سال تک جب انتہائی ضعف بصارت اور ایک آنکھ کے زیاں کے باعث مولانا لکھنے پڑھنے سے معذور تھے، تو اس اثناء میں بھی ان کا یہ تصنیفی شغل جاری رہا، مآخذ سے حوالوں کے لیے رجوع بعض معاونین کرتے اور اپنے ایک کاتب کو مولانا کتابیں املاء کراتے تھے۔ اسی دوران میں مولانا نے ''السیرۃ النبویہ'' جیسی کتاب

www.abulhasanalinadwi.org

لکھی اور بعض دیگر کتب بھی۔

مولانا نے اپنے پہلے اور دوسرے سفر حجاز ومصر وغیرہ سے قبل کچھ دعوتی رسائل عربی میں لکھے تھے، جیسے ''الی ممثلی البلاد الاسلامیۃ'' جو تقسیم سے قبل دہلی میں ہونے والی ایک ایشیائی کانفرنس کے عرب مندوبین سے ایک دعوتی خطاب تھا۔ عرب اس زمانے میں جواہر لال نہرو سے مسحور اور اس کے گرویدہ تھے، اس رسالے میں ان کو ان کا چودہ سو سال قبل والا پیغامِ توحید وہدایت یاد دلایا گیا جس کی ضرورت آج بھی دنیا کو ہے، اور وہ دنیا کو یہ پیغام دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ''بین الصورۃ والحقیقۃ''، جس میں صوری یا ظاہری اور حقیقی اسلام کے فرق اور موخر الذکر کی قیمت واہمیت کو انتہائی مؤثر اور دلآویز انداز میں بیان کیا تھا۔ اس طرح دوسرے رسائل ''بین الجبایۃ والہدایۃ'' اور ''من غار حرا''، ''اسمعی یا مصر'' اور ''اسمعی یا سوریا'' وغیرہ ہیں۔ ان رسائل نے مولانا کو عام پڑھے لکھے طبقے میں بہت مانوس ومحبوب بنا دیا۔ مولانا محمد الیاس کی تبلیغی تحریک میں اس طرح کی تحریروں کا نہ کوئی معمول تھا، نہ ان کی کوئی قیمت۔ مولانا مرحوم نے تبلیغی تحریک یا دعوت کی روح یعنی دردمندی ودل سوزی اور حرکت وعمل کو تو لیا تھا، لیکن اس کو ایک نئی جہت دی تھی، اور وہ تھی علمی تشریح وتوضیح اور تاریخ اسلام اور حیات صحابہؓ سے اس کا ربط، اس نے عربوں کو بہت متاثر کیا، اور اس پر مستزاد مولانا مرحوم کی انتہائی دلآویز اور ساحرانہ عربی تحریر جس نے عربوں کا دل موہ لیا۔

اس کے ساتھ مولانا مرحوم خالص علمی وتحقیقی انداز میں مسلسل تصنیفی کام کرتے رہے، لیکن ان تحریروں کے اندر بھی داعیانہ روح کارفرما تھی۔ ۲۵ سال کی عمر میں ''سیرت سید احمد شہید'' کی جلد اول لکھنے کے بعد ۲۸ سال کی عمر میں مولانا نے ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ کی دعوت پر وہاں ایک مبسوط علمی مقالہ پڑھا جو بعد میں ''دین ومذہب'' کے نام سے شائع ہوا، اس کے سامعین میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب جیسی وقیع علمی شخصیات شامل تھیں۔

۱۹۵۶ء میں مولانا نے کلیۃ الشریعۃ (شریعۃ فیکلٹی) - دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے دو ماہ وہاں اسلام کی اہم دینی وفکری شخصیات پر لکچر دیے جو ''رجال الفکر

www.abulhasanalinadwi.org

والدعوۃ فی الاسلام'' کے نام سے ۱۹۶۰ء میں دمشق یونیورسٹی سے کتابی شکل میں چھپے، اس سے قبل مولانا ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کی پہلی جلد لکھ چکے تھے جو دارالمصنفین سے چھپی تھی اور وہی دمشق یونیورسٹی کے لکچروں کی بنیاد تھی، بعد میں یہ سلسلہ جاری رہا اور پانچ جلدوں میں مولانا نے یہ کتاب مکمل کی، ''سیرت سید احمد شہید'' کی دو جلدوں کو شامل کرنے سے یہ سلسلہ دعوت وعزیمت اپنی انتہا کو پہنچا۔ اس کتاب کی دوسری، چوتھی اور پانچویں جلد علی الترتیب تین عظیم ترین اسلامی شخصیات ابن تیمیہ، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ پر ہیں۔ مولانا مرحوم کا یہ بڑا عظیم، منفرد اور مفید علمی کارنامہ ہے۔ یہ صرف علم رجال کی کتابیں یا سوانح حیات نہیں ہیں، بلکہ دعوت اسلامی کو دوسری صدی ہجری سے تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے اور سید احمد شہید کی تحریک اصلاح و جہاد اس سلسلہ ذہب کی آخری کڑی ہے۔

یہ پانچ جلدیں عربی زبان میں بھی منتقل ہو کر دمشق و بیروت سے چار جلدوں میں چھپ چکی ہیں اور اب حوالے کی کتابیں ہیں۔

اسی زمانے یعنی ۱۹۶۰ء میں مولانا مرحوم کی ایک اور اہم کتاب ''روائع اقبال'' دمشق سے شائع ہوئی جس کی پروف ریڈنگ اور تصحیح کی سعادت اس ناچیز کو حاصل ہوئی اور اسی کی کوشش سے یہ دمشق کے اشاعتی ادارے، دارالفکر سے چھپی، بعد میں اس کے متعدد دیگر ایڈیشن چھپے اور اردو میں یہ ''نقوش اقبال'' کے نام سے ترجمہ ہوئی اور بڑی مقبول ہوئی۔

عربی زبان میں اگرچہ مولانا مرحوم سے قبل ڈاکٹر عبدالوہاب عزام علامہ اقبال پر ایک کتاب لکھ چکے تھے اور ان کے دیوان ''ضرب کلیم'' کا منظوم ترجمہ بھی کر چکے تھے، اسی طرح سے مصر کے نابینا شاعر صاوی شعلان نے حسن الاعظمی کی مدد سے ان کی متعدد نظموں اور غزلوں کا ترجمہ کیا تھا، لیکن اس سب کام سے اقبال کا صحیح اور جاندار تعارف عالم عرب میں نہیں ہوا تھا، پہلی بار ۱۹۵۱ء میں مولانا نے اپنے مصر کے سفر میں وہاں کلیہ دارالعلوم اور ایک دوسرے ادارے میں اقبال پر دو مبسوط لکچر دیے، جن میں ان کی فکر و دانش کا جوہر پیش کیا اور یہ پہلے ایک مختصر کتاب

www.abulhasanalinadwi.org

''شاعر الاسلام اقبال'' کے نام سے مصر میں چھپے، بعد میں مولانا مرحوم نے ''مسجد قرطبہ'' اور ''ذوق وشوق''، جیسی اقبال کی طویل نظموں اور دیگر نظموں کے انتہائی پرزور، ادبی رعنائیت سے بھرپور اور مسحور کن تحریر میں ترجمے اس کتاب میں اضافہ کیے اور اس طرح ''روائع اقبال'' وجود میں آئی۔ اس کتاب سے روح اقبال عربوں میں منتقل ہوئی۔

اس کے بعد تو تصنیفات کا ایک سیل رواں مولانا مرحوم کے قلم سے عربی میں چل نکلا، اور ان کا ترجمہ بھی اردو اور بعد میں دیگر زبانوں میں ہوتا جاتا تھا۔ ان میں ''الارکان الاربعۃ'' کافی مبسوط اور منفرد انداز کی کتاب ہے، ''النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن''، ''القادیانی والقادیانیۃ''، ''السیرۃ النبویہ'' اور ''المرتضیٰ'' وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا مرحوم نے عصر حاضر کے بزرگ مشایخ کی جو سوانح عمریاں لکھی ہیں، وہ بھی اپنی جگہ ایک علیحدہ تاریخی اور صوفیانہ کام ہے۔ یہ کتابیں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی، مولانا محمد الیاس، شاہ عبدالقادر رائے پوری اور مولانا محمد یعقوب صاحب بھوپالی وغیرہ پر ہیں۔

ان کے علاوہ مولانا مرحوم کے متعدد سفرنامے ہیں، جو مشرق ومغرب میں مولانا کے سفر کی نہ صرف داستانیں اور روداد یں ہیں، بلکہ ان میں مولانا کا تنقیدی تجزیہ اور دعوتی پیغام بھی ہے۔ ان سفرناموں کا ایک اہم مقصد وہاں موجود مسلمان نوجوان نسل کے عقائد اور تہذیبی قدروں کی حفاظت کرنا، اور ان میں مغربی اقدار وافکار کا ایمانی اور استدلالی طریقے پر مقابلہ کرنے کی استعداد پیدا کرنا تھا، اور ساتھ ہی مغرب کے اہل فکر کو اسلام کا آفاقی پیغام پہنچانا تھا۔

یہاں مولانا مرحوم کے تصنیفی کاموں کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے، بلکہ اس نقطے کی وضاحت کرنا ہے کہ مولانا کی تمام تصنیفات میں جو روح گردش کرتی ہے، وہ داعیانہ روح ہے، حتیٰ کہ ضخیم خالص علمی وتاریخی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' بھی اسی روح کی آئینہ دار ہے۔

۱۹۶۱ء میں ان کے عزیز ومشفق بھائی جوان کے فکری مشیر اور ان کی تصنیفات کے قدردان بھی تھے، فوت ہوئے تو مولانا مرحوم کے کندھوں پر ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے بڑی

www.abulhasanalinadwi.org

زبردست ذمہ داری پڑ گئی۔ ناظم کا کام دارالعلوم کو چلانا، اس کا مہتمم یا پرنسپل مقرر کرنا، اس کی تعلیمی سرگرمیوں پر نظر رکھنا، اس کی ترقی کی کوشش کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے لیے ضروری فنڈ پبلک کے تعاون سے مہیا کرنا تھا۔ مولانا مرحوم نے یہ کام بخوبی انجام دیا، ان کے عہد میں دارالعلوم نے جو ترقی کی، وہ اس سے قبل کسی ناظم کے عہد میں نہیں ہوئی تھی۔ جہاں پہلے صرف ایک منزلہ ہوسٹل (شبلی دارالاقامہ) تھا، اب وہاں تین چار منزلہ پانچ ہوسٹل تعمیر ہوئے، یہ طلبہ کی کثرت کی وجہ سے کرنا پڑا، نصاب میں جزری (radical) اصلاحات کی گئیں، نئے شعبے یا کلیات ــــ قرآنی علوم، عربی زبان و ادب، دعوت اسلام و اعلام (میڈیا) ــــ کھولے، اور تحقیقی کام پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا انتظام کیا گیا، گویا دارالعلوم صحیح معنوں میں ایک اسلامی یونیورسٹی مولانا مرحوم کے عہد میں بن گیا۔ اس کے علاوہ طالبات کی اسلامی اور دینی عربی تعلیمات کے لیے علیحدہ سے انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا۔ مولانا ۱۹۵۹ء سے دارالعلوم ہی میں اس کے مہمان خانے میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ ان سب مصروفیات کے باوجود مولانا کے تصنیفی کاموں میں کوئی توقف یا کمی نہیں آئی۔ جب ہم ساٹھ کی دہائی سے مولانا مرحوم کے حجاز مقدس، خلیجی ممالک اور یورپ کے مسلسل سفروں کو دیکھتے ہیں تو حیرت اور بڑھ جاتی ہے کہ کس طرح مولانا بیسیوں کتابیں اور سیکڑوں تقاریر، خطبات اور رسائل لکھنے کا کام جاری رکھ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کے وقت میں اہل اللہ کی طرح بڑی برکت عطا فرمائی تھی۔

۱۹۶۲ء میں جب ''رابطہ عالم اسلامی'' کی مکہ مکرمہ میں تشکیل ہوئی تو مولانا مرحوم اس کے رکن اساسی قرار پائے، اسی طرح اسی سال مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا اس کی کونسل کے رکن اساسی کی حیثیت سے لیے گئے، بعد میں ''رابطہ عالم اسلامی'' کی متعدد ذیلی تنظیمیں جیسے ''المجمع الفقہی'' (فقہ اکادمی) اور ''المجلس الاعلی للمساجد'' قائم ہوئیں تو مولانا ان کے رکن منتخب کیے گئے، اب ان اداروں اور تنظیموں کے اجلاسوں کی وجہ سے سال میں تین چار

www.abulhasanalinadwi.org

مرتبہ حجازِ مقدس جانے لگے، اور آخری دس برسوں میں نقرس کے مرض کے سبب وہیل چیئر (wheel chair) پر منتقل کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہا۔

اسی حالت میں مولانا مرحوم نے ۱۹۹۳ء میں ایک بار استنبول، لندن اور امریکہ کا سفر بھی وہاں کی بعض اسلامی تنظیمات اور اوکسفرڈ کے اسلامک سینٹر کے اجلاس میں شرکت کے لیے کیا، اور اسی حالت میں استنبول کا چوتھا یا پانچواں سفر وہاں ۱۹۹۶ء میں سیمینار میں شرکت کے لیے کیا، اور ۱۹۹۷ء میں لاہور میں اپنے قائم کردہ ''رابطہ ادب اسلامی'' کے اجلاس میں تشریف لائے، اور یہاں متعدد تقاریر، علاوہ ''رابطہ ادب اسلامی'' کے اجلاس کے، پنجاب یونیورسٹی وغیرہ میں کیں۔ اس کے بعد بھی مولانا مرحوم نے ہندوستان میں کچھ ضروری سفر کیے، تصنیف کا اشتغال بھی رہا، بلکہ ۱۹۹۹ء کے وسط میں فالج کا حملہ ہونے کے بعد، اور پھر اس سے تین چار ماہ بعد باوجود شدید کمزوری کے '' کاروان زندگی'' کی آخری ساتویں جلد املاء کرائی، اور الحمدللہ کہ وہ وفات سے ڈیڑھ دو ماہ قبل چھپ کر آ گئی، مولانا مرحوم نے اپنے آخری خط میں مجھے اس کی خوش خبری سنائی تھی۔

مولانا مرحوم ایک انتہائی کثیر الاسفار شخص تھے، جس کا کچھ ذکر اوپر ہوا، لیکن اس کے لیے درحقیقت ایک علیحدہ مضمون درکار ہے۔ مولانا مرحوم کے یہ مستقل سفر ۱۹۳۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۹۹ء کے وسط میں عارضۂ فالج سے قبل تک جاری رہے۔

ندوۃ العلماء اور دارالعلوم کی تنظیمی سرگرمیوں کے علاوہ مولانا مرحوم مختلف عالمی اور ہندوستان کی اسلامی تنظیموں سے بطور بانی و صدر وابستہ رہے تھے اور ان کی سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک تھے۔ اس ذیل میں مولانا مرحوم کے بیسیوں صدارتی خطبات اور تقاریر ہیں، جن میں سے بہت سی عربی اور اردو میں مطبوعہ اور بہت سی منتظر طبع ہیں۔

عالم عرب کے لیے مولانا کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ساٹھ کی دہائی سے جمال عبدالناصر کے زمانے میں عرب قومیت کے خلاف بڑے پرزور طریقے سے عرب مجلات میں لکھا اور اپنی عربی اور اردو تقاریر میں برملا اس کی مخالفت کی، اور ناصر کے عرب اور ہندوستانی مریدین کی

www.abulhasanalinadwi.org

مخالفت اور تنقید کو برداشت کیا، دوسری خدمت اسلام پسند سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کے مسلمانوں کی یہ کی کہ انہوں نے یہاں کے حکمرانوں کی حد سے بڑی ہوئی عیش وعشرت کی زندگی پر تنقید کی، اور اسی طرح یورپ وامریکہ پر سیاسی واقتصادی امور میں ان کے مکمل اعتماد پر گرفت کی، مولانا مرحوم جس طرح الحاد اور روسی سوشلزم کے مخالف رہے، اسی طرح مغربی سرمایہ داری اور اس کی غیر اخلاقی اور متعیشانہ قدروں کے بھی مخالف رہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے مولانا نے صرف نظر نہیں کیا، اگرچہ وہ سیاسی آدمی نہ تھے، لیکن انہوں نے جمیعت علماء ہند کے نڈر لیڈر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی وفات اور جمیعت کی سرد مہری کے بعد پوری قوت سے مسلمانانِ ہند کے سیاسی، اجتماعی اور دینی مسائل میں ان کے حقوق کے دفاع کے لیے پوری سرگرمی سے کام کیا، اس کے لیے مولانا نے اپنے مخلص دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف تنظیمیں ـــــ ''مسلم مجلس مشاورت''، ''دینی تعلیمی کونسل''، ''پیام انسانیت'' اور ''مسلم پرسنل لا بورڈ'' ـــــ بنائیں اور ان میں سے اکثر کے وہ صدر رہے، ان تنظیموں اور خاص طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ کے سلسلے میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کی حفاظت کے لیے، اور ساتھ ہی مختلف فسادات میں مسلمانوں کے جانی ومالی نقصانات کے بعد ان کے تحفظ کے لیے اندرا گاندھی، راجیو گاندھی اور وی۔ پی۔ سنگھ وغیرہ سے ملاقاتیں کرکے اور انہیں خطوط لکھ کر ان کی توجہ اس طرف دلاتے رہے۔ پیام انسانیت کے متعدد آل انڈیا اور لوکل مخلوط (مسلم وہندو) اجتماعات میں خطاب کرکے وہ ہندوؤں کو بھی اسلام کا پیغام پہنچاتے رہے کہ اس میں ان کی اور ہندوستان کی خیریت ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کے شکوک وشبہات دور کرتے رہے۔ مولانا کی زندگی کا یہ عملی اور افادی پہلو بیرون ہند کے لوگوں سے بہت حد تک مخفی ہے یا غیر معلوم ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس مختصر تحریر کے بعد مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلو سامنے آگئے ہوں گے، وہ صرف ایک مصنف، ایک داعی اسلام اور ایک بزرگ دینی شخصیت ہی نہیں، بلکہ نہایت سرگرم اور درد مند قائد ملت بھی تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

٣

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

تحریر: شکری فیصل

عربی سے ترجمہ: سید محمد الحسنی

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر

[''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' اولاً عربی میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے نام سے لجنۃ التالیف - قاہرہ نے ۱۹۵۰ء میں شائع کی تھی۔ عالم عرب میں اس کا والہانہ استقبال ہوا، اور مصنف کی عبقریت کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔ استاذ شکری فیصل نے ماہنامہ ''الثقافہ'' میں اس پر تبصرہ لکھا تھا۔ اس تبصرے کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔
(مرتب)]

کیا مسلمان اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں اور انسانی قافلہ کی پہلی صف میں اپنی پرانی جگہ پر واپس آ سکتے ہیں، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ وہ ضعف کی ظلمتوں میں گھرے ہوئے ہیں؟ کیا وہ نظام زندگی جو یورپ میں رائج ہے اور جس کی تقلید ایشیا والے بھی کرنا چاہتے ہیں، زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اس کے اندر اخلاقی بلندی، مادی ترقی اور روحانی و مادی اقدار کی باہم آمیزش کا پورا سامان موجود ہے، کیا یورپ انسانی زندگی کو ان بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتا ہے جو عقل وفکر کے آغاز ہی کے ساتھ انسان کے مدنظر تھے، یا وہ اس شاہراہ سے ہٹ گیا ہے اور اپنی منزل مقصود سے دور ہو گیا ہے؟ ہم کس صورت سے معاصر تہذیب کی کمزوریوں سے باخبر ہو سکتے ہیں، وہ کون سے عناصر ہیں جن سے یورپ محروم ہے، وہ کون سا مہیب خطرہ ہے جو اس کے اندر پوشیدہ ہے اور قریب ہے کہ اس کو تباہ کر دے۔ کون کون سی قومیں اور مذاہب اس زبردست بوجھ کو اٹھا سکتے ہیں۔ غلطی کی اصلاح، خالی جگہ کی خانہ پری اور صحیح رہنمائی کا بوجھ؟

www.abulhasanalinadwi.org

وہ کون سا رشتہ ہے جو عالم اسلام کو عالم عربی سے منسلک کرتا ہے، مسلمان عربوں کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اہل عرب کا مقام خود ان کی نظروں میں کیا ہے۔ اہل یورپ کا نقطہ نظر مسلمانوں اور عربوں کے بارہ میں کیا ہے، مسلمانوں کے آپس کے تعلقات اور مسلمانوں اور اہل عرب کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے، عربوں اور مسلمانوں کی آرزوؤں میں یک جہتی کیوں کر ہے۔ ان کے امراض ونقائص یکساں کس طور پر ہیں، یہ امراض کیا ہیں، ان کا علاج کیا ہے؟

مسلمانوں کے سفر کا آغاز کہاں سے ہو، وہ کس طرح اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے باخبر بنیں، اور سمجھ سکیں کہ زمانہ کی دوڑ میں وہ کس منزل پر ہیں، اسلام کے منتہائے نظر اور کفر کے منتہائے نظر میں کیا فرق ہے، اور دنیا کو کیا نقصان پہنچا جب مسلمان اپنے مقاصد کو فراموش کر کے بیٹھ رہے؟

یہ سب سوالات اور ایک دوسرے سے پیوستہ عنوانات اس کتاب کا موضوع ہیں، بلکہ وہ کتاب میں اسی صورت سے نظر آتے ہیں۔ کتاب آپ کو ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف لے جاتی ہے، ایک کڑی دوسری کڑی سے ملاتی ہے، اور ایک مقصد سے دوسرے مقصد تک پہنچاتی ہے، لیکن ایک بڑا نصب العین پوری کتاب پر برابر چھایا رہتا ہے، یہ وہ نصب العین ہے جس کا خلاصہ ڈاکٹر احمد امین انے کتاب پر اپنے مقدمہ میں لکھا ہے۔

> یہ کتاب مسلمانوں سے احساس کمتری کو دور کرنا چاہتی ہے، جو انحطاط سے اور اپنی کمزوری کے احساس سے اور مغربی تہذیب کو وہ درجہ دینے کی وجہ سے جس کی وہ مستحق نہیں ہے، پیدا ہو گیا ہے۔

مصنف نے کتاب کو پانچ ابواب ۲ پر تقسیم کیا ہے۔ باب اول عہد جاہلیت، باب دوم جاہلیت سے اسلام کی طرف، باب سوم اسلامی عہد، باب چہارم مغربی عہد، باب پنجم اسلامی قیادت، پھر ہر باب بہت سے ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے کوشش کی ہے کہ وہ سب باہم مربوط رہیں اور اس مقصد تک رہنمائی کریں جو کتاب کا اصل موضوع ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

سب سے پہلے مصنف نے زمانہ جاہلیت کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔اس میں انہوں نے دکھایا کہ انسانیت پرنزع کا عالم طاری تھا، فساد خشکی وتری میں پھیل چکا تھا اور دنیا کو اسلام اوراس کی تعلیمات کی سخت ضرورت تھی۔ باب دوم (جاہلیت سے اسلام کی طرف) میں مصنف نے انبیاء کے مختلف اصلاحی طریقوں کو بیان کیا ہے، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق دعوت و اصلاح، ان کی تاثیر وتربیت اوراس عظیم معجزہ کا ذکر کیا ہے جس نے ایک نئی اور طاقتور نسل اور جدیداور بیدار سوسائٹی کو پیدا کیا۔

باب سوم میں کئی فصلیں ہیں۔ ایک فصل اسلامی قیادت کے بارہ میں ہے اوراس میں اسلامی اصولوں اوراقوام ومذاہب پراس کے اثر ونفوذ کا بیان ہے۔ دوسری فصل اسلامی زندگی کے انحطاط وتنزل کے بارہ میں ہے جس میں انحطاط وزوال کے اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے، تیسری فصل قیادتِ عثمانی کے بارے میں ہے۔

باب چہارم میں مغربی عہد کی داستان بیان کی گئی ہے جو یورپ کی بت پرستی اور مسیحیت اور ان دونوں کا نزاع، پھران دونوں کا امتزاج، وطن پرستی اور قومیت کا ظہور، مادیت کا غلبہ اور زندگی کے ہرشعبہ پراس کا اقتدار اور جاہلی رجحانات وخیالات کا نئے سرے سے تسلط جیسے مباحث پر مشتمل ہے۔

جب مصنف ہم کو باب پنجم تک لے جاتے ہیں، اس وقت ہمیں یہ ایمان حاصل ہو چکا ہوتا ہے کہ جو جاہلیت بعثت نبوی سے قبل دنیا پر حاوی تھی، وہی جاہلیت آج بھی دنیا پر حاوی ہے، گویا کہ دنیا نے اپنی وہی پرانی شکل اختیار کر لی ہے جو اس دن تھی، جس دن مسلمان جزیرہ نمائے عرب سے دنیا کو جاہلیت اور بت پرستی کے چنگل سے بچانے کے لیے نکلے تھے (ص ۲۳۳)، اوراس لیے ضروری ہے کہ عالم اسلام نئے سرے سے ترقی کرے اور عالم عربی نئے سرے سے بیدار ہو، اور ضروری ہے کہ یہ نشاۃ ثانیہ انھیں بنیادوں پر ہو جن بنیادوں پر نشاۃ اولیٰ ہوئی تھی۔ میری مراد ان دو اصولوں سے ہے جن پر (جیسا کہ مصنف کا خیال ہے) پوری اسلامی تحریک کا دارومدار ہے، یعنی

www.abulhasanalinadwi.org

جہاد واجتہاد (ص ۹۸)۔

یہ حقیقت ہے کہ کتاب اصلاح کی ایک باشعور آواز ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے اور ایمان سے لبریز ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اسلامی دنیا اس کی سخت حاجت مند ہے اور اس کی حالت سدھر نہیں سکتی جب تک کہ وہ علمی شعبہ میں اجتہاد اور عسکری شعبہ میں جہاد کی طرف خاص توجہ نہ دے، اسی لیے مصنف ان دونوں اصولوں پر بہت اصرار کرتے ہیں اور ان پر بہت زور دیتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی باب اور کوئی فصل اس سے خالی نہیں جاتی۔ وہ جنگی صنعت کا ذکر کرتے وقت اس کے انحطاط اور ترکوں کے تنزل کا اسے سبب بتاتے ہیں (ص ۱۱۷)، پھر وہ اسی بات کو مسلمانوں اور عالم عربی کے عروج کے باب میں دہراتے ہیں (ص ۲۳۸)، بلکہ وہ اس سے بھی آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ علمی و صنعتی شعبوں میں عالم اسلام کا جمود ہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے اس کو طویل غلامی، ذلیل زندگی، اور ظالم مغربی اقتدار کا مزہ چکھنا پڑا (ص ۲۳۹)۔

میں نے کہا تھا کہ مصنف نے کتاب میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف راستے اختیار کیے ہیں، کبھی وہ محقق کے روپ میں نظر آتے ہیں، کبھی مبلغ کے، کبھی مومن کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، کبھی تاریخ و قصص کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ کبھی عبرت و نصیحت کا انداز اختیار کرتے ہیں، کبھی منطق و استدلال سے کام لیتے ہیں، کہیں خطابت کا طرز جھلکنے لگتا ہے، مگر بہت کم!

کتاب میں دو چیزیں بظاہر کھٹکنے والی ہیں۔ پہلی چیز تطویل و اطناب، مثلاً یہ عنوانات، یورپ خودکشی کی طرف، ایٹم بم اور اس کی لرزہ خیزیاں، لیکن یہ تطویل بلا وجہ نہیں ہے۔ اس کا مقصد خیال کی توثیق اور دل و دماغ کو اس منظر سے بھر دینا ہے۔ دوسری چیز وہ خطابی رنگ ہے جو کہیں کہیں نظر آجاتا ہے، لیکن اس کا مقصد بھی پورے طریقے سے دل و دماغ کو متاثر کرنا ہے اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ ناظر دیکھتا ہے کہ مغربی تہذیب پر شدید تنقید کی گئی ہے اور اس کے زوال و خودکشی پر بار بار زور دیا گیا ہے، اور کتاب کے بہت سے صفحات اس سے پُر ہیں، جبکہ ظاہر ہے کہ صرف اتنی ہی بات (اگر مصنف جہاد واجتہاد پر زور نہ دیتے) مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کو دور کرنے کے لیے کافی

www.abulhasanalinadwi.org

نہ تھی، بلکہ وہ ان میں اپنے حریف کی طرف سے اطمینان اور بے خوفی کا سبب بن سکتی تھی۔

دوسری چیز جو مصنف کو ممتاز کرتی ہے اور ان کو اسلام کے عظیم مفکرین کی صف میں داخل کرتی ہے، وہ حیات انسانی کے ارتقاء پر ان کی جامع، وسیع اور گہری نظر ہے۔ پانچوں ابواب جن پر کتاب مشتمل ہے، ان کی وسعت نظری ظاہر کرتے ہیں جس میں عام انسانی تاریخ اور اسلامی تاریخ کا جائزہ لے کر اس کو ایک خاص نقطہ پر مرکوز کیا گیا ہے۔ کتاب کے ان صفحات کے اندر اسلامی تاریخ کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک کی تاریخ بھی (مذہبی و اجتماعی حیثیت سے) ملے گی۔ مذہبی تحریکات کے واضح اور روشن نقوش، اخلاقی تحریکات کے عام میلانات و رجحانات، ان کا عروج و زوال اور نشیب و فراز، یہ سب چیزیں ہیں جو آپ کو واضح نتیجہ تک پہنچاتی ہیں، لیکن بڑے انقلابات و تحریکات مصنف کو جزئی واقعات کے حوالہ و استشہاد سے غافل نہیں کرتے، وہ بسا اوقات روزمرہ کے واقعات سے استدلال و برہان کا کام لیتے ہیں، اس لیے کہ ان چیزوں کی بھی بحث و تحقیق کے میدان میں ایک جگہ ہے اور ان کے وسیلے سے اہم نتائج تک باریابی ہو سکتی ہے۔ ان مثالوں نے ایک طرف کتاب کو زندگی اور نشاط عطا کی ہے۔ دوسری طرف وہ کتاب کی پوزیشن بھی مضبوط کرتی ہیں اور غالباً ۱۴۰-۱۵۶ کے صفحات جہاں مصنف نے یورپ کی مادیت پر بحث کی ہے، ان کے طرز بیان اور اسلوب کی بہترین مثال ہے جو فکر عام کو سمیٹنے کے ساتھ جزئی مثالوں پر بھی مشتمل ہے۔

مصنف جہاں کہیں بھی کسی رائے اور نظریہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں تو فوراً اس کا حوالہ و ماخذ بیان کر دیتے ہیں، اور اس طور پر وہ امانت داری اور وفا شعاری کی ایک مثال قائم کرتے ہیں جس کی ہمیں آج کل سخت ضرورت ہے، اگرچہ یہ اقتباسات کبھی کبھی ہلکے قسم کے بھی ہو گئے ہیں۔ اہم اقتباسات اور ضروری حوالوں کے پہلو ہی میں آپ کو ''مصر الفتاۃ'' (ص ۶۲) کا حوالہ بھی ملے گا۔ دوسری جگہ ''مجلۃ الاثنین'' (ص ۲۱۱) کے کسی مقالہ سے اقتباس کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مقالہ نگاروں نے مضامین بر سبیل تفریح لکھے ہوں گے، اگرچہ اس تفریح کے پیچھے حقائق کا سایہ بھی

www.abulhasanalinadwi.org

ہے۔

اسلوب کتاب کے متعلق ایک بات اور عرض کرنا ہے۔ ڈاکٹر احمد امین نے کتاب پر ''مقدمہ'' لکھتے وقت یہ جملہ لکھا ہے: ''اور قاری سے میری معذرت؟ اگر اس میں چند غامض عبارتیں نظر آئیں، اس لیے کہ فاضل مصنف ہندی نژاد اور ہندی تہذیب کے فرزند ہیں جنہوں نے عربی علم وادب اپنی جدوجہد اور محنت سے حاصل کیا ہے، اگرچہ کتاب (اور اس میں کوئی شبہ نہیں) بلیغ اور خوبصورت تشبیہات سے خالی نہیں۔''

کیا کتاب میں غامض عبارتیں پائی جاتی ہیں؟ میں تو نہیں سمجھتا! حقیقت تو یہ ہے کہ کتاب کا ایک خاص وصف اس کا یہی واضح اسلوب ہے، اور شاید اسلوب کی یہی شگفتگی، عقیدہ ونظریہ کے نکھار اور اس پر ایمان ویقین کا عکس ہے۔ اس کے علاوہ یہ اسلوب بہت پختہ اور متین ہے۔ مصنف قرآن مجید سے استشہاد پر پوری طرح قادر ہیں۔ بہت سی جگہ حدیث اور اشعار سے بھی استشہاد ہے (ص۸۴)۔ قرآنی اور دوسری عربی ترکیبوں کا بہترین استعمال، عنوانات کا لاجواب انتخاب اور تنوع، اور ہر چیز کو اپنی جگہ رکھنا، گویا وہ اسی کے لیے تھی۔ یہ سب باتیں ایک متین، پختہ، واضح اور شگفتہ اسلوب کی نشانی ہیں۔

ایک چیز اور ہے جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ کتاب عالم اسلام کے مسائل پر ہندوستانی طرزفکر کا نمونہ ہے۔ خواہ مصنف نے اپنے افکار پیش کیے ہوں، یا اپنے معاصر مفکرین کے افکار کو نقل کیا ہو، اور ہم مسلمانوں کو اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہمارے افکار ونظریات ایک دوسرے سے قریب آئیں، اور ہم سمجھ سکیں کہ ہندو پاکستان، مشرقی جزائر، ایران وافغانستان کے مسلمان عالم اسلام کے مسائل میں کیا نقطۂ نظر رکھتے ہیں، اور ان کا طرزفکر کیا ہے، ورنہ اس کے بغیر اصلاح وترقی کی کوششیں ناقص اور ناتمام رہیں گی۔

ایمان، یقین اور زندگی سے لبریز صفحات مسلمانوں کی موجودہ حالت پر باشعور افسوس اور ان کے اندر خیر کے سرچشموں کو چھیڑنے کی مبارک کوشش، اسلامی قیادت کے صحیح خدوخال اور اس

www.abulhasanalinadwi.org

کے اوصاف وخصائص کی تصویر (ص ۸۲)، اسلام کے بلند نصب العین کی طرف توجہ، روحانی زندگی اور پاکیزہ مادی زندگی کے اجتماع کی گرم جوشی سے دعوت، فکر اسلامی کو مابعد الطبعی اور کلامی مباحث کی پیچیدگیوں سے ہٹا کر، حقیقت پسندانہ فکر، روشن اور زندہ ایمان اور توحید خالص کی طرف رہنمائی جو زندگی اور انسانی فکر کے تمام عقدے حل کرتی ہے، ایسی زندگی کے احیاء کی کوشش جو رنگ ونسل کے امتیازات سے پاک ہے، عالم عربی کو اس پیغام کی ذمہ داری سنبھالنے کی دعوت ۔ یہ ہے کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین''، اور اس بنیاد پر یہ کتاب اس قابل ہے کہ مشرق عربی کا کوئی گھر اس سے خالی نہ رہے، اور ہمارا کوئی نوجوان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہے۔ شاید وہ ہمارے نوجوانوں میں یقین واعتماد پیدا کر سکے اور اس گمشدہ راہ پر لا سکے جو بہت عرصہ ہوا، چھوٹ چکی ہے۔

اگر کتاب کا کام صرف یہی ہوتا کہ وہ ان موضوعات پر ابھار دیتی، تب بھی وہ قابل شکر اور لائق ستائش تھی، اور ڈاکٹر احمد امین کو جنہوں نے جیسا کہ مجھے معلوم ہے کتاب کے لیے اپنی صحت و قوت کی پروانہ کرتے ہوئے بے دریغ اپنا وقت خرچ کیا اور ''لجنۃ التالیف'' کو جس نے ہم کو عظیم اسلامی مفکر سید ابوالحسن علی ندوی سے تعارف حاصل کرنے کا موقع دیا، میرا بہت شکریہ!

حواشی

۱- کتاب کے اولیں ایڈیشن پر ڈاکٹر احمد امین کا مقدمہ تھا، جسے دوسرے ایڈیشن میں سید قطب کے مقدمے سے بدل دیا گیا۔

۲- اُردو ایڈیشن میں کتاب پانچ کے بجائے سات ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

خورشید احمد

تاریخ دعوت وعزیمت

امام ابن تیمیہ کا تجدیدی کارنامہ

اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اسلام ایک ایسی قوت کا نام ہے جو ہر دور اور ہر زمانے میں زندہ اور متحرک رہی اور جس نے زمانے کے ہر چیلنج کا بھرپور جواب فراہم کیا۔ اسلام نے صرف ۳۵ - ۴۰ سال تک ہی ایک مثالی تہذیب قائم نہیں کی، بلکہ تاریخ انسانی میں کچھ ایسی نئی قوتیں جاری وساری کر دیں جو ہر دور میں زندگی کو خیر اور فلاح سے مالا مال کرتی رہیں اور جو ہر بدی اور فساد سے ٹکر لیتی رہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر اسلام اپنی زندگی کے پہلے عظیم چیلنج سے دو چار ہوا۔ یہ چیلنج خلافت کے مسئلہ، ارتداد کی رو اور ادائیگی زکوٰۃ سے انکار کی شکل میں رونما ہوا، لیکن اسلام نے اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر اس چیلنج کا جواب دیا اور حضرت ابوبکرؓ کے مبارک ہاتھوں سے خلافت راشدہ کا وہ نظام قائم ہوا جو تاریخ انسانی کا زرین دور ہے۔ پھر حضرت امیر معاویہؓ (اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمائے) کے دور میں خلافت اسلامیہ میں جس خرابی اور بگاڑ نے راہ پائی، اس نے اسلام کے سیاسی نظام کے لیے وقت کے اہم ترین چیلنج کی شکل اختیار کر لی، لیکن فقہاء اور سیاسی مفکرین ہی نہیں، بلکہ امت کے سواد اعظم نے اسے ایک بدعت مذمومہ ہی قرار دیا اور اس پر اپنے رنج والم کا اظہار کیا، نیز امام حسینؓ، ولید بن یزید، حضرت عمر بن عبدالعزیز، زید بن علی، نفس زکیہ وغیرہم نے اپنی مساعی جلیلہ اور اجتماعی جدوجہد سے اسلام کی صالح اور سلیم فطرت کا ثبوت دیا اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ خلافت راشدہ اور بعد کے ادوار میں اسلام عرب کی چار دیواری سے نکل کر دنیا کے دوسرے حصوں

www.abulhasanalinadwi.org

میں پہنچا، اور اس توسیع کا تقاضا تھا کہ غیر عرب کو دین سے روشناس کیا جائے اور قرآن سے ان کا ربط قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلام کی اندرونی قوت پھر برآئی اور علم قراءت، صرف ونحو اور اعراب کے استعمال کے ذریعہ اس ضرورت کو پورا کیا گیا۔ نیز دین کو آسان بنانے اور اس کے اوامر ونواہی سے ہر مسلمان کو بآسانی روشناس کرانے کے لیے فقہ کا ارتقاء عمل میں آیا، پھر ملوکیت کے تسلط کے بعد اس بات کا خطرہ تھا کہ اسلام کا پورا سیاسی نظام ہی نہ بگڑ جائے، اور شریعت اجتماعی زندگی سے بالکل ہی بے دخل نہ کردی جائے، اس خطرہ کا مقابلہ اسلام کی احیائی قوت نے اسلامی قانون کی تدوین کے ذریعہ کیا جس کے نتیجہ کے طور پر وہ قانون تیار ہوا جسے خود ملوک بھی نافذ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور دور عباسی میں وہ قانونِ شرعی تمام اسلامی مملکت میں جاری و ساری ہوا۔ صحابہؓ اور تابعین کے آہستہ آہستہ دنیا سے اٹھ جانے کی وجہ سے سنت نبوی کے گم ہو جانے کا اندیشہ تھا، اور اس اندیشہ کا جواب تدوین حدیث کے ذریعہ فراہم ہوا، اور تیسری چوتھی صدی تک احادیث کا وہ ذخیرہ تیار ہو گیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ہے۔ تدوین حدیث کے زمانے میں وضع حدیث کا خطرہ سامنے آیا، اور اس کا جواب نقدِ حدیث، علم الرجال وغیرہ کے ذریعہ دیا گیا۔ جب فقہ سے غیر متوازن شغف کی بنا پر اسلام کی روح کے مقابلہ میں محض ظاہر کو بے جا اہمیت دی جانے لگی تو تصوف کی تحریک رونما ہوئی، جو ایک طرف اس بے اعتدالی کو ختم کرنے، قانون کے ساتھ روحِ قانون کو مستحکم کرنے اور قلب ونظر کی اصلاح کو اہمیت دینے کی کوشش تھی، اور دوسری طرف ملوکیت اور سیاسی آمریت کے مقابلہ میں صالح عناصر کی تربیت اور تنظیم نو کی۔ ــــ اس طرح نظامِ اجتماعی اور حیاتِ ملی میں جب اور جہاں بگاڑ رونما ہوا، اصلاح کی قوتیں بھی پوری طاقت سے رونما ہوئیں، اور اس فساد کو دور کرنے اور اسلام کو دوبارہ اپنے اصل رنگ میں پیش کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہو گئیں۔ ــــ اسلامی تاریخ میں ہر دور اور ہر زمانے میں بگاڑ اور تجدید واحیاء کی قوتوں کے درمیان تصادم نظر آتا ہے، اور ہر موقع پر اسلام نے اپنی اندرونی قوت و صلاحیت کی بنا پر ہر زمانے کے نئے چیلنج کا جواب دیا، اور ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش

www.abulhasanalinadwi.org

کی۔ــــ تجدید واحیاء کی اس رو کا مطالعہ تاریخ کے طالب علم کے لیے بڑا اہم اور دلچسپ ہے، اور اس پہلو سے اسلامی تاریخ تقریباً UNIQUE ہے! کسی اور ملک، کسی اور قوم یا کسی اور تہذیب کی تاریخ میں تجدید کی ایسی رونظر نہیں آتی۔ بڑی ضرورت تھی کہ احیاء وتجدید کی اس پیہم جدوجہد کی مفصل تاریخ مرتب کی جائے اور ملت کی نئی نسلوں کے سامنے ان کے تابناک ماضی کی مکمل داستان پیش کی جائے۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اس ضرورت کو محسوس کیا، اور آپ اسے ایک حد تک اپنی فکر انگیز اور جذبات پرور کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ''ایک حد تک'' اس لیے کہ کتاب ''دعوت وتجدید'' سے زیادہ ''کارہائے عزیمت'' کی داستان ہے، اور اس میں تاریخ کی کہانی شخصیتوں کی زبانی سنائی گئی ہے۔ اس چیز نے جہاں کتاب کو دلچسپ اور روح پرور بنا دیا ہے اور جہاں اس کے ذریعہ قاری اپنے کو تھوڑی دیر کے لیے ان اربابِ عزیمت کی صحبت میں محسوس کرنے لگتا ہے جن کا یہ تذکرہ ہے، وہیں تجدید و احیاء کی کہانی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ سامنے نہیں آ پاتی ہے، اور پھر نقد وتبصرہ بھی بڑا ہی مجمل رہتا ہے، لیکن یہ کتاب کا نقص نہیں۔ مصنف نے اس کا دائرہ ہی محدود رکھا ہے، اور اپنے مقصد میں وہ بے حد کامیاب رہے ہیں۔

تاریخ دعوت وعزیمت کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی جلد میں اسلامی تاریخ کی پہلی چھ صدیوں کا جائزہ ہے اور اس دور کی اہم شخصیات کا تذکرہ ہے جو کہیں مفصل ہے اور کہیں مجمل۔ دوسری جلد امام ابن تیمیہؒ کی ہمہ گیر اور انقلابی شخصیت اور آپ کے تلامیذ کے لیے وقف ہے۔ آج کی صحبت میں اسی دوسری جلد کا تعارف وتبصرہ پیش نظر ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو میں امام ابن تیمیہؒ پر کوئی اچھی کتاب موجود نہ تھی۔ ہماری زبان میں امام موصوف کے چند تراجم [1]، مولانا شبلی نعمانی کے ایک مختصر، مگر فکر انگیز مقالے [2]، اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق [3] کی ایک درجہ دوم کی تالیف کے علاوہ غالباً کوئی قابل ذکر کتاب علامہ موصوف پر موجود نہ تھی [4]، اور یہ ایک ایسی کمی تھی جس پر سخت ندامت محسوس ہوتی تھی۔ مولانا علی میاں نے

www.abulhasanalinadwi.org

''تاریخ دعوت وعزیمت'' کی دوسری جلد تمام تر علامہ ابن تیمیہؒ کے تذکرہ کے لیے مخصوص کر کے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے، اور اردو خواں طبقہ کے سامنے پہلی مرتبہ امام موصوف کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کا تجدیدی کارنامہ پوری شرح وبسط کے ساتھ آیا ہے۔ اس عظیم خدمت پر مولانا علی میاں مبارک باد کے مستحق ہیں اور ہم صمیم قلب سے ان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امام ابن تیمیہؒ کا تعارف کرانے کے لیے علی میاں ہی کے قلم کی ضرورت تھی، ''ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا!''

زیر تبصرہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں چار ابواب ہیں جن میں حافظ ابن تیمیہؒ کی سوانح، آپ کی نمایاں خصوصیات وکمالات، تصنیفی خصوصیات اور مخالفت کے اسباب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں شیخ الاسلام کو ایک عارف باللہ اور محقق کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں بڑی مفصل بحث آپ کے تجدیدی اور اصلاحی کام سے کی گئی ہے، اور ہر شعبہ میں جو کام آپ نے انجام دیا، اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔ آخری اور چوتھے حصہ میں امام ابن تیمیہؒ کے تلامذہ کا تعارف ہے۔ علامہ ابن قیم کا ذکر مختصر تفصیل کے ساتھ اور ابن عبد الہادی، ابن کثیر، حافظ ابن رجب اور ابو اسحاق شاطبی کا اجمال اور اختصار کے ساتھ۔

ابن تیمیہؒ شمالی عراق کے تاریخی شہر حران میں وہاں کے علمی ودینی خاندان اسرۃ ابن تیمیہ میں ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ بروز دوشنبہ پیدا ہوئے، اور آپ کا نام ''احمد تقی الدین'' رکھا گیا۔ ساتویں صدی اسلامی تاریخ میں بڑی پر آشوب صدی تھی، اور مختلف وجوہ کی بناء پر مسلمان فکری انتشار اور سیاسی طوائف الملوکی کا شکار تھے۔ ایک طرف یونانی فلسفہ اور اس کے زیر اثر ترقی پانے والے مذہبی فلسفہ نے اسلام کو خدا کے دین کی بجائے بازیچہ اطفال بنا دیا تھا۔ دوسری طرف گروہ باطنیہ کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں اور فتنہ پردازیوں کی بناء پر اسلامی اقدار اپنے معنی کھوتی جا رہی تھیں۔ پھر عیسائیوں نے بھی ممالک اسلامیہ میں ایک خاص حیثیت اختیار کر لی تھی، اور فکری اور سیاسی دونوں

www.abulhasanalinadwi.org

ہی میدانوں میں ان سے مقابلہ درپیش تھا۔ مسلمانوں میں مشرکانہ عقائد واعمال گھر کر گئے تھے، اور ہر طرف نت نئی بدعات کا دور دورہ تھا۔ اہل تصوف اپنے حلقوں میں خاص قسم کی گمراہیاں پھیلا رہے تھے، اور اہل فقہ اندھی تقلید اور علمی جمود کا شکار تھے۔ سیاسی میدان میں تاتاری فتنہ اپنی تمام شر انگیزیوں کے ساتھ موجود تھا، اور بغداد کی تباہی کے بعد باقی بلاد اسلامیہ کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے کوشاں۔ مسلمان ملوک اپنی باہمی جنگ وجدل کی وجہ سے کمزور اور غیر منظم تھے، اور سیاسی نظام ضعف وانتشار میں مبتلا۔ ان حالات میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ملت اسلامیہ بازی ہار چکی ہے اور شیطان کی ذریت اب اسلام کی اصلاحی تحریک کو مغلوب کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے ــــ لیکن اسلام کی تاریخی قوت پھر حرکت میں آئی اور ابن تیمیہؒ کی شخصیت نے ۶۷ سال کی مختصر مدت میں حالات کا رخ یکسر بدل دیا، اور تجدیدی عمل کو اتنی رفعت عطا کی کہ اسلام پھر ایک زندہ تحریک بن گیا۔

اس عظیم کام کو انجام دینے کے لیے فطرت نے ان کو ان تمام صلاحیتوں سے آراستہ کیا تھا جو اس کے لیے ضروری تھیں۔ بہترین حافظہ، علم کا ذوق، نگاہ کی وسعت، قلب کی رقت، ہمت کی بلندی، جرات کی قوت ــــ وہ کونسی چیز تھی جو ابن تیمیہ میں نہ تھی۔ آپ نے ۲۲ سال کی عمر میں تمام علوم کی تکمیل کر کے درس وتدریس کا آغاز کر دیا تھا اور علم کا یہ حال تھا کہ ان کے دور کے مشہور اور نامور علماء بھی ان کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ علامہ کمال الدین ابن الزملکانی ان کے علم کے متعلق لکھتے ہیں:

> ابن تیمیہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے علوم اس طرح نرم کر دیے تھے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا تھا، جس علم کے بارہ میں ان سے سوال کیا جاتا، اس طرح جواب دیتے کہ دیکھنے والا یا سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سوا کچھ نہیں جانتے، اور یہ فیصلہ کرتا کہ ان کی طرح کوئی اس فن کا عالم نہیں ۵۔

ویسے تو امام صاحب ہر علم میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، مگر قرآن ان کا خاص موضوع تھا اور اس کی

www.abulhasanalinadwi.org

تفسیر وتعبیر ان کا اصل میدان، اور پھر قرآن کے مطالعہ اور اس پر تفکر میں انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ صرف کر دیا تھا۔ اپنے تدبر قرآن کے طریقے کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ:

بعض اوقات ایک آیت کے لیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مطالعہ کے بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عنایت ہو، میں عرض کرتا ''یامعلم آدم و ابراھیم علمنی'' (اے آدم وابراہیم کے معلم میری تعلیم فرما)۔ میں سنسان اور غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا، اپنی پیشانی خاک پر ملتا اور کہتا ''اے ابراہیم کو تعلیم دینے والے! مجھے سمجھ عطا فرما[٦]۔''

اور ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور مبدائے فیض سے ان کو خاص فہمِ قرآنی عطا فرمایا۔

امام ابن تیمیہؒ نے ہر بدعت اور ضلالت کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا اور جب میدان میں اترے تو خم ٹھونک کر اترے۔ ــــ ان معرکوں میں ان کو بڑی بڑی آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا، لیکن کوئی بڑی سے بڑی مشکل اور مصیبت بھی ان کو احقاقِ حق اور ابطالِ باطل سے نہ روک سکی۔ ہم عصروں کی مخالفت، بدنامی اور اتہام طرازی، زدوکوب، جیل اور زبان بندی، وہ کون سی چیز تھی جس نے ان کی راہ روکنے کی کوشش نہ کی اور جس کا انہوں نے بے خوف وخطر مقابلہ نہ کیا، بلکہ ہر آزمائش نے ان کے ذوقِ جہادِ حق کو کچھ اور تیز ہی کر دیا۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب!
بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد

امام صاحب نے صرف فکری میدان ہی میں کام نہیں کیا، بلکہ اسلام کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے بھی جان و مال کی بازی لگا دی۔ آپ نے بدعات کے خلاف جہاد کیا اور اپنے تلامذہ اور احباب کے ساتھ منظم اجتماعی جدوجہد کی۔ اسی ذریعہ سے آپ نے دمشق میں شراب بند کرائی۔ بدعقیدہ کوہستانیوں کی تادیب کی، تاتاریوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا اور

www.abulhasanalinadwi.org

اسلام کے فدائیوں کا ایک ایسا گروہ منظم کیا جو منکرات کو اپنے ہاتھ سے روکنے کا کام انجام دیتا تھا۔ بقول مصنف محترم:

ابن تیمیہ کو اکثر یہ کام [نہی عن المنکر] خود انجام دینا پڑتا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے تلامذہ ومحبین کی ایک جماعت تھی جو ان کی مددگار ورفیق تھی، اس لیے انہوں نے اعزازی طور پر حسبۃً للہ ایک طرح کا شرعی اور اخلاقی احتساب قائم کر رکھا تھا اور مبتدعین ومخالفین سنت، حکام کی نگرانی اور علماء کے عتاب سے اگر بچ بھی جاتے تھے تو اس ''شرعی پولیس'' کی نظر سے نہیں بچ سکتے تھے۔

اس طرح امام صاحب نے اسلام کے اصل انقلابی پیغام کو سمجھا اور زبان وعمل سے اس کو دوسروں تک پہنچایا۔ امام صاحب کی زندگی کے اس شعبہ میں ان کوتاہ نظر مدعیانِ دین کے لیے بڑی عبرت کا سامان ہے جو دین کے اجتماعی تصور سے گھبراتے ہیں اور حیاتِ اجتماعی وسیاسی اصلاح کو دنیا کا کام قرار دے کر مسلمانوں کو فرار کا سبق پڑھاتے ہیں۔

امام صاحب کی جرأت اور بے باکی بے مثال تھی۔ جابر سے جابر بادشاہ کے سامنے وہ کلمۂ حق کہنے سے کبھی باک نہ رہے۔ وہ کہا کرتے تھے، اور ان کے یہ الفاظ سونے کے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں کہ ''غیر اللہ سے وہ ڈرے جس کے دل میں کوئی بیماری ہو''۔

جب تاتاری بادشاہ قازان نے (جو مسلمان ہوگیا تھا) دمشق پر حملہ کیا تو امام صاحب وفد لے کر اس کے پاس گئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کی اور اسے بتایا کہ مسلمانوں کا آپس میں لڑنا کتنا بڑا گناہ ہے، اور خود مسلمانوں پر فوج کشی کتنا بڑا جرم! مجلس کے ایک شریک اس ملاقات کی روئداد اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

میں شیخ کے ساتھ اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ سلطان (قازان) کو عدل وانصاف کی آیات واحادیث واللہ ورسولؐ کے ارشادات واحکام سناتے تھے، ان کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی، اور وہ برابر سلطان کے قریب ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ قریب

www.abulhasanalinadwi.org

تھا کہ ان کے گھٹنے اس کے گھٹنے سے مل جائیں۔ سلطان کو اس سے کچھ ناگواری نہ ہوئی۔ وہ بڑی توجہ سے کان لگائے ان کی گفتگو سن رہا تھا اور ہمہ تن متوجہ تھا، اس پر ان کا رعب ایسا طاری تھا، اور وہ ان سے ایسا متاثر تھا کہ اس نے لوگوں سے پوچھا کہ "یہ عالم کون ہیں؟ میں نے ابھی تک ایسا شخص نہیں دیکھا، اور نہ اس شخص سے زیادہ کوئی دلیر اور قوی القلب آج تک دیکھنے میں آیا۔ مجھ پر ابھی تک کسی کا ایسا اثر نہیں پڑا تھا۔[۸]"

اس مجلس کے بعد قازان نے امام صاحب سے دعا کی درخواست کی اور آپ نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ جو دعا آپ نے کی، وہ آپ کی ذہانت اور دلیری کا ایک شاہکار ہے۔ آپ نے کہا:

خدایا! اگر تیرے نزدیک قازان کا اس جنگ سے مقصد تیرے کلمہ کی بلندی اور جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس کی مدد فرما، اور اگر سلطنت دنیا اور حرص وہوس ہے تو اس سے تو سمجھ لے[۹]!

ملک کی اجتماعی زندگی میں امام صاحب برابر حصہ لیتے اور اس کی اصلاح کی مسلسل کوشش کرتے رہتے تھے۔ مصنف محترم لکھتے ہیں:

دمشق میں ابن تیمیہؒ کی ایک طرح کی دینی سیادت قائم ہوگئی تھی، وہ اگر دیکھتے تھے کہ حکومت کسی بدعت یا فعل منکر کے روکنے میں تساہل سے کام لے رہی ہے اور علماء خاموش ہیں تو وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے اور خود شرعی احکام کا اجراء کرتے، ان کے ساتھ عقیدت مند تلامذہ اور دیندار اور صحیح العقیدہ عوام کی ایک بڑی جماعت تھی، اور ان کا حلقہ اثر بڑھتا جا رہا تھا[۱۰]۔

پھر امام صاحب نے علمی اور فکری میدان میں بھی وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال مشکل ہی سے ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو اہم کام انجام دیے، وہ یہ ہیں:

www.abulhasanalinadwi.org

۱- تصوف اور وحدۃ الوجود پر کڑی تنقید اور اس کو عجمی اثرات سے پاک کرنے کی کوشش۔ آپ نے تصوف کے امام ابن عربی پر سخت تنقید کی ہے اور ان کے ایک ایک دعویٰ کی تردید کی ہے، ابن عربی کے متعلق امام صاحب کا ارشاد ہے۔ ''اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ ان کا خاتمہ کس پر ہوا (یعنی اسلام پر یا کسی اور چیز پر)۔''

۲- فلسفہ، منطق اور علمِ کلام پر کڑی تنقید اور کتاب وسنت کے طرزِ استدلال اور اسلوبِ بیان کی ترویج۔ یہ وہ عظیم کام ہے جس کے ذریعہ امام صاحب نے ملت کا رشتہ بے روح اور گمراہ کن فلسفوں سے کاٹ کر، حیات کے سرچشمہ، قرآن وحدیث سے جوڑ دیا۔ اس سلسلہ میں بھی ان کی اہم ترین کتاب ''الرد علی المنطقیین'' ہے جس کا مفصل تعارف مولانا علی میاں نے کرایا ہے۔

۳- غیر اسلامی ملل وفرق کی تردید اور ان کے عقائد ورسوم کا مقابلہ۔ اس سلسلہ میں آپ نے عیسائیت اور شیعیت کی پرزور تردید کی اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی ہوا اکھاڑ دی۔

۴- فقہ میں تقلید اور جمود کے خلاف بغاوت اور اعتدال کی راہ کی نشاندہی۔

۵- تمام علوم شرعیہ کی تجدید اور ہر صنف پر نئی روح پرور اور ولولہ انگیز تصنیفات کی تیاری۔

یہ ایک ایسا عظیم اور مہتم بالشان کارنامہ ہے کہ ملت اسلامیہ کبھی آپ کے احسان سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔

مولانا علی میاں نے ان تمام کارہائے نمایاں کا مفصل تعارف کرایا ہے، اور آپ کی تصنیفات سے اتنا مواد فراہم کردیا ہے کہ قاری امام صاحب کے افکار اور ان کے طرز فکر سے اچھی طرح روشناس ہوجاتا ہے، اور اصل کتابوں کے پڑھنے کی پیاس بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔

علی میاں کا انداز بیان بڑا شیریں اور دل نشین ہے اور ان کے الفاظ قاری کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ طرز تحریر کا اندازہ اس ایک اقتباس سے ہوسکتا ہے:

امام ابن تیمیہ نے اپنے حافظۂ خداداد سے اس پورے علمی ذخیرہ پر عبور حاصل کیا، اور

www.abulhasanalinadwi.org

اس کو فکری طور پر ہضم کرلیا، اور اس سے اپنی تصنیفات میں پورا فائدہ اٹھایا، لیکن ان کی بے چین اور مواج طبیعت، ان کا نکتہ سنج اور نکتہ آفریں دماغ اور ان کا سیال و رواں قلم اس پر قانع نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ صرف نقل و روایت اور شرح و تلخیص یا انتخاب پر اکتفا کریں، قرآن مجید کا گہرا علم، مقاصدِ شریعت سے گہری واقفیت، اور اصولِ فقہ اور اصولِ تشریع کا ملکہ راسخہ ان کی ہر تصنیف میں ان کا رفیق ہے، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس میں اپنے تازہ علم سے جان ڈال دیتے ہیں[۱۱]۔

کتاب ہر حیثیت سے کامیاب ہے، اور اس کامیابی پر ہم محترم علی میاں کو صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتے ہیں، لیکن ناانصافی ہوگی، اگر ہم چند باتوں کی طرف مصنف محترم کو متوجہ نہ کریں:

۱- بہت سے مقامات پر نقل اقتباس میں عربی کی مختصر اور لمبی عبارات بغیر ترجمہ کے دے دی گئی ہیں، اور اس امر کے پیش نظر کہ آج اردو دان طبقہ میں عربی جاننے والے خال خال ہی ہیں۔ ان حصوں کے ترجمہ کی عدم موجودگی ایک بڑا نقص ہے۔ چند مقامات پر تو یہ عربی عبارات خاصی لمبی ہیں۔ ایسے چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے: صفحہ ۶۸، ۷۵، ۱۰۴ وغیرہ

۲- تقلید اور تصوف کے متعلق امام صاحب کے خیالات و نظریات میں خاصی نرمی پیدا کردی گئی ہے، اس طرح مولانا علی میاں کی یہ رائے کہ ان کا درجہ مجتہد منتسب کا تھا اور وہ فقہ حنبلی ہی کے ایک مجتہد تھے، محل نظر ہے۔ امام صاحب کی پوزیشن کو فقہ کی اصطلاحات میں بمشکل ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر کرنا ہی ہے تو پھر ان کے فتاویٰ تو اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ مجتہد مطلق تھے۔ تصوف پر بھی ان کی تنقید کی گرمی اور حرارت کو خاصا سرد کردیا گیا ہے، اور یہ چیز تبصرہ نگار کو خاصی کھٹکتی ہے۔

۳- امام صاحب کا جو اثر آنے والے ادوار اور بعد کی احیائی تحریکات پر پڑا ہے، اس کا کوئی ذکر

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب میں نہیں ملتا۔ایک مجمل سا اشارہ آخری باب میں ہے، مگر دس بارہ سطروں میں اتنے اہم موضوع کی طرف اشارہ بھی محال ہے، کجایہ کہ اس کا تذکرہ ہو سکے!

۴- پہلے حصہ میں ابواب کی تقسیم کچھ اور بہتر ہو سکتی ہے۔ڈیڑھ سو صفحے کا ایک مسلسل باب خاصا گراں گزرتا ہے۔جدید اسلوبِ نگارش اس کا مشکل ہی سے متحمل ہو سکتا ہے۔

۵- کتاب میں نقد و تبصرہ کا حصہ بہت کم اور تلخیص و روایت کا حصہ بہت زیادہ ہے۔کاش محترم علی میاں قارئین کو اپنی تنقیدی آراء میں بھی شریک کر لیتے!

حواشی

۱- برعظیم پاکستان و ہند میں امام ابن تیمیہ کے افکار اور ان کی کتابوں کے تراجم کے لیے دیکھیے: خلیق احمد نظامی، The Impact of Ibn Taimiyya on South Asia، ششماہی Journal of Islamic Studies (اوکسفرڈ)، جلد-۱، ۱۹۹۰ء، صفحات ۱۲۰-۱۴۹ (مرتب)

۲- دیکھیے: سید سلیمان ندوی (مرتب)، مقالاتِ شبلی، جلد پنجم، اعظم گڑھ: دارالمصنفین، ۱۹۵۵ء، صفحات ۶۵-۸۱ (مرتب)

۳- ڈاکٹر غلام جیلانی برق (م ۱۹۸۵ء) کی تالیف "سوانح امام ابن تیمیہ" پہلی بار ۱۹۴۱ء میں مکتبہ اردو-لاہور سے شائع ہوئی تھی۔دوسری بار جب جنوری ۱۹۷۹ء میں اسلامک پبلشنگ ہاؤس-لاہور کی جانب سے چھپی تو اس کے دیباچے میں ڈاکٹر برق نے لکھا:

> ۱۹۷۲ء کے اواخر میں---مختلف کتب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ "[سوانح امام] ابن تیمیہ" سامنے آ گئی، اسے دیکھا تو چند چیزیں بہت کھٹکیں، یعنی
>
> ۱-علماء کے نامکمل نام جو سکونتی، نسبی اور مسلکی نسبتوں سے معرا تھے۔اگر کسی عالم کا پورا نام حافظ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد بن عبدالہادی بن عبدالحمید---بن قدامۃ المقدسی الحنبلی تھا تو میں نے صرف ابن قدامہ لکھنے پر اکتفاء کی تھی۔باقی اسماء سے بھی یہی سلوک کیا تھا۔
>
> ۲-ناموں کے آگے تاریخ وفات درج نہ تھی۔
>
> ۳-حوالے ناقص تھے، کتابوں کے سامنے صفحات کا اندراج نہیں تھا۔

www.abulhasanalinadwi.org

۴- کتابیات میں سالِ طبع اور مقامِ اشاعت کا ذکر نہیں تھا۔ خیال آیا کہ اگر یہ نقائص میں نے دور نہ کیے تو اور کون کرے گا، چنانچہ میں نے دوبارہ ماخذ کی تلاش کی۔ ان کی مدد سے ننانوے فیصد نقائص دور کیے اور اس سلسلہ میں بعض ایسی کتابوں سے بھی مدد لی جو میری اس کتاب کے بعد شائع ہوئی تھیں---(صفحات ۲۰-۲۱)۔(مرتب)

۴- ڈاکٹر برق کی کتاب کے بعد اردو میں امام ابن تیمیہ پر دو اہم اور وقیع کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ پہلی کتاب ڈاکٹر محمد یوسف کوکن عمری کی ''امام ابن تیمیہ'' (مدینہ برقی پریس- مدراس، ۱۹۵۹ء) ہے اور دوسری محمد ابو زہرہ کی عربی کتاب ''ابن تیمیہ، حیاتہ وعصرہ، آراءہ وفقہہ'' کا اردو ترجمہ ''حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ'' (المکتبۃ السّلفیہ- لاہور، جولائی ۱۹۶۱ء) ہے جسے مولانا رئیس احمد جعفری نے اردو کا جامہ پہنایا تھا، اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف (م ۱۹۸۷ء) نے اس پر وقیع حواشی کا اضافہ کیا تھا۔ (مرتب)

۵- سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم، اعظم گڑھ: مطبع معارف، ۱۹۵۹ء، صفحات ۳۰-۳۱

۶- ایضاً، ص ۲۹

۷- ایضاً، ص ۵۳

۸- ایضاً، ص ۴۰

۹- یضاً، ص ۴۱

۱۰- ایضاً، صفحات ۵۷-۵۸

۱۱- ایضاً، ص ۳۲۳

www.abulhasanalinadwi.org

نثار احمد

تاریخ دعوت وعزیمت

برصغیر پاکستان وہند کے چند پیشوایانِ روحانی

اس وقت مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا تیسرا حصہ ہمارے سامنے ہے، اس [کے] --- پہلے حصہ میں تاریخ اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں کے بعض صاحبانِ عزیمت کی زندگیوں اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کہیں مفصل کہیں مجمل، دوسرا حصہ امام ابن تیمیہ کی ہمہ گیر انقلابی شخصیت اور آپ کے مشہور تلامذہ کے لیے وقف ہے،--- اور [تیسرا حصہ] جو صرف ہندوستان کے چند پیشوایان روحانی کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

زیر تبصرہ کتاب چھٹی صدی کے اواخر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے تذکرہ سے شروع ہوتی ہے اور آٹھویں صدی ہجری تک حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے حالات و مکتوبات پر ختم ہو جاتی ہے۔ بیچ میں چشتی سلسلہ کے بعض خلفاء عظام یعنی حضرت قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر اور شیخ نظام الدین اولیاء کے حالات و واقعات ہیں۔ پوری کتاب میں شیخ یحییٰ منیری کے حالات و واقعات سب سے زیادہ شرح وبسط سے بیان کیے گئے ہیں اور کتاب کے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس سے کم تفصیل حضرت نظام الدین اولیاء کے سلسلہ میں ہے اور صرف ۵۴ صفحات میں باقی تمام بزرگوں کا ذکر ہے۔

مزید برآں یہ تذکرہ صرف ہندوستان تک محدود ہے اور اس زمانے میں ہندوستان سے باہر کے دوسرے صلحاء و اتقیاء سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ ہندوستان کے بھی جن صاحبانِ دل اور عارفانِ کامل کا انتخاب کیا گیا ہے، اس کی وجہ، بقول مولانا علی میاں، یہ نہیں ہے کہ ان سے متعلق

www.abulhasanalinadwi.org

تاریخی مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی تاریخ دعوت وعزیمت میں ایک مقام رکھتے ہیں اور ہندوستان میں (جو ساتویں صدی ہجری کے بعد سے عالم اسلام کا مرکزِ اعصاب اور احیاء وتجدید کی تحریکوں کا منبع ہے۔) ان حضرات نے روحانی و اصلاحی تحریک کی قیادت کی اور اپنے زمانے اور بعد کی نسلوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔

اردو زبان میں ہمارے نزدیک یہ پہلی کتاب ہے جس کو پڑھ کر متذکرہ بزرگانِ دین کی صحیح تصویر نکھر کر سامنے آتی ہے، ورنہ ابھی تک ہمارے ہاں یہ المیہ رہا ہے کہ بزرگانِ دین، اولیاء اللہ اور دیگر صلحاء امت کے دو ایک مستند تذکروں اور ملفوظات کے علاوہ اکثر تذکرے ایسے ایسے بے سروپا مضامین، بے اصل روایات اور محیر العقول حکایات سے پُر ہوتے ہیں کہ جن کو پڑھ کر کوئی شخص ان کے اصل کمالات، حالات، دینی و تبلیغی مساعی، تعلیم و تربیت کے نتائج وغیرہ کے بارے میں ضروری واقعات سے واقفیت نہیں حاصل کرسکتا۔ مروجہ تذکرے اور مشہور کتب متداولہ پڑھ جایئے، بقول شخصے ''مصنف کا سارا زوران کے کشف و کرامات کے بیان پر صرف ہو جاتا ہے اور اس کو اس حد تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ماوراء کوئی اور ہستی نظر آتے ہیں ا۔''

یہی وہ تلخ حقائق اور اصل دقتیں ہیں جن کی وجہ سے مولانا علی میاں کو اس کتاب کی تالیف میں قدم قدم پر تحقیق وتفتیش اور تلاش وجستجو سے کام لینا پڑا۔

زیر نظر کتاب کا آغاز چھٹی صدی ہجری سے ہوتا ہے جب سیل تاتار سے صرف ہندوستان محفوظ رہ گیا تھا، چنانچہ عالم اسلام کا سارا جوہرِ فضیلت و شرافت سمٹ کر اسی کی گود میں آ گیا تھا، اور عالم اسلام کا ایک نیا روحانی اور فکری مرکز بن رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اسلام مدتیں ہوئیں داخل ہو چکا تھا، اور ۹۲ھ میں ہی محمد بن قاسم نے سندھ سے ملتان تک کے علاقے کو مسخر کر لیا تھا، لیکن حقیقتاً ہندوستان کی فتح کا سہرا سلطان محمود غزنوی کے سر اور اسلامی سلطنت کے قیام کی سعادت سلطان محمد غوری کے حصہ میں تھی، جبکہ آخری طور پر اس کی روحانی تسخیر اور اخلاقی و ایمانی فتح خواجہ بزرگ شیخ الاسلام حضرت معین الدین چشتی کے لیے مقدر ہو چکی تھی ۲۔

www.abulhasanalinadwi.org

سلسلہ چشتیہ کے بانی خواجہ معین چشتی سجزی[۳] نے ہندوستان میں حفاظت واشاعتِ دین کی خدمات انجام دیں۔ آپ نے محمد غوری کے حملوں کے درمیان اور اسلامی سلطنت کی عمومیت و استحکام سے پیشتر ہی ہندوستان کے قلب اور قدیم ہندوستان کے سیاسی وروحانی مرکز اجمیر کو اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا۔ یہ فیصلہ ان کی اولوالعزمی، عالی ہمتی اور جراتِ ایمان کا ایسا تابناک کارنامہ ہے جس کی مثالیں صرف پیشوایانِ مذاہب اور فاتحین عالم کی تاریخوں میں مل سکتی ہیں۔ ان کے استقلال وخلوص، ان کے توکل واعتماد، ان کے زہد وقربانی اور ان کے درد وسوز نے ہندوستان کے لیے دارالاسلام بننے کا فیصلہ کردیا[۴]۔

خواجہ معین الدین چشتی کے خلیفہ خاص حضرت قطب الدین بختیار کاکی تھے۔ ان کی جانشینی اور حضرت خواجہ معین الدینؒ کے کاموں اور مقاصد کی تکمیل وتوسیع کی سعادت حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر کے حصہ میں آئی۔ خواجہ فریدؒ کے علوِ مرتبت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہندوستان میں سلسلۂ چشت کے مؤسس و بانی ہیں، خواجہ فرید اس کے مجدّد اور آدم ثانی ہیں۔ آپ ہی کے دو خلفاء حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور حضرت شیخ علاء الدین صابر کلیری کے ذریعہ یہ سلسلہ ہندوستان میں پھیلا اور ان کے خلفاء واہل سلسلہ کے ذریعہ اب تک قائم ہے[۵]۔

آپ کے بعد حضرت نظام الدین اولیاء وہ پہلے چشتی شیخ ہیں جن کے اثرات ان کی زندگی میں سارے ہندوستان میں پھیلے اور جنھوں نے ہندوستان کے اسلامی معاشرہ اور ہر طبقہ کو متاثر کیا، اور حکومت سے لے کر عوام وغرباء تک کو اپنے حلقۂ عقیدت واثر میں لیا۔

مولانا علی میاں نے اس موقع پر نہ صرف ان کی سوانح اور خاص واقعات کو قلم بند کیا ہے، بلکہ ان کے اخلاق وصفات، اذواق وکیفیات، افادات وتحقیقات، ان کے فیوض وبرکات اور حضرت خواجہ کی تعلیم وتربیت کے اثرات کو بھی تفصیل سے لکھا ہے۔

آج کل خود ساختہ پیروں اور من گھڑت تصوف کا حال سب کو خوب معلوم ہے۔ نماز کی

www.abulhasanalinadwi.org

باجماعت کی ادائیگی تو ایک طرف رہی، نماز تک کی ''ضرورت'' محسوس نہیں کی جاتی اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہ ظاہر پیر صاحب سامنے ہوتے ہیں، لیکن بہ باطن ہر نماز خانۂ کعبہ میں ادا فرماتے ہیں۔ عام لوگ اس راز کو بھلا کیا جان سکتے ہیں! لیکن حضرت خواجہ کا یہ حال تھا کہ ''عمر شریف اسی سے متجاوز ہوگئی، جب بھی پانچوں وقت جماعت سے نماز پڑھنے کے لیے بالا خانہ سے (جو بہت بلند تھا) جماعت خانہ میں اتر کر ان درویشوں اور ساتھیوں کے ساتھ جو وہاں موجود ہوتے تھے، جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے[6]۔''

علاوہ ازیں حضرت خواجہ خود بھی اتباع سنت کا اہتمامِ بلیغ رکھتے تھے اور اپنے اصحاب اور خدام کو بھی بڑی تاکید فرماتے تھے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اتباع پر مضبوطی و ثابت قدمی دکھانی چاہیے، اور کوئی مستحب اور ادب بھی فوت نہ ہونے پائے[7]۔'' حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے تھے۔: ''پیر ایسا چاہیے کہ احکامِ شریعت وطریقت وحقیقت کا ضرور علم رکھتا ہو اور جب ایسا ہوگا تو وہ کسی خلافِ شرع کام کے لیے نہ کہے گا[8]۔''

ایک مرتبہ آپ نے ترکِ دنیا اور حقیقی زہد اور درویشی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ترکِ دنیا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی اپنے کو ننگا کردے، مثلاً لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے۔ صحیح معنی میں ترکِ دنیا یہ ہے کہ کپڑے پہنے، کھانا کھائے اور جو کچھ میسر آئے، اس کو استعمال کرے، لیکن اس کے جمع کرنے کی طرف متوجہ نہ ہو اور اپنے دل کو کسی چیز میں پھنسائے نہیں، یہی ترکِ دنیا ہے[9]۔

پھر مشائخ چشت کا تصوف محض عزلت وخلوت، نفس کشی اور ترکِ دنیا ہی نہ تھا، بلکہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں زمانے کے دھارے کو بدلنے اور حالاتِ زمانہ سے پنجہ آزمائی کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ انہوں نے حکمرانوں کے روبرو کلمہ حق کہنے، ان کے غلط رجحانات کا مقابلہ کرنے

www.abulhasanalinadwi.org

اور صلاح مشورہ دینے سے بھی پس و پیش نہیں کیا، اور جب کبھی ان کے اولوالعزم مشائخ کو موقع ملا، انہوں نے اصلاح و انقلاب کی کوششوں سے بھی دریغ نہیں کیا[۱۰]۔ اس کی مثالیں جا بجا کتاب میں موجود ہیں۔

شیخ یحییٰ منیری

اس مقام پر مشائخ چشت کا تذکرہ ختم ہو جاتا ہے، اور اب سلسلۂ فردوسیہ کے شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا ذکر خیر شروع ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حصہ کو مولانا علی میاں نے پوری دل جمعی کے ساتھ لکھا ہے۔ ابتداء میں ان کی پیدائش، تعلیم و تربیت، مجاہدہ و خلوت، پھر ان کی صفات و خصوصیات، وفات وغیرہ کا بیان ہے اور آخر میں ان کے گراں قدر مکتوبات کے اقتباسات دیے گئے ہیں۔ ہم ناظرین کے استفادہ کے لیے اس طویل تذکرہ کے بعض مخصوص مقامات کا ذکر کریں گے۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری جو کردار و اخلاق میں ''مشکوٰۃ نبوت کے نور سے فیض یاب تھے''، اخلاق کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> اور (اصل) اخلاق یہ ہے جو کہ طریقت میں اہل علم کا شعار بن گیا ہے کہ وہ اپنے احوال میں شریعت کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے اخلاق کو سنت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور جو کوئی شریعت کی تحقیق نہیں کر لیتا، اسے طریقت (تصوف) سے کچھ حاصل نہیں ہوتا[۱۱]۔
>
> جو کوئی شریعت کی پیروی میں جتنا راسخ زیادہ ہے، اتنا ہی خوش خلق زیادہ ہے، اور جو جتنا خوش خلق زیادہ ہے، بارگاہ خداوند تعالیٰ کا محبوب زیادہ ہے، جبکہ اچھا اخلاق آدم علیہ السلام کی میراث اور خداوند عالم کا عطا کردہ تحفہ ہے، پس لازماً مومن کے لیے اچھے اخلاق سے بڑھ کر اور اچھا طریقہ اور کوئی زیب و زینت کی چیز نہیں ہے، اور

www.abulhasanalinadwi.org

اچھے اخلاق کی حقیقت خداوند تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی کرنا ہے۱۲۔

لیکن یہ سب تعریف و ہدایات زبانی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ آپ خود بڑے شفیق، کریم النفس اور دشمن نواز تھے۔ اسی رحمت و شفقت کا نتیجہ تھا کہ کسی بندۂ خدا کا دل توڑنا آپ کے مشرب میں گناہ تھا۔ ایک مرتبہ آپ نفل روزہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک شخص بڑے اہتمام سے آپ کی خدمت میں ایک تحفہ لایا اور کہا کہ یہ میں بڑے شوق سے آپ کے پاس لایا ہوں کہ آپ تناول فرمائیں۔ آپ نے اسی وقت تناول فرمالیا اور فرمایا: ''روزہ توڑنے کی قضا ہے، لیکن دل توڑنے کی قضا نہیں۱۳۔''

راہِ طریقت کے نو واردوں کو کشف و کرامات کا شوق کیا کیا کرا ڈالتا ہے اور نئے نئے متوسلین ''کرشمات'' دیکھنے کے کیسے خواہش مند ہوتے ہیں، لیکن مخدوم الملک کو دیکھیے کہ آپ سے کرامات اور خوارق کثرت سے سرزد ہوتے تھے، لیکن اپنے اس مزاج و حال کی وجہ سے اظہار کرامت سے بڑا متنفر تھا اور کسی ایسی چیز کو پسند نہیں کرتے تھے جس سے آپ کے مرتبہ و مقبولیتِ عنداللہ کا اظہار ہو۱۴۔

ایک مرتبہ چند آدمی کچھ مری ہوئی مکھیاں لے کر آپ کے پاس آئے اور کہا کہ مشہور مقولہ ہے ''الشیخ یحیی ویمیت ۱۵۔ آپ حکم دیجیے کہ مکھیاں زندہ ہو جائیں۔'' آپ نے فرمایا: ''میں خود در ماندہ ہوں، دوسروں کو کیا زندہ کروں گا۱۶۔''

ارشاد و تربیت کے ذرائع

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ارشاد و تربیت کا بڑا ذریعہ اور مرکز آپ کی وہ مجلسیں تھیں جن میں مشائخ کے دستور کے مطابق ہر طبقہ کے آدمی کو حاضر ہونے اور استفادہ کرنے کی اجازت حاصل تھی۔ ان مجالس کا کوئی مستقل و متعین موضوع اور ان کی گفتگو کوئی مسلسل درس کی

www.abulhasanalinadwi.org

حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ مجلسیں بڑے گہرے معارف وحقائق اور تصوف کے دقیق نکات پر مشتمل ہوتی تھیں ۱۷۔

ارشاد وتربیت کا دوسرا ذریعہ (خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو کسی اور مقام پر ہوتے) آپ کے مکتوبات تھے۔ حضرت مجددؒ الف ثانی کے بعد (معنوی ترکیب میں نہ کہ زمانی) شاید سب سے زیادہ کام آپ نے ہی اپنے خطوط اور مکتوبات سے لیا، نیز دیرپا اور وسیع اصلاح وتربیت کا فریضہ انجام دیا۔ آپ کے مکتوبات کا مجموعہ نہ صرف تصوف کے ذخیرہ میں، بلکہ علوم ومعارف، نکات ولطائف کے ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتا ہے اور اپنی تاثیر، ادب وانشاء کی قوت، برجستگی اور زندگی کے لحاظ سے پورے فارسی ادبیات میں کم کتابیں اس پایہ کی ہوں گی۔ ان مکتوبات نے حضرت مخدوم کے زمانہ میں بھی اصلاح وتربیت کی بہت بڑی خدمت انجام دی اور آپ کی وفات کے بعد ہر صدی میں ہزاروں انسانوں نے ان سے فائدہ اٹھایا، اور اب صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی ان میں ایسی تاثیر وزندگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے، لکھنے والے نے ابھی لکھا ہے ۱۸۔

خطوط کی جھلکیاں

ہم ناظرین کے استفادہ کے لیے ان سے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ایک خط میں اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا حال لکھتے ہیں!

> اگر مہربانی کی نظر ڈالے تو ہمارے سب عیب ہنر ہیں، ہمارے تمام نقص کمال اور ہماری تمام بدزیبی حسن وجمال۔ اے برادر! ایک مٹھی بھر خاک تھی جو ذلت وخواری کی حالت میں راستہ میں پڑی، اور پاؤں کے نیچے آرہی تھی۔ لطف ونوازش کی ایک نظر پڑی اور صدا آئی۔ انی جاعل فی الارض خلیفہ---۱۹

www.abulhasanalinadwi.org

کریم نکتہ نواز

اے بھائی! تم کتنے ہی آلودہ وملوث ہو، دامنِ توبہ تھام لو اور امیدوارِ رحمت بن جاؤ کہ تم نہ ساحرانِ فرعون سے آلودہ تر ہو اور نہ اصحاب کہف کے کتے سے زیادہ گندے، نہ طور سینا کے پتھر سے بڑھ کر زیادہ جماد اور نہ ستون حنانہ سے بڑھ کر بے قیمت[۲۰]۔

موجودات بہت اور مصنوعات بیشمار تھے، لیکن کسی ہستی کے ساتھ وہ معاملہ نہیں تھا جو اس مٹی پانی کے مجموعہ کے ساتھ تھا، جب رب العزت کو منظور ہوا کہ اس خاکی پتلے کو وجود کا لباس پہنائے اور خلافت کے تخت پر بٹھائے، ملائکہ ملکوت نے عرض کیا کہ: ''آپ زمین میں ایک ایسی ہستی کو خلیفہ بنا کر بھیجنا چاہتے ہیں جو اس میں فساد برپا کرے گی'' لطفِ قدیم نے جواب دیا: ''محبت میں مشورہ نہیں ہوتا اور عشق وتدبیر جمع نہیں ہوتے۔ تمہاری تسبیح وتہلیل کی کیا قیمت ہے، اگر ہمیں قبول نہ ہو، اور ان کو گناہوں سے کیا نقصان، اگر ہمارے لطف وعنایت کا ساقی عفو ومعافی کا پیمانہ ان کے ہاتھ پر رکھ دے[۲۱]۔''

کشف وکرامت

حضرت مخدوم یحییٰ منیری کے زمانہ میں ہر طرف کرامات کا چرچا تھا اور عوام اس کو بزرگی کی شرط اور مقبولیت کا معیار سمجھتے تھے۔ آپ اس مذاق عام اور شہرت عام کے برخلاف یہ ثابت کرتے ہیں کہ کرامات بھی اہل اللہ کے لیے حجاب اور غیر اللہ کے ساتھ مشغولی کا حکم رکھتی ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

کرامات بھی ایک بت ہے جس طرح کا فر بت سے تعلق رکھتے ہیں، دشمن ہوتے ہیں۔ جب بت سے بے تعلقی اور براءت کا اظہار کرتے ہیں، دوست بن جاتے

www.abulhasanalinadwi.org

ہیں۔ عارفوں کا بت کرامت ہے۔ اگر کرامت پر قانع اور مطمئن ہو جائیں، محجوب اور معزول ہوں اور اگر کرامات سے بے تعلقی کا اظہار کریں مقرب اور واصل [۲۲]۔

اولیاء ــــ انبیاء

پس انبیاء کی ایک سانس تمام اولیاء کی تمام زندگی اور عمر سے افضل ہے۔۔۔ پیغمبر پہلے قدم میں مقامِ مشاہدہ پر فائز ہوتے ہیں۔ جو اولیاء کی انتہاء ہوتی ہے، وہ انبیاء کی ابتداء، انبیاء کو اولیاء پر قیاس نہیں کیا جا سکتا [۲۳]۔

شریعت، طریقت

شیطان کبھی کبھی صوفیوں اور اہلِ ریاضت پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ ترکِ معصیت کا مقصد یہ ہے کہ خواہشاتِ نفس شکستہ اور صفاتِ بشریت مغلوب ہو جائیں، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی یاد ان پر غالب آ جائے، اور دل ظلمات بشریت سے خالی ذکر الٰہی کے اثر سے صاف ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں معرفتِ خداوندی کی حقیقت اس کو حاصل ہو جائے۔ شریعت کی پابندی کعبہ وصال تک پہنچنے کی ایک راہ ہے، جو شخص کعبۂ وصال کو پہنچ گیا، اس کو راستہ، توشے اور سواری کی اب کیا ضرورت ہے۔ پس شیطان اس گروہ کو یہ سمجھاتا ہے کہ اگر وہ نماز پڑھیں گے تو ان کے لیے حجاب ہو جائے گی، اس لیے کہ ان کو وصال حاصل ہو چکا ہے۔ ایسے لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو دائمی مشاہدہ میں رہتے ہیں اور نماز رکوع وسجود کا مقصود یہ ہے کہ غافل دل کو حضوری ہو جائے، ہم تو خود ایک لحہ بھر غافل نہیں ہوتے،۔۔۔ ہم کو ان عبادات اور فرائض شرعی کی کیا ضرورت ہے؟ ــــ درحقیقت یہ خود ابلیس کا حال اور اس کا واقعہ ہے۔۔۔ اس نے یہ باور کرایا کہ شریعت کا مقصود صرف اتنا ہے (کہ حضوری

www.abulhasanalinadwi.org

حاصل ہو جائے) لیکن یہ غلط ہے۔ شریعت کا اس کے علاوہ بھی مقصود ہے، مثلاً پانچ وقت کی نمازیں ایسی ہیں جیسے کسی دریچہ کمال میں پانچ کیلیں لگی ہوں۔ اگر کیلیں الگ ہو جائیں تو وہ دریچہ کمال جدا ہو کر گر جائے گا جیسے خود ابلیس گر گیا[۲۴]۔

جو شخص طریقت میں شریعت کا تابع نہیں ہوگا، اس کو طریقت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا، یہ ملحدین کا مذہب ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر جائز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حقیقت منکشف ہوگئی، شریعت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ خدا کی لعنت ہو اس عقیدہ پر، ظاہر بے باطن نفاق ہے اور باطن بے ظاہر زندقہ۔ ظاہر شریعت بے باطن نقص ہے اور باطن بے ظاہر ہوس۔ ظاہر ہمیشہ باطن کے ساتھ پیوستہ ہے، ظاہر باطن کے ساتھ ایسا پیوستہ ہے کہ کوئی شخص اس کو علیحدہ نہیں کر سکتا۔

ان کے تذکرے کے اختتام پر یہ کتاب بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اس کتاب پر جب ہم ایک تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں تو چند باتیں بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہیں۔

۱۔ اس حصہ میں ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کے مقابلہ میں تذکرۂ شیوخ وصوفیاء کا رنگ غالب ہے۔ پس منظر کو جس طرح نکھارا گیا ہے، وہ یہاں مفقود ہے۔ نہ معلوم مولانا علی میاں نے اپنے اسٹائل کو کیوں تبدیل کر دیا؟ اس تبدیلی نے کتاب کی قدر و قیمت کو کم کر دیا ہے اور پہلی دو جلدوں سے کاٹ دیا ہے۔

۲۔ کتاب کو بغور پڑھنے کے بعد قاری اپنی ممدوح شخصیات سے کچھ واقف ہو جاتا ہے، مگر ان کے کارنامے کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا۔ ان حضرات کا نقشۂ حیات پر کیا اثر پڑا اور زندگی کے دریا کا رخ انہوں نے کس طرح موڑا۔ یہ بنیادی سوال ایک راز ہی رہتا ہے اور یہ زیر تبصرہ کتاب کی بڑی خامی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

۳- مولانا علی میاں نے ''مقدمہ'' میں دوسرے تذکروں کی جو خامیاں بیان کی ہیں، وہ خود اپنے اس تذکرہ کو ان سے پوری طرح پاک نہیں رکھ سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صوفیاء کرام نے دعوت دین کا کام بڑی حد تک کرامات کے زور پر کیا۔ ہم کرامات کے منکر نہیں، لیکن ہمارے ان محسنوں کے ساتھ یہ کوئی انصاف نہیں کہ ان کی دعوت اور ان کے سلسلہ کی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں کو تو لے لیا جائے اور ذاتی اخلاق اور کرامات کو مسخر کرنے والی اصل قوت کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ علی میاں کی مشکلات کا ہمیں اندازہ ہے۔ مواد کی کمی کا بھی ہمیں احساس ہے، لیکن اس سنگلاخ زمین پر ان سے ہمیں اس سے بہتر کی توقع تھی۔

۴- اس تذکرہ میں اقتدار سے صوفیائے کرام کے تعلقات کا ذکر جس طرح آیا ہے، وہ بھی تسلی بخش نہیں۔ اول تو یہ پہلو ہے ہی بہت مختصر اور ضمنی، پھر اس سلسلہ میں کوئی متعین رویہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ کہیں اقتدار سے بے تعلقی ہے تو اس کے ساتھ دعا گو ہونے کا اظہار بھی ہے، پھر اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اسلام کے تقاضے کیا ہیں؟ اس کی کوئی نشاندہی نہیں ملتی۔ حکام اگر صوفیاء کرام کو بلاتے ہیں تو وہ اس طرف توجہ نہیں کرتے جو بات بعد میں حضرت مجددؒ الف ثانی کے احوال میں ملتی ہے، اس کی کوئی جھلک اس دور کے تذکرہ میں نہیں ملتی۔ مزید برآں محترم اس مشکل سے نبرد آزما بھی نہیں ہوئے۔ اس بات کو نظر انداز کر دینے سے وہ سوالات حل نہیں ہو سکتے جو فطری طور پر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔

۵- کتاب کے دائرہ کو ہندوستان تک محدود کر لینا بھی محل نظر ہے۔ اس زمانے میں باقی عالم اسلام بالکل مردہ نہیں تھا۔ خصوصیت سے اسپین اور مشرقی افریقہ۔ ان تمام علاقوں سے کلی طور پر صرف نظر کر لینا نا قابل فہم ہے۔

ان تمام خامیوں کے باوجود کتاب بے حد مفید اور ہمارے لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب کہ کوئی ایک مستند کتاب بھی اس موضوع پر مشکل سے ملتی

www.abulhasanalinadwi.org

ہے۔

ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے، فاضل مؤلف کے قلم میں بڑی شگفتگی ہے، لیکن محبت وعقیدت جھلکتی ہے، اسی لیے کہیں کہیں رعایت بھی برت گئے ہیں۔

حواشی

۱- تاریخ دعوت وعزیمت، جلد سوم، لکھنؤ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، دارالعلوم ندوۃ العلماء، ۱۹۶۳ء، ص ۱۴

۲- ایضاً، ص ۲۲

۳- سجزی کو "سنجری" پڑھا جانے لگا اور اب یہی مشہور ہے، لیکن اصل لفظ وتلفظ سجزی ہے۔ اس کی پوری تحقیق مولانا علی میاں نے پیش کی ہے۔ ملاحظہ ہو: حوالہ مذکورہ، ص ۲۴

۴- ایضاً، ص ۲۷

۵- ایضاً، ۴۷

۶- ایضاً، ص ۱۲۴

۷- ایضاً

۸- ایضاً، ص ۱۲۵

۹- ایضاً، صفحات ۱۳۱-۱۳۲

۱۰- ایضاً، ص ۱۶۶

۱۱- ایضاً، ص ۲۱۱

۱۲- ایضاً، صفحات ۲۱۱-۲۱۲

۱۳- ایضاً، ص ۲۱۴

۱۴- ایضاً، ص ۲۱۰

۱۵- "شیخ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔"

۱۶- تاریخ دعوت وعزیمت، حوالہ مذکورہ، جلد سوم، ص ۲۱۰

۱۷- ایضاً، ص ۲۰۲

www.abulhasanalinadwi.org

۱۸- ایضاً،ص۲۰۴

۱۹- ایضاً،صفحات۲۵۰-۲۵۱

۲۰- ایضاً،ص۲۶۵

۲۱- ایضاً،صفحات۲۶۸-۲۶۹

۲۲- ایضاً،صفحات۲۹۱-۲۹۲

۲۳- ایضاً،ص۳۰۲

۲۴- ایضاً،صفحات۳۰۴-۳۰۵

۲۵- ایضاً،ص۳۰۹

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

سفیر اختر

برصغیر کی تحریکِ اصلاح و جہاد

سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی و تصنیفی کاوشوں کا ایک موضوع

اٹھارہویں صدی عیسوی میں برصغیر کا مسلم معاشرہ بتدریج ان خصائص سے محروم ہوتا چلا گیا جو کارگاہِ حیات میں کسی قوم کی سرخ روئی اور کامرانی کے ضامن ہوتے ہیں، اور یہ سلسلۂ تنزل انیسویں صدی کے وسط تک چلتا رہا، حتیٰ کہ برائے نام مسلم اقتدار کی بساط بھی لپیٹ دی گئی۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ معاشرے میں علم و عمل کے لحاظ سے ہر سطح پر تاریکی اور تیرگی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اہل اللہ کی خانقاہوں میں ''رونق'' کے ساتھ کہیں کہیں زیاں کا احساس موجود تھا، اور اہلِ مدرسہ کے ہاں مٹتی ہوئی مسلم شناخت کو اجالنے کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اس تناظر میں جو تحریکیں ابھریں، ان میں سے ایک سید احمد شہید کی ''تحریک اصلاح و جہاد'' تھی۔ اس تحریک کی صف اول کی قیادت میدان جہاد میں نبرد آزمائی کے حوصلوں اور صلاحیتوں ہی کی مالک نہ تھی، بلکہ اس کا قلم و قرطاس سے بھی گہرا تعلق تھا۔ سید احمد شہید سے یادگار ''تفسیر سورہ فاتحہ'' (اُردو)، ''رسالہ حقیقت الصلوٰۃ'' [1] (اردو) اور ''رسالہ اشغال'' [2] (فارسی) سے قطع نظر ان کے مکتوبات [3] موجود ہیں جو اس تحریک کی بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھیوں میں مولانا عبدالحی بڈھانوی اور شاہ اسماعیل شہید کی تحریریں متداول ہیں۔ اس تحریک کے دوسرے نثر نگاروں اور شاعروں نے جذبۂ جہاد کے احیاء اور اصلاح معاشرہ کے لیے جو کچھ لکھا، اس کا بڑا حصہ پوری طرح محفوظ ہے۔

سید احمد شہید کے عقیدت مندوں میں والئ ٹونک نواب وزیر الدولہ (م ۱۸۶۴ء) بھی شامل تھے۔ نواب وزیر الدولہ سید صاحب کے سفرِ ہجرت میں ٹونک سے اجمیر تک ساتھ رہے تھے، جہاد

www.abulhasanalinadwi.org

میں انہوں نے ہر ممکن مدد دی تھی، اور جب سرحد پہنچنے پر سید صاحب کو امامِ جہاد بنالیا گیا تو نواب وزیرالدولہ نے بیعت نامہ لکھ کر سید صاحب کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا۔ سانحۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد نواب وزیرالدولہ نے سید صاحب کے اہل وعیال اور متعلقین کو باصرار ٹونک بلا لیا۔ یہ لوگ قافلے کی صورت میں جس محلے میں آباد ہوئے، آج تک ''محلّہ قافلہ'' کے نام سے موسوم چلا آتا ہے۔نواب وزیرالدولہ کی سید صاحب سے عقیدت ومحبت ہی تھی کہ سید صاحب اور ان کی تحریک کی ''تاریخ نگاری'' کے سلسلے میں ٹونک میں اولیں اقدامات کیے گئے۔

نواب وزیرالدولہ نے کوشش کی کہ سید احمد شہید کے رفقاء میں سے جو لوگ سانحۂ بالاکوٹ کے بعد واپس اپنے اپنے وطن آ گئے تھے، انہیں ٹونک بلوا کر ان سے سید احمد شہید اور تحریک اصلاح وجہاد کے بارے میں مستند معلومات یک جا کر لی جائیں۔نواب وزیرالدولہ کے بعد ان کے صاحبزادے نواب محمد علی خان نے یہ روایت جاری رکھی۔اس طرح تین کتابیں ''منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشھداء'' (فارسی)، ''وقائع احمدی'' اور ''مخزن احمدی'' (فارسی) لکھی گئیں۔

پہلی کتاب ''منظورۃ السعداء'' سید جعفر علی نقوی گورکھپوری کی تالیف ہے۔نقوی صاحب سانحۂ بالاکوٹ سے کوئی سوا برس پہلے جہاد کی غرض سے سرحد پہنچے تھے، مگر مشاق محرر ہونے کی وجہ سے انہیں منشی خانے سے وابستہ کرلیا گیا۔شاہ اسماعیل شہید کے کاتبِ خاص تھے۔انہوں نے والیانِ ٹونک کے ایماء پر اپنی کتاب ۵۶-۱۸۵۵ء/۱۲۷۲ھ (=تاریخ احمدیہ) میں مکمل کی۔

دوسری کتاب ''وقائع احمدی'' سید احمد شہید کے ساتھیوں اور مجاہدین کی یادداشتوں اور مشاہدات کا مجموعہ ہے۔نواب وزیرالدولہ کے ایماء پر محلّہ قافلہ کی مسجد میں شرکاء جہاد کی نشستوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ایک شخص اپنے مشاہدات بیان کرتا، اور باقی سنتے رہتے۔اگر سامعین میں سے کسی کو اختلاف ہوتا تو اس کی روایت بھی سنی جاتی۔ یہ سب روایتیں روایت کرنے والوں کے ناموں کی تصریح کے ساتھ قلمبند کرلی جاتی تھیں۔اس طرح تین چار برس (۱۲۷۲ھ/ ۵۶-۱۸۵۵ء تا ۱۲۷۴ھ/ ۵۸-۱۸۵۷ء) کے عرصے میں جو مشاہدات یک جا ہوئے انہیں ''وقائع احمدی'' کا

www.abulhasanalinadwi.org

نام دیا گیا۔

تیسری کتاب ''مخزن احمدی'' سید احمد شہید کے بڑے بھانجے سید محمد علی کی تالیف ہے۔ وہ عمر میں سید احمد شہید سے بڑے تھے اور ہجرت تک سید احمد شہید کی زندگی ان کے سامنے گزری تھی۔ سید محمد علی نے سید احمد شہید کے مختصر حالاتِ زندگی، تا ہجرت ''مخزن احمدی'' میں قلمبند کیے ہیں (تالیف: ۱۲۸۳ھ)۔ نواب محمد علی کی کوشش سے ''مخزن احمدی'' مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

نواب وزیر الدولہ نے سید شہید سے اپنی عقیدت و محبت کے تحت اپنی تالیف ''وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر'' میں اپنی وصیت کے ساتھ سید شہید اور ان کے ساتھیوں کی حکایات بھی نقل کی ہیں۔

نوابانِ ٹونک کی کاوشوں کے بعد سید احمد شہید کی سوانح میں مولوی محمد جعفر تھانیسری نے ''تواریخ عجیبہ یا سوانح احمدی'' لکھی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری تحریکِ اصلاح و جہاد کے ایک کارکن تھے، مقدمہ انبالہ (۱۸۶۴ء) میں ماخوذ ہوئے اور جزائر انڈیمان میں قید رہے تھے۔ ان کی خود نوشت ''تواریخ عجیب معروف بہ کالا پانی'' متداول ہے۔ مولوی صاحب کے اخلاص اور سید احمد شہید کے ساتھ ان کی عقیدت میں کوئی شبہ نہیں، وہ سید احمد شہید کو تیرھویں صدی کا مجدد ثابت کرنے کے لیے شاہ نعمت اللہ ولی کے قصیدے سے بھی استشہاد کرنے سے دریغ نہیں کرتے[۴]، لیکن دوسری طرف ''سوانح احمدی'' میں سید احمد شہید کے جہاد کے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا جہاد صرف سکھوں کے خلاف تھا، اور وہ انگریزوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اس ''غلط بیانی'' کو سند بہم پہنچانے کے لیے مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سید صاحب کے مکاتیب میں تحریف کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس کے ساتھ سید صاحب کی غیبت کے عقیدے کو تقویت پہنچائی ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

''سوانح احمدی'' کے ساتھ ایک اور اردو کتاب جس نے سید احمد شہید اور تحریک اصلاح و جہاد کے بارے میں چند در چند غلط فہمیاں پھیلائیں، مرزا حیرت دہلوی کی ''حیات طیبہ'' ہے۔ یہ اصلاً شاہ اسماعیل شہیدؒ کی سوانح حیات ہے، مگر اس میں سید صاحب کے حالات بھی اختصار سے آ گئے ہیں۔ مرزا حیرت دہلوی نے ''حیات طیبہ'' میں اتنے واقعات اپنی طرف سے گھڑ کر لکھے ہیں کہ مولانا غلام رسول مہر کے الفاظ میں ''یہ کتاب تاریخ نہیں، بلکہ افسانہ ہے[۵]۔''

''سوانح احمدی'' اور ''حیات طیبہ'' میں تحریک اصلاح و جہاد کے بارے میں جو تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ سید احمد شہید کا جہاد صرف سکھوں کے خلاف تھا، اسے بعد ازاں سر سید احمد خان، مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیروکاروں نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

تحریک اصلاح و جہاد کے دوسرے دور میں قیادت کا فریضہ علمائے صادق پور نے انجام دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد تاج برطانیہ نے مجاہدین کی ''سرحدی شورش'' کے خاتمے کے لیے ایک طرف عسکری مہمات روانہ کیں، اور دوسری طرف مجاہدین کو ملنے والی مسلسل کمک پر کاری ضرب لگانے کے لیے وابستگان جہاد کے خلاف مقدمات قائم کیے۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک یکے بعد دیگرے سازش کے پانچ مقدمات قائم ہوئے، علمائے صادق پور اور ان کے ساتھیوں نے جان و مال کی قربانیاں دے کر ''رسم وفا'' نبھائی، تاہم شاہ اسماعیل شہید کی ''تقویۃ الایمان'' اور امام محمد بن عبدالوہاب کی ''کتاب التوحید'' کے درمیان جوہری اشتراک کے تحت جو مخالفت شروع ہوئی تھی، علمائے صادق پور کے عمل بالحدیث نے معترض طبقے کو اس حوالے سے مزید متشدد کر دیا تھا۔ اس تناظر میں ''وہابیت'' اور تحریک اصلاح و جہاد لازم و ملزوم بن گئے اور برطانوی افسران نے ''تحریک اصلاح و جہاد'' پر جو کچھ لکھا، اس میں سید احمد شہید کی تحریک کو امام محمد بن عبدالوہاب کی تحریک کا شاخسانہ قرار دے دیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

''مخزن احمدی'' (فارسی) کے مایوس کن اختصار اور ''سوانح احمدی'' (اردو) کی غلط بیانیوں سے بچتے ہوئے، بیسویں صدی کے آغاز یا نصف اول میں تحریک اصلاح و جہاد کے بارے میں اچھی رائے رکھنے والوں کا بھی بوجوہ یہ تأثر تھا کہ تحریک میں بنیادی مقام تو شاہ اسماعیل شہیدؒ کا ہے، مگر مصلحتاً خانوادۂ رسول کا فرد ہونے کے سبب سید احمد شہید کو آگے کر دیا گیا تھا[6]، اور جو حضرات سید احمد شہید کی صلاحیتوں کے قدرے معترف تھے، وہ تحریک میں ''شہیدین'' یعنی سید احمد اور شاہ اسماعیل کی مشترکہ قیادت کی بات کرتے تھے[7]۔

تحریک اصلاح و جہاد پر تصنیف و تحقیق کی یہ کیفیت تھی جب ۱۹۳۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو ''نوجوان'' اساتذہ نے ''یہ ارادہ کیا کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید --- کی چلائی ہوئی تحریک تجدید وامامت کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے، ایک نے حضرت سید صاحب کی سیرت اپنے ذمہ لی اور دوسرے نے بالاکوٹ کے مشہد سے اپنا سفر شروع کرنے کا ارادہ کیا[8]۔'' دار العلوم ندوۃ العلماء کے یہ ''نوجوان'' اساتذہ دو دوست مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) اور سید ابوالحسن علی ندوی (م ۱۹۹۹ء) تھے۔ دونوں کو تحریک اصلاح و جہاد سے لگاؤ تھا۔ ''بہار'' کے وطنی تعلق اور علمائے صادق پور سے ذہنی قربت کے باعث مولانا مسعود عالم ندوی نے تحریک جہاد کے دوسرے دور کو اپنی جولاں گاہ تحقیق بنایا، جب کہ سید ابوالحسن علی ندوی نے سید احمد شہید سے نسبی اور خاندانی تعلق، نیز سید احمد شہید کی مساعی سے اپنی نسبتاً زیادہ واقفیت کے تحت تحریک جہاد کے اولیں دور پر قلم اٹھانا پسند کیا۔

سید ابوالحسن علی ندوی نے سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں کی مساعی جمیلہ کے بارے میں اپنے سن شعور کے آغاز میں اپنے خاندان کے ایک بزرگ سید خلیل الدین کی زبانی بہت کچھ سنا تھا۔ سید خلیل الدین کے دادا مولوی سعید الدین مرحوم سید احمد شہید کے مرید تھے۔ سید سعید الدین کے بڑے بھائی مولانا سید محمد ظاہر حسنی سید شہید کے خلفاء میں سے تھے۔ سید خلیل الدین نے اپنے

www.abulhasanalinadwi.org

دادا اور ان کے بھائی کو دیکھا تھا۔ جس طرح بزرگوں نے سید احمد شہید کو دیکھا تھا، اسی طرح تذکرہ خیر چوتھی نسل تک منتقل کیا گیا۹۔

اس امر کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز تحریک جہاد کے بانی کی سوانح سے کیا تھا۱۰، اور ان کی آخری کاوشوں میں اسی تحریک کی بنیادی کتاب ''تقویۃ الایمان'' کا عربی ترجمہ وحواشی (بنام ''رسالۃ التوحید'') شامل ہیں۱۱۔

سید ابوالحسن علی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھ رہے تھے کہ مولانا محی الدین احمد قصوری کا ایک مضمون ''تیرہویں صدی کا مجدد اعظم'' مولانا داؤد غزنوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ ''توحید'' (امرتسر) میں بالاقساط شائع ہوا۔ مولانا ندوی نے عربی میں اس کی تلخیص وترجمہ کیا اور علامہ رشید رضا مصری کو اشاعت کے لیے بھیج دیا، جو پہلے ''المنار'' میں، اور پھر ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے نام سے بصورت کتابچہ شائع ہوا۔

سید احمد شہید سے تعلق خاطر اس وقت مزید مضبوط تر ہو گیا جب سید ابوالحسن علی ندوی کو اپنے والد ماجد سید عبدالحی رائے بریلوی کا سفرنامہ ''ارمغانِ احباب'' پڑھنے کا موقع ملا (تالیف: ۱۳۱۲ھ/ ۹۵-۱۸۹۴ء)۔ ''اس وقت تک سید صاحب کے بعض دیکھنے والے بقید حیات تھے، اور وہ لوگ تو بکثرت تھے جو سید صاحب کے رفقاء واصحاب کی صحبت سے مشرف ہوئے تھے، [مولانا عبدالحی] نے ان سے جو کچھ سنا ہے، بے تکلف اور سادہ طریقے پر اس کو نقل کر دیا ہے۱۲۔'' اس سفرنامے کے پڑھنے سے سید ابوالحسن علی ندوی کے دل ودماغ پر سید صاحب کی غیر معمولی شخصیت کا نہایت گہرا اثر پڑا تھا۔

بہر حال ۱۹۳۵ء میں جب دو دوستوں (سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندوی) نے تحریک اصلاح وجہاد پر لکھنے کا ارادہ کیا تو مولانا مسعود عالم ندوی کے الفاظ میں ''دونوں نے اپنا اپنا کام شروع کیا، ان میں جو باہمت، صاحب دل اور سراپا اخلاص وجہاد تھا، اس نے 'سیرت سید

www.abulhasanalinadwi.org

احمد شہید' مرتب کر لی (۱۹۳۹ء) [۱۳]" مولانا سید سلیمان ندوی نے دیباچہ لکھا اور "ہندوستان کے غربت کدے میں" مسافر اسلام کی روداد بیان کرتے ہوئے اپنے شاگرد کی کاوش کی ان الفاظ میں داد دی: "یہ [تحریک اصلاح و جہاد] مسلمانوں کی ایک عظیم الشان تحریک تھی جس کی کھل کر پوری تاریخ لکھنی بھی اب سے پہلے مشکل تھی، اس کے متفرق مضامین رسالوں اور کتابوں میں بکھرے [ہوئے] تھے۔ کچھ معلومات بزرگوں کے سینوں اور کچھ قلمی کتابوں کے دفینوں میں بند تھے۔ ان سب کو سمیٹ کر ایک دفتر میں فراہم کرنا بھی ایک کام تھا۔ ہم کو خوشی ہے کہ --- مولوی سید ابوالحسن علی حسنی ندوی --- نے بڑی کوشش سے ان متفرق معلومات کو یکجا کیا ہے اور اس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ تاریخی داستان کے بجائے نوجوان مسلمانوں کے لیے عملی روح کا سامان بن گیا ہے [۱۴]۔"

"سیرت سید احمد شہید" کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ "پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا --- دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا اور اس کے ختم ہو جانے میں بھی دیر نہیں لگی [۱۵]۔" اس کے بعد سید ابوالحسن علی ندوی کو سید احمد شہید کے حالات و وقائع اور ان کے رفقاء کے سیر و سوانح کا ایک بڑا غیر مطبوعہ ذخیرہ ہاتھ آیا، چنانچہ کتاب کی معلومات و مضامین میں خاصا اضافہ کیا گیا اور کتاب دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ پہلے حصے میں سید احمد شہید کے سفرِ حج (۱۸۲۴ء) تک کے حالات دیے گئے اور باقی حالات دوسرے حصے کے لیے الگ کر لیے گئے، مگر ۱۹۴۹ء کے تیسرے ایڈیشن کا صرف پہلا حصہ ہی چھپ سکا، دوسرے حصے کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اس سارے عرصے میں کتاب میں اضافہ اور ردوبدل کا عمل بھی جاری رہا، اور کتاب کے چوتھے ایڈیشن کا پہلا حصہ ۱۹۵۸ء میں چھپا تو اس حال میں کہ معتد بہ اضافوں کے پیش نظر اسے "بعض حیثیتوں سے مستقل تصنیف کہنا بے جا نہ ہوگا [۱۶]۔" اس دفعہ پہلے حصے میں ہجرت سرحد سے لے کر بیعت امامت تک واقعات آ گئے تھے۔ کتاب کا دوسرا حصہ بہت دیر بعد ۱۹۷۴ء میں سامنے آ سکا۔

www.abulhasanalinadwi.org

''سیرت سید احمد شہید'' شائع ہو چکی تھی کہ تحریک اصلاح و جہاد کے دوسرے نامور مورخ مولانا غلام رسول مہر (م ۱۹۷۱ء) نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ یوں تو ان کے اپنے بقول انہوں نے ۱۹۳۴ء میں سید صاحب اور تحریک مجاہدین کے احوال و وقائع کی ترتیب کا مولانا محمد بشیر شہید کے ساتھ وعدہ کیا تھا، مگر ۱۹۳۹ء تک اس سلسلے میں وہ کوئی کام نہ کر سکے تھے۔ جب مولانا مہر نے کام شروع کیا تو انہوں نے اپنے ''پیش رو'' سے مسلسل رابطہ رکھا۔ سید ابوالحسن علی کے الفاظ میں، مولانا مہر کو سید احمد شہید کے

> خاندانی حالات، رائے بریلی کے مقامات، سید صاحب کے شجرۂ نسب، اور خاندانی قرابتوں کے متعلق کوئی بھی مشکل پیش آتی یا کسی بات کا سمجھنا ہوتا جو خاندانی کاغذات یا خاندانی واقفیت کے بغیر سمجھ میں نہیں آ سکتی تو فوراً مجھے خط لکھتے۔ بالعموم ''سید صاحب'' لکھ کر بات شروع کر دیتے، ان کے ایسے خطوط درجنوں کی تعداد میں ہوں گے جو ان کے سوالات و استفسارات پر مشتمل ہیں[17]۔

مولانا مہر نے تحریک جہاد کے حوالے سے صوبہ سرحد کے چپے چپے کا سفر کیا تھا، اور دس دس بارہ بارہ گھروں کی آبادی تک سے واقف تھے، مگر انہوں نے کبھی رائے بریلی کا سفر نہ کیا، تاہم وہ تکیہ شاہ علم اللہ جانے والے راستوں سے واقف تھے، اور جانتے تھے کہ اس علاقے کا کون سا موضع کہاں واقع ہے۔ غالباً مطالعے کے ساتھ سید ابوالحسن علی ندوی کی مراسلت و معاونت بھی ان کی معلومات کا بڑا ذریعہ تھی۔ مولانا مہر نے اپنی تالیف ''سید احمد شہید'' کے دیباچے اور مراجع کے تعارف میں سید ابوالحسن علی ندوی کی علمی معاونت کا ذکر کیا ہے[18]، اسی طرح انہوں نے اس کتاب کی سرگزشتِ ترتیب بیان کرتے ہوئے ''سید ابوالحسن کی مہربانی'' کا ذیلی عنوان دے کر اظہارِ تشکر کیا ہے[19]۔

مولانا مہر کی کتاب شائع ہونے پر سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کتاب کے اقتباسات نقل کر کے اس کی چھ نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ ان کی رائے میں کتاب کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کو صاحب سوانح سے بڑا گہرا تعلق اور ان کے فکر و عمل پر پورا اعتماد ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنف پوری تحریک اصلاح و جہاد میں سید احمد شہید کو مرکزی شخصیت سمجھتے ہیں، تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اپنی تحقیق سے واضح کیا ہے کہ سید صاحب کا مقصدِ جہاد برصغیر میں ایک اسلامی حکومت کا قیام تھا، اور ان کے اصل حریف انگریز تھے۔ کتاب کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جناب مصنف نے اسماء و مقامات اور سنین کے تعین کے بارے میں بے پناہ دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب میں سرحد میں سید صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں کو پوری تفصیل کے ساتھ تاریخی تناظر میں سمجھا گیا ہے، چھٹی اور آخری خصوصیت کتاب کی ادبیت اور اس کی شگفتگی ہے[۲۰]۔

مولانا مہر کو ان کی کاوش پر بھرپور خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد سید ابوالحسن علی ندوی نے بلا تکلف ان پہلوؤں کی جانب بھی توجہ دلا دی جن کے بارے میں انہیں ''تھوڑی سی تشنگی محسوس ہوئی'' تھی۔ کتاب پر تبصرے کے اس حصے سے سید ابوالحسن علی ندوی کے ''داعیانہ'' اندازِ فکر و نظر پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس پر ایک نظر ڈال لینا غیر مفید نہ ہوگا۔

(۱) کتاب کے آغاز میں اس کی ضرورت تھی کہ عالم اسلام اور خاص طور پر ہندوستان کی دینی، اخلاقی، اجتماعی اور سیاسی حالت کا نقشہ پیش کیا جاتا تا کہ پڑھنے والے کو اس کا اندازہ ہوتا کہ عالمِ اسلام اور اس کے ایک اہم ترین حصہ ہندوستان کا دینی، اخلاقی تنزل اور سیاسی انتشار کس درجہ کو پہنچ چکا تھا، اور معلوم ہوتا کہ سید صاحب جیسے داعی اور مصلح کو کتنا بڑا اصلاحی اور انقلابی کام کرنا تھا اور ان کی عزیمت و عظمت کا صحیح مقام کیا ہے؟۔۔۔۔

(۲) دوآبہ کے تبلیغی دورہ کے (جو خاص اہمیت رکھتا ہے) واقعات و تفصیلات بہت کم ہیں، خصوصاً وہ واقعات جن کا تعلق سید صاحب کی تربیت اور تزکیہ اور ہدایت و تاثیر سے ہے۔ یہ واقعات بڑے موثر اور مفید ہیں، یہ باب کتاب میں بہت مختصر طریقہ پر آیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

(۳) سفر ہجرت کے بعد وہ واقعات و جزئیات جن سے سید صاحب کی آدم گری و مردم سازی اور جماعت کی اخلاقی بلندی اور اخلاص وللہیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے کسی قدر کم ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ تاریخ کے سلسلہ میں واقعات کا قلب و دماغ پر جو اثر پڑتا ہے وہ دلائل وعقلیات کا نہیں پڑتا۔ اس حصہ میں کافی اضافہ کی گنجائش ہے اور سید صاحب کے حالات کے قدیم ذخیرہ میں بہت بڑا قابل انتخاب مواد موجود ہے جس میں بجلی کی تاثیر اور بے انتہا دلکشی و دلآویزی ہے۔

(۴) اخلاق وعادات اور خصوصیات کا باب بہت تشنہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہر صاحب کو اس کے الحاق کا خیال اخیر میں ہوا۔۔۔ضرورت تھی کہ سید صاحب کی وہ صفات اور خصوصیات بالاستقلال لکھی جاتیں جن سے معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی دل و دماغ، عزم و حوصلہ، اخلاص وللّٰہیت کا مقام عطا فرمایا تھا۔ ان کے اخلاق اور ان کا مزاج و مذاق، اخلاقِ نبوت اور مزاج و مذاقِ نبوی سے فطری مناسبت رکھتا تھا اور ان میں شریعت کی اصطلاح و مفہوم کے مطابق ایک ''امام'' کی بہترین صفات پائی جاتی تھیں[۶۱]۔۔۔

سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تالیف ''سیرت سید احمد شہید'' کا چوتھا ایڈیشن مرتب کرنے میں مولانا مہر کی کتاب سے استفادہ کیا ہے، تاہم اپنی کاوش اور مولانا مہر کے وقیع کام کے باوجود ان کی رائے یہی تھی کہ ''تحقیق وجستجو کا کام برابر جاری رہتا ہے اور ہر تصنیف و تحقیق کے بعد اہل طلب و اہل ہمت کے کانوں میں یہ صدا آتی رہتی ہے کہ

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است[۶۲]''

''سیرت سید احمد شہید'' کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سید احمد شہید کے مشہور خلفاء اور

www.abulhasanalinadwi.org

اکابر جماعت کا تذکرہ آخری باب میں مرتب کیا گیا تھا، مگر تیسرے ایڈیشن میں اسے الگ کرلیا گیا۔ اس عرصے میں مولانا مہر کی کاوش کا تیسرا حصہ ''جماعت مجاہدین'' کے نام سے شائع ہوگیا (۱۹۵۵ء)۔ اس میں ''سید احمد بریلوی کی جماعت کے تنظیمی حالات اور ان اکابر رفقاء کے سوانح حیات'' درج کیے گئے ہیں جو سید صاحب کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے یا جنہوں نے بعد ازاں جہاد میں کوئی حصہ نہ لیا۔'' اسی طرز پر سید ابوالحسن علی ندوی کا مرتب کردہ باب ''کاروانِ ایمان وعزیمت'' کے نام سے چھپا (۱۹۸۰ء)۔ مولانا مہر کی ''جماعت مجاہدین'' اور سید ابوالحسن علی ندوی کی ''کاروانِ ایمان وعزیمت'' لکھنے والوں کے مزاجی فرق کے ساتھ سوانحی پہلو سے ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔

تحریکِ اصلاح وجہاد کے حوالے سے سید ابوالحسن علی ندوی کی تیسری کتاب ''اذاھبت ریح الایمان'' (عربی) ہے۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے تحریک اصلاح وجہاد کی اثر انگیز تاریخ ہلکے پھلکے انداز میں عربی میں اس طرح مرتب کرنا شروع کی تھی کہ مبالغہ اور رنگ آمیزی کے بغیر اصل واقعات سادگی سے پیش کر دیے جائیں تاکہ ''اس تحریک کے قائد کا اصل مرتبہ ومقام عرب دوستوں کے سامنے آجائے اور ان کو اندازہ ہو کہ ان [سید احمد شہید] کو اللہ تعالیٰ نے کیسی وہبی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں اور ان کے گرد کیسے طاقت ور عناصر جمع تھے۔ تربیت اور تزکیہ نفس کے شعبہ میں، نیز اخلاص، دعوت میں فنائیت اور مقصد سے عشق میں ان کا مقام کتنا بلند تھا۔ اس سے ان کو اس مومن اور مجاہد، اس نسل کے اعلیٰ کردار، اخلاقی بلندی اور سیرت کی پختگی، نیز ان کے پیرووں اور متبعین میں اسلامی دعوت اور ایمانی تربیت کے نمایاں اثرات کا بھی اندازہ ہو جو ان کی کوششوں کے نتیجہ میں تیار ہوئی تھی[۲۳]۔''

اس عربی کتاب کو مولانا ندوی کے برادرزادے مولوی محمد الحسنی نے اردو کا جامہ پہنایا اور ''جب ایمان کی بہار آئی'' نام رکھا۔ مترجم نے قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر آغاز کتاب میں سید

www.abulhasanalinadwi.org

احمد شہید کی سیرت پر ایک مضمون شامل کر دیا ہے۔

تحریک اصلاح و جہاد کے حوالے سے سید ابوالحسن علی ندوی کا آخری کام ''تقویۃ الایمان'' کا عربی ترجمہ اور اس پر حواشی ہیں۔ حواشی میں ان رسوم و عادات اور مقامات کی وضاحت کی گئی ہے جن کی تفہیم عام، اور بالخصوص عرب، قارئین کے لیے مشکل ہے، نیز کتاب کے جن اقتباسات پر سخت اعتراض کیے گئے اور مخالفت کی آواز بلند ہوئی، ان کی تائید میں دیگر اہل علم و دانش کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ ''تقویۃ الایمان'' پر مولانا کا مقدمہ اور حواشی اردو میں بھی منتقل کیے جا چکے ہیں[۲۴]۔

سید ابوالحسن علی ندوی نے تحریک اصلاح و جہاد پر قلم اٹھا کر واضح کیا ہے کہ:

- سید احمد شہید اور ان کے ساتھیوں کا مقصود محض پنجاب میں مسلمانوں پر سکھوں کے ظلم و ستم کا سد باب کرنا نہ تھا، بلکہ خلافت اسلامیہ کا احیاء اور حکومت علی منہاج النبوۃ کا قیام اور تاسیس ان کے پیش نظر تھی۔
- انہوں نے پشاور اور اس کے اطراف میں ایک اسلامی حکومت قائم کر کے حدود شرعیہ جاری کیں اور اسلام کا مالی و دیوانی نظام قائم کر دیا تھا، لیکن مقامی قبائل، اپنی ذاتی اغراض اور مفادات کی تنگنائیوں سے باہر نہ دیکھ سکے، اور قبائلی رسم و رواج کی خاطر اسلامی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

سید ابوالحسن علی ندوی مزاجاً بزرگوں کے کارناموں پر ''تنقید'' اور ''کڑی تنقید'' کے آدمی نہ تھے، اس لیے ''سیرت سید احمد شہید'' میں انہوں نے دین سے محبت، اخلاص، ایثار و قربانی، مجاہدے اور جان فروشی کی مثالیں تو پیش کی ہیں، مگر تحریکِ اصلاح و جہاد کے کارکنوں کی ''کمزوریوں'' پر گفتگو نہیں کی، اس لیے سید ابوالحسن علی ندوی کے ''بے باک'' دوست مولانا مسعود عالم ندوی نے کتاب کے پہلے ایڈیشن کے بعد لکھا تھا:

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب (سیرت سید احمد شہید) سید صاحب کی سوانح، ان

www.abulhasanalinadwi.org

کی تعلیمات اور مشن پر بے مثال کتاب ہے اور اب تک [۱۹۴۹ء] اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، سب پر بھاری ہے، مگر افسوس کہ میرے عزیز ترین دوست اور مخلص بھائی کا طریق نظر وفکر خالص عقیدت مندانہ ہے اور انہوں نے بزرگوں کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں سے نگاہ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی ہے ۲۵۔

اس ''سخت تنقید'' کے باوجود یہ کہنا چنداں غلط نہ ہوگا کہ تحریک اصلاح وجہاد کے تمام مورخین — مولانا غلام رسول مہر، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر قیام الدین احمد، ڈاکٹر صادق حسین وغیرہ — میں سید ابوالحسن علی ندوی ہی واحد قلم کار ہیں جو تحریک اصلاح وجہاد کے تینوں نمایاں پہلوؤں یعنی قیام حکومتِ اسلامی، اصلاح عقائد ومعاشرت، اور تصوف سے یکساں دلچسپی رکھتے تھے۔

حواشی

۱- ''تفسیر سورہ فاتحہ'' اور ''رسالہ حقیقت الصلوٰۃ'' سید احمد شہید کی زندگی میں شائع ہو گئے تھے۔ ان کے تعارف اور اشاعتِ جدید کے لیے دیکھیے: محمد عبدالحلیم چشتی، سید احمد شہید کی اردو تصانیف ---، کراچی: الرحیم اکیڈمی (۱۹۸٦ء)، نیز ان کتابوں کے محض تعارف کے لیے دیکھیے: محمد ایوب قادری، اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ (۱۹۸۸ء)، صفحات ۱۱۲-۱۲۳

۲- ''رسالہ اشغال'' کا فارسی متن شائع نہیں ہوا۔ سید نفیس الحسینی نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ لاہور: مکتبہ محمودیہ (۱۹۷۸ء)

۳- ''مکاتیب سید احمد شہید'' کے خطی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء کے مکتوبہ ایک خطی نسخے کا عکس شائع ہو چکا ہے۔ لاہور: مکتبہ رشیدیہ (۱۹۷۵ء)

۴- محمد جعفر تھانیسری، تائید آسمانی در ردِ نشانِ آسمانی، لاہور: المکتبۃ السلفیہ (۱۹۷۹ء)۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے دعووں کی تائید میں شاہ نعمت اللہ ولی کے قصیدے سے استشہاد کیا تھا۔ محمد جعفر تھانیسری نے مرزا صاحب کے رسالہ ''نشانِ آسمانی'' کی تردید کرتے ہوئے سید احمد شہید کو قصیدے کا مصداق قرار دیا ہے۔

۵- غلام رسول مہر، سید احمد شہید، لاہور: کتاب منزل (س-ن)، ص ۲۲

٦- مرزا حیرت دہلوی نے شاہ اسماعیل شہید کی سوانح حیات ''حیات طیبہ'' میں یہ اندازِ نظر اختیار کیا ہے۔ مولانا

www.abulhasanalinadwi.org

ابوالکلام آزاد بھی شاہ اسماعیل شہید کو تحریک اصلاح و جہاد کا محور خیال کرتے ہیں۔ دیکھیے: تذکرہ، کلکتہ: البلاغ پریس (۱۹۱۹ء)، صفحات ۲۴۵-۲۴۶

۷- سید سلیمان ندوی، ''مقدمہ'' سیرت سید احمد شہید (مولفہ سید ابوالحسن علی ندوی)، لکھنؤ: مولانا محمد ناظم ندوی، دارالعلوم ندوۃ العلماء (۱۳۶۸ھ)، سید ابوالاعلیٰ مودودی، تجدید و احیائے دین، لاہور: اسلامک پبلی کیشنز (۱۹۷۶ء)، صفحات ۱۱۴-۱۳۰

۸- مسعود عالم ندوی، محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح، حیدرآباد دکن: مکتبہ نشاۃ ثانیہ (۱۹۴۷ء)، ص ۱

۹- سید ابوالحسن علی ندوی، ''دیباچہ طبع چہارم'' سیرت سید احمد شہید، کراچی: ایچ-ایم سعید اینڈ کمپنی (۱۹۷۵ء)، ص ۱۳

۱۰- ایضاً، صفحات ۱۳-۱۴

۱۱- ''رسالۃ التوحید'' کو بعد ازاں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نصاب میں شامل کر دیا گیا۔

۱۲- سید ابوالحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، حوالہ مذکورہ، ص ۱۴

۱۳- مسعود عالم ندوی، محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح، حوالہ مذکورہ، ص ۲

۱۴- سید سلیمان ندوی، مقدمہ سیرت سید احمد شہید، اشاعت لکھنؤ، حوالہ مذکورہ، ص ''ٹ''

۱۵- ایضاً، ص ''ا''

۱۶- سید ابوالحسن علی ندوی، ''دیباچہ طبع چہارم'' سیرت سید احمد شہید، حوالہ مذکورہ، ص ۱۳

۱۷- سید ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ، حصہ دوم، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام (۱۹۸۱ء)، ص ۱۹۵

۱۸- غلام رسول مہر، سید احمد شہید، حوالہ مذکورہ، ص ۸، نیز ص ۱۵

۱۹- غلام رسول مہر، ''سید احمد شہید (ایک کتاب کی سرگزشتِ ترتیب)''، ماہنامہ ''ماہ نو'' (کراچی)، اکتوبر ۱۹۶۴ء، ص ۵۷

۲۰- سید ابوالحسن علی ندوی، [تعارف و تبصرہ]، سید احمد شہید (تالیف چودھری غلام رسول مہر)، ماہنامہ ''الفرقان'' (لکھنؤ)، ربیع الاول ۱۳۷۵ھ، صفحات ۳۸-۴۹

۲۱- ایضاً، صفحات ۵۰-۵۱

۲۲- سید ابوالحسن علی ندوی، ''دیباچہ طبع چہارم'' سیرت سید احمد شہید، حوالہ مذکورہ، ص ۱۸

www.abulhasanalinadwi.org

۲۳- سید ابوالحسن علی ندوی، جب ایمان کی بہار آئی، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام (س-ن)، ص ۳

۲۴- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حواشی کے ساتھ ''تقویۃ الایمان'' مختلف ناشرین نے شائع کی ہے۔ مکتبہ خلیل-لاہور (۱۹۹۹ء) کی اشاعت کے تعارف اور تبصرے کے لیے دیکھیے: ششماہی ''نقطہ نظر'' (اسلام آباد)، شمارہ ۷-۸، بابت اکتوبر ۱۹۹۹ء-ستمبر ۲۰۰۰ء، صفحات ۳۳-۳۴

۲۵- مسعود عالم ندوی، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، راولپنڈی: مکتبہ ملیہ (۱۹۴۹ء)، ص ۱۴

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

محمد صدیق خان شبلی

نقوشِ اقبال

سید ابوالحسن علی ندوی کی اقبال شناسی پر ایک نظر

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جیسے بلند پایہ عالم ومفکر کی موت اسلامی دنیا کے لیے ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔ اس پر کسی ایک ملک سے نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام سے تعزیت کی جانی چاہیے۔ ساری دنیائے اسلام میں ان کے تبحر علمی، اصابت رائے اور بلندی کردار کا اعتراف کیا جاتا رہا ہے، اور اسی بناء پر انہیں بے حد احترام وعقیدت نصیب ہوا۔ اسلام اور مسلمان ہمیشہ ان کی تقریر وتحریر کے محور ومرکز رہے۔ اُنہوں نے مسلمانوں کے ذہن اجالنے کے کام کو ایک مقدس مشن سمجھ کر انجام دیا، اپنی ساری زندگی اسی مشن میں صرف کر دی۔ قرآن وحدیث، تاریخ و تہذیب، مذہب وتمدن، تصوف وسلوک، تبلیغ ودعوت، مشرق ومغرب، سیر وسوانح ان کے محبوب موضوع تھے۔ انہوں نے اپنی شاہکار تصانیف انہی موضوعات پر پیش کیں۔

علامہ اقبال پر انہوں نے ایک کتاب ''روائع اقبال'' کے نام سے عربی زبان میں تحریر کی۔ یہ کتاب مقالات کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کا مقصد اقبال اور فکر اقبال کو عربوں میں روشناس کرانا تھا۔ اسی عربی کتاب کا اردو ترجمہ ''نقوش اقبال'' کے نام سے شائع ہوا۔ ترجمہ مولانا کی نظر سے گزرا اور اسے ان کی تائید بھی حاصل ہے۔ ''نقوش اقبال'' میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ اس کا ایک مقالہ ''کلام اقبال میں تاریخی حقائق واشارات'' تو مولانا کے قلم سے اردو ہی میں نکلا ہے۔

مولانا کی عرب ممالک میں آمد ورفت رہتی تھی، اس کے علاوہ بہت سے عربی مجلات بھی ان

www.abulhasanalinadwi.org

کے پاس آتے تھے، انہیں اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ان مجلّات اور عربوں کی علمی مجالس میں ٹیگور کا ذکر زیادہ ہوتا تھا۔ مصر وشام وغیرہ کے عرب ادیب ٹیگور کے گرویدہ تھے، لیکن یہ لوگ اقبال سے متعارف نہیں تھے۔ اس صورت حال نے مولانا کو عالم عرب میں اقبال کو روشناس کرانے پر آمادہ کیا، علاوہ ازیں ایک عرب ادیب علی طنطاوی نے دمشق کے مجلّہ ''المسلمون'' میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک کھلا خط شائع کیا جس میں انہیں اس کام کی طرف متوجہ کیا۔ مولانا نے انہی تقاضوں کے پیش نظر اقبال پر عربی میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ یہ مضامین مصر وشام کی علمی مجالس میں پڑھے گئے، عربی مجلّات میں شائع ہوئے اور ریڈیو سے نشر بھی ہوئے۔ ''روائع اقبال'' انہی مضامین پر مشتمل ہے۔

ان مضامین کے اولین مخاطب چونکہ عرب تھے، اور وہ اقبال اور فکر اقبال سے شناسائی نہیں رکھتے تھے، اس لیے مولانا نے ''روائع اقبال'' میں کلام اقبال کے ان حصوں کو خصوصیت سے شامل کیا جو عربوں سے متعلق تھے، مثلاً ''مسجد قرطبہ''، ''ذوق وشوق''، ''طارق کی دعا''، ''ابوجہل کی نوحہ گری''، ''بلاد عربیہ کے نام'' اور ''حرفے چند باامت عربیہ'' کے عربی میں نثری تراجم دیے گئے ہیں۔ سوانح وفکر اقبال کے ساتھ ساتھ اقبال کی چند شاہکار نظموں کے عربی میں ترجمے سے اقبال کا تعارف مکمل اور موثر انداز میں ہوا ہے۔

اقبال پر عربی زبان میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

شرق اوسط میں مغربی فلسفہ وتہذیب کے حد سے بڑھے ہوئے اثرات میری نظر میں تھے، اور میں دیکھتا تھا کہ عالم اسلامی وعربی کس طرح جاہلیت قدیمہ وجدیدہ کے دوراہے پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں ایک طرف حد سے بڑھی ہوئی قومیت ہے تو دوسری سمت اشتمالیت واشتراکیت ---، لیکن وہاں ایسے اہل قلم نایاب ہوتے جارہے ہیں جو --- اپنی تمام فکری صلاحیتوں کو اس جاہلیت کے خلاف جنگ میں صرف کر دیتے ---، جو اس فکری ارتداد کے خلاف صف آرا ہو جاتے جو تعلیم یافتہ طبقہ کو اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

گرفت میں لیتا جا رہا ہے۔

مولانا نے اس مسموم اور مکدر فضا کے اثرات کو فکر اقبال کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کی۔ ''روائع اقبال'' کو عرب دنیا میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ کتاب کی اس مقبولیت کے پیش نظر اس کے اردو ترجمہ پر اصرار کیا گیا، لیکن مولانا اس کے لیے راضی نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ اردو میں اقبالیات کا ایک وقیع سرمایہ موجود ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اس کتاب کے ترجمے کی ضرورت نہیں۔ مولانا اس کو مبتدیانہ نوعیت کی کتاب سمجھتے تھے، لیکن یہ ان کی خاکساری اور کسر نفسی تھی۔ یہ کتاب ایک بلند پایہ عالمِ دین کے قلم سے نکلی تھی، جس نے اقبال کے افکار کو پوری دیانت داری اور صحت کے ساتھ بغیر کسی الجھاؤ کے پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ''نقوش اقبال'' کے نام سے ''روائع اقبال'' کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو علمی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا نے فکر اقبال کا جائزہ اپنے مخصوص زاویہ نظر سے لیا تھا، اور فکر کا یہ زاویہ اقبال کی سوچ سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ مولانا نے فکر اقبال پر نہ تو حاشیے چڑھائے ہیں اور نہ اسے کسی پہلے سے تیار چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا ندوی نے اقبال کے حالاتِ زندگی کی تصویر ایک ماہر مصور کی طرح کھینچی ہے، زیادہ تفصیل میں جائے بغیر اقبال اور اس کے عہد وآثار کو موثر انداز میں پیش کر دیا ہے۔

اقبال کا ذہنی ارتقا بہت سے اقبال شناسوں کی توجہ کا موضوع رہا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر'' کے عنوان سے اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ خارجی کے ساتھ ساتھ داخلی عوامل پر بھی زور دیتے ہیں، بلکہ انہیں زیادہ اہم قرار دیتے ہیں۔ داخلی عوامل ان کے نزدیک وہ داخلی مدرسہ ہے جس میں اقبال کی شخصیت کی تشکیل ہوئی۔ ان میں سے پہلا عنصر ایمان وعشق کا ہے، ایمان اسلام کی حقانیت پر اور عشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ۔ مادیت کے اس دور میں اسی ایمان وعشق کی بدولت اقبال کے پائے استقامت لغزش سے محفوظ رہے، اور انہی دو کی بدولت اقبال کے کلام میں یہ جوش، یہ ولولہ اور یہ

www.abulhasanalinadwi.org

سوز و گداز پیدا ہوا۔ اقبال کی شخصیت کو بنانے والا دوسرا عنصر مولانا کے نزدیک قرآن مجید ہے۔ اقبال کی زندگی پر یہ زندہ کتاب جس قدر اثر انداز ہوئی ہے، کسی اور کتاب نے انہیں اتنا متاثر نہیں کیا۔ ان کی پوری زندگی حکمت قرآن پر غور و فکر کرتے گزری۔ مولانا عرفان نفس یا خودی کو اقبال کی تعمیر شخصیت میں تیسرا عنصر قرار دیتے ہیں۔ جب تک انسان کو عرفان نفس حاصل نہ ہو، اس وقت تک اس کی زندگی میں نہ سوز و مستی ہے اور نہ جذب و شوق۔ وہ چوتھا عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کو پروان چڑھایا، اقبال کی آہ سحر گاہی اس کا سرچشمہ ہے۔ اس سے فکر اقبال کو ایک نئی توانائی حاصل ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی کے نزدیک ''مثنوی مولانا روم'' وہ پانچواں عنصر ہے جس سے اقبال کی شخصیت نے جلا پائی۔ مولانا نے اقبال کے ذہنی ارتقا میں کارفرما جن عناصر کی نشاندہی کی ہے، ہمارے اکثر اقبال شناسوں کا ذہن ان تک نہیں پہنچا۔

مولانا کی اپنی دینی بنیاد چونکہ مضبوط تھی، اس لیے انہوں نے اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر کا تجزیہ اسی حوالے سے کیا ہے۔

مولانا مغربی تہذیب و ثقافت پر اقبال کی تنقید کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں گزشتہ صدی میں جدید طبقے کے اندر ان سے بڑا کوئی دوسرا دیدہ ور پیدا نہیں ہوا جس نے اس جرأت مندی کے ساتھ مغربی تہذیب کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا ہو۔ اقبال کو پورا یقین ہے کہ مغربی تہذیب کی تقلید نہ ممالک اسلامیہ کے مسائل حل کر سکتی ہے اور نہ ان میں نئی زندگی کی کوئی روح ہی پھونک سکتی ہے، بھلا جو تہذیب اپنی موت آپ مر رہی ہو، وہ دوسروں کو کب زندگی دے سکتی ہے۔ اقبال خود مغرب کے تعلیمی نظام کے پروردہ تھے اور دانش حاضر کے عذاب سے گزرے تھے، اس لیے اس نظام پر ان کی تنقید زیادہ معتبر نظر آتی ہے

اقبال کے انسان کامل کی توضیح کرتے ہوئے مولانا نے بڑے اہم نکتے بیان کیے ہیں۔ ان کے خیال میں اقبال کا انسان کامل ایک سچا اور مثالی مسلمان ہے۔ یہ انکشاف واقعی چونکا دینے والا ہے، کیونکہ اس موضوع پر اقبال شناسوں نے بڑی نکتہ طرازیاں اور فلسفہ بافیاں کی ہیں اور ان سب

www.abulhasanalinadwi.org

کے پیش نظر یہ آئیڈل، انسان کی پہنچ سے بالکل باہر ہو جاتا ہے، اوراس سے انسانوں کی دلچسپی اس میں کم ہو جاتی ہے، لیکن مولانا کی تعبیر اس تصور کو ماورائیت کے دھندلکوں سے نکال کر سامنے لاتی ہے، اوراسے پرکشش بناتی ہے۔اقبال کے اس مردمومن کو اس کے ایمان ویقین کی ناقابل تسخیر قوت اپنے ہم جنسوں سے ممتاز کر دیتی ہے۔مولانا اس انسان کے وجودِ ایمانی کو اس کے وجود انسانی پر ترجیح دیتے ہیں، اوراسی سے دنیا کی بقا وابستہ ہے۔مولانا، اقبال کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

مولانا فرماتے ہیں، رومی کے زمانے میں مطلق العنان شخصی سلطنتوں کے مظالم اور مسلسل جنگوں کے نتیجے میں لوگوں کے اندر زندگی سے بیزاری، مستقبل کے بارے میں مایوسی اور نفی ذات کے رجحانات پیدا ہو گئے تھے۔رومی کی توانا شاعری نے ان رجحانات کا قلع قمع کیا اور لوگوں کے اندر زندگی سے محبت اور رجائی رویوں کو فروغ دیا۔نئی تہذیب اوراس کے لادین فلسفے سے جو حیات کش رجحانات پیدا ہوئے، اقبال کی شاعری نے رومی کی طرح انہیں ختم کیا، اور دنیا کو امید کا پیغام دیا۔انسان کو خوداعتمادی کا درس دیا۔اقبال کی یقین آفرینی نے انسان کو اپنے بے پناہ امکانات کی طرف متوجہ کیا۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے عرب مخاطبین کو علامہ کی بعض نظموں سے متعارف کرایا ہے۔ان میں ''ذوق وشوق''، ''مسجد قرطبہ''، ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' شامل ہیں۔یہ تینوں نظمیں ایک طرف اقبال کے شاعرانہ فن کا شاہکار ہیں تو دوسری طرف پیام اقبال کی بہترین ترجمان ہیں۔''ذوق وشوق'' اور ''مسجد قرطبہ'' کی داخلی فضا عربوں کے لیے خصوصیت سے بڑی پرکشش ہے۔مولانا نے ان نظموں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا۔

ان نظموں میں اقبال کے فکروفن کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔''پس چہ باید کرد'' میں اقبال نے

www.abulhasanalinadwi.org

ایک نظم ''حرفے چند با امت عربیہ'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ مولانا نے اس نظم کو بھی اپنے عرب قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اقبال نے اس نظم میں عربوں کے بارے میں اپنی جن نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے، مولانا نے انہیں اجاگر کیا ہے۔ اقبال نے عربوں کی عظمت وفضیلت کا اعتراف کیا ہے، اور انہیں مغربی تہذیب اور فرنگی سیاست کی فریب کاریوں سے خبردار کیا ہے۔ مولانا ندوی نے اس نظم کے مطالب کا تجزیہ بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی بنیادی طور پر ایک عالم دین تھے، اور بلاشبہ ان کی تصانیف کی ایک عالمانہ شان ہے، ان میں حقائق کی جمع آوری، ان کا تجزیہ وتحلیل اور معروضی نتائج کا استخراج ملتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ پائے کے ادیب بھی تھے، ان کی تحریروں میں تحقیق کی خشکی کی جگہ ادب کی چاشنی ملتی ہے۔ خطابت اور ادبیت کی خصوصیات نے ان کی نثر کو دلکش اور موثر بنا دیا ہے۔ مولانا کا ایک شاہکار ادبی مضمون ''اقبال فی مدینۃ الرسول'' ہے۔ مولانا ''ارمغان حجاز'' کو اقبال کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے خیالی سفر کی روداد قرار دیتے ہیں، اور انہوں نے ''ارمغان حجاز'' کے مختلف حصوں سے اقبال کے اس روحانی سفر کی تفصیل مرتب کی ہے، اور ہر حصے کو بڑے دلکش بیانیوں کے ساتھ دوسرے سے مربوط کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے ارمغان کی ڈرامائی تشکیل ہے جو مولانا کے ذہن رسا اور توانا تخیل کا ثمر ہے۔

دینی حلقے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی پہلے بلند پایہ عالم ہیں جو اقبال سے متاثر ہوئے اور ان کے بقول ''ان کی نشوونما اس عہد میں ہوئی جب اقبال کا فن شہرت کے بام عروج پر پہنچ چکا تھا، اقبال کا اپنے عہد پر جو اثر تھا اس کی مثال کسی زمانے کے شاعر وادیب میں نہیں ملتی''۔ مولانا کو فکر اقبال اس لیے پسند ہے کہ وہ بلند نظری، عالی حوصلگی اور احیائے اسلام کی دعوت دیتا ہے، اور تعمیر انفس وآفاق کے لیے ابھارتا ہے، وہ مہر ووفا کے جذبات کو غذا دیتا ہے، ایمانی شعور کو بیدار کرتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ان کے پیغام کی آفاقیت وابدیت پر ایمان کو مستحکم کرتا ہے۔

مولانا دوبارا اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اقبال کے ساتھ ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء

www.abulhasanalinadwi.org

میں ہوئی جب ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ ان کی دوسری ملاقات ۱۹۳۷ء میں علامہ کی وفات سے چند مہینے پہلے ہوئی۔ یہ طویل ملاقات تھی اور علامہ نے شعر جاہلیت، یونانی فلسفہ الٰہیات، یورپ کی ترقی، عجمی تخیلات، صوفیہ کے غلو سے لے کر ہندوستان میں اسلام کی تجدید و احیاء اور مسلمانوں کے آزاد وطن کی ضرورت تک بہت سے موضوعات پر اظہار خیال فرمایا۔ ان ملاقاتوں سے اقبال کے ساتھ مولانا کی ارادت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر چہ مولانا نے اقبال پر مستقل کتاب تو ایک ہی لکھی ہے، لیکن ان کی بعض کتابوں پر اقبال کے اثرات یا کم از کم ان کے فکری اشتراک کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ ''تاریخ دعوت و عزیمت'' مسلمانوں کی فکری تاریخ ہے۔ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر''، ''تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات''، ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' اور ''قادیانیت'' ایسے موضوعات ہیں جن سے اقبال کو بھی دلچسپی رہی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا کی نثر میں شعر اقبال کی گونج سنائی دیتی ہے۔

''نقوشِ اقبال'' کا کینوس بظاہر محدود نظر آتا ہے اور اس کے مخاطب بھی مخصوص تھے، اس کے باوجود اس کتاب میں فکر اقبال کے تمام اہم مباحث آ گئے ہیں۔ یہ کتاب اقبال کے تمام قارئین کے لیے یکساں مفید ہے اور مولانا کی اقبال شناسی کا فیض سب تک پہنچ رہا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

نصر اللہ خان عزیز

قادیانیت: مطالعہ و جائزہ

چند یادیں

ہندوستان کے مشہور عالم دین اور مبلغ اسلام مولانا سید ابوالحسن ندوی، معتمد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ نے ابتداء میں ''القادیانی والقادیانیہ'' کے نام سے ایک کتاب عربی زبان میں لکھی تھی۔اس کتاب کا مقصد یہ تھا کہ ممالکِ عرب کے باشندوں کو قادیانی تحریک کے مضمرات و نتائج سے آگاہ کیا جائے، جہاں قادیانی مبلغ قادیانیت پھیلانے میں سرگرم ہیں اور اس مذہب کو اس رنگ میں پیش کرتے ہیں، گویا وہی اصل اسلام ہے۔

مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نے اس کی تالیف کی فرمائش کی تھی اور خود مصنف نے بھی اس کی ضرورت اس وقت محسوس کی تھی، جب لاہور میں اسلامک کلوکیم (مجلس مذاکرات اسلامی) کے سلسلہ میں عرب کے علماء تشریف لائے تھے، اور اُنہوں نے اس تحریک کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔بعد میں اس کتاب کو اُردو کا جامہ پہنا کر'' قادیانیت۔مطالعہ و جائزہ'' کے عنوان سے شائع کر دیا گیا۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں تحریک کا زمانہ، اس کا ماحول اور اس کی بنیادی شخصیتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔یہ باب تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نور الدین بھیروی کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔دوسرے باب میں مرزا صاحب کے عقائد اور ان کی دعوت کے تدریجی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔یہ باب خصوصی اہمیت رکھتا ہے،

www.abulhasanalinadwi.org

کیونکہ اس تدریجی ارتقاء ہی سے اس تحریک کے بطلان پر سب سے زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ دعوتِ حق ابتداء سے ایک ہی اصول پر مبنی ہوتی ہے، لیکن جو شے خدا کی طرف سے نہ ہو، بلکہ اس میں انسان کا اپنا نفس شامل ہو وہ لو کان من عند غیر اللہ لوجد وا فیہ اختلافا کثیر ا کی مصداق ہوتی ہے، اور یہ بات اس تحریک پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ چنانچہ خود اس تحریک کے متبعین کے دو گروہوں میں کوئی ۵۰ برس سے جو اصولی مناقشت چلی آ رہی ہے اور ہر فریق اپنے حق میں جو خود بانی تحریک ہی کی عبارتوں کو پیش کر رہا ہے، تو یہ اس امر کی نا قابلِ تردید شہادت ہے کہ دعوت نے تدریجی ارتقاء کیا اور جن باتوں کو ایک وقت میں کفر اور دجل سے تعبیر کیا گیا تھا، بعد میں اُنہی کو دعوے کی بنیاد بنایا گیا۔

تیسرے باب میں مرزا صاحب کی سیرت و زندگی پر تبصرہ ہے، اور چوتھے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ قادیانیت کی تحریک کے مضرات کیا ہیں۔ یہ ایک مستقل مذہب اور متوازی امت کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ نبوتِ محمدیؐ کے خلاف ایک بغاوت ہے اور اس سے عالمِ اسلام میں اختلاف وافتراق کا مستقل بیج بو دیا گیا ہے۔

پوری کتاب بڑے پاکیزہ اور مصلحانہ جذبے کے ساتھ اور شریفانہ طرزِ بیان میں لکھی گئی ہے۔ اس کے استدلال کا جواب دینا سہل نہیں، کیونکہ یہ مناظرانہ رنگ سے ہٹ کر محققانہ انداز کی تصنیف ہے، چنانچہ قادیانی جماعت کے ترجمان ''الفضل'' نے پورا ایک ماہ اس کا جواب دینے میں صرف کر دیا اور وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ سکا جو اس کے اثر کو زائل کر سکے، بجز اس الزام کے کہ اس کی تالیف و تصنیف میں مصنف نے براہ راست قادیانی لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا، بلکہ پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم کی کتاب '' قادیانی مذہب'' ہی کے مطالعہ پر اکتفاء کیا ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے بھی بڑی سنگین تھی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''حرف گفتنی'' [دیباچہ] میں اس امر کا دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی تیاری کے لیے پہلی مرتبہ براہ راست قادیانی لٹریچر کا مفصل مطالعہ کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی الحقیقت اگر ایک دینی مصنف کے متعلق یہ بات ثابت ہو جائے کہ اس نے کھلم کھلا غلط بیانی کی ہے تو اس کی تصنیف کا وقار ختم ہو جاتا ہے۔ اپنے الزام کو ثابت کرنے کے لیے "الفضل" نے یہ بھی لکھا کہ اسلامک کلوکیم دسمبر ۱۹۵۷ء کے اواخر اور جنوری ۱۹۵۸ء کے اوائل میں بمقام لاہور منعقد ہوا تھا، جس کے بعد یہ کتاب لکھی گئی اور کہا گیا کہ:

> شرق اوسط کی سیاحت اور مصر و شام کے قیام کے دوران میں اگر چہ بار ہا اس ضرورت کا خود احساس ہوا تھا، لیکن اس کی طرف توجہ کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ موضوع افتادِ طبع اور اس وقت تک کی ذہنی تربیت کے خلاف تھا۔ مصنف کا ذوق اس وقت تک قادیانی لٹریچر اور خود مرزا صاحب کی تصنیفات کے مختصر سے مختصر حصے کے مطالعہ کے لیے بھی کبھی آمادہ نہیں ہو سکا تھا اور وہ اس کوچہ سے یکسر نابلد تھا، لیکن اس تحریک نے (جس کی تعمیل عین سعادت تھی) اس موضوع کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے کی تقریب پیدا کر دی۔ چند ہی دن میں قیام گاہ کا ایک کمرہ قادیانی لٹریچر کا کتب خانہ اور دار التصنیف بن گیا اور پوری یکسوئی اور انہماک کے ساتھ یہ کام شروع ہوا۔ ایک مہینہ اس علمی و تصنیفی اعتکاف میں اس طرح گزرا کہ گویا دنیا کی خبر نہ تھی اور سوائے اس موضوع کے کوئی دوسرا موضوع فکر نہ تھا۔

لیکن "الفضل" نے الزام لگایا کہ مولانا کا یہ بیان غلط ہے، وہ اس سے قبل قادیانیت کے متعلق ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے تھے۔ یہ رسالہ اُنہوں نے ۱۹۵۳ء کی تحریکِ ختم نبوت کے بعد لکھا تھا جو مالیگاؤں ضلع ناسک (ہندوستان) کے ایک مطبع نے چھاپا تھا اور ۱۹۵۴ء میں قادیانی مبلغین مقیم شام کو دستیاب ہوا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ الزام بڑا سنگین تھا اور "القادیانی و القادیانیہ" اور اس کے اردو ترجمے 'قادیانیت' کے مصنف کی اخلاقی دیانت پر نہایت سخت حملہ تھا، اور اس طرح "الفضل" نے کم از

www.abulhasanalinadwi.org

کم اپنے حلقے کے لوگوں میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کو بے اعتبار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہو گی۔ خود ان سطور کے راقم کو بھی یہ پڑھ کر سخت ذہنی خلفشار ہوا اور اس نے آغاز ۱۹۶۰ء کی کسی تاریخ میں ایک خط مولانا ابوالحسن علی ندوی کو لکھا اور اس الزام کی وضاحت طالب کی، اور پھر یاددہانی کے لیے ایک اور خط تحریر کیا۔ ان کے جواب میں مولانا نے جو مکتوب تحریر فرمایا، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ جس سے قادیانیوں کے اندازِ استدلال اور اسلوبِ تحقیق ونظر کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

نوساری، ضلع سورت

۲۱ اپریل ۱۹۶۰ء

محبّ گرامی قدر زید لطفہ

السلام علیکم و رحمۃ اللہ! دونوں گرامی نامے ملے۔ یاد آوری کا شکر گزار ہوں۔

''الفضل'' میری نظر سے نہیں گزرتا۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے وہ پرچہ بھیج دیا تھا جس میں کتاب پر افتتاحیہ تھا اور جس کا عنوان تھا: ''اندازِ تحقیق''۔ اس کے بعد کوئی پرچہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ دونوں باتوں کے متعلق عرض ہے کہ:

ا۔ یہ واقعہ ہے کہ عربی کتاب ''القادیانی والقادیانیہ'' جس کا ترجمہ ''قادیانیت'' ہے، سے پہلے مجھے براہ راست قادیانی لٹریچر کے مختصر سے مختصر مطالعہ کا بھی موقع نہیں ملا اور کبھی ذوق آمادہ نہ ہوا کہ مرزا صاحب یا ان کے متبعین کی کوئی کتاب پڑھوں۔ یہ ''ہفت خواں'' صرف اس کتاب کی تالیف کی ضرورت سے سر کرنا پڑا اور بلا مبالغہ ہزاروں صفحات پڑھے۔ مرزا صاحب کی کوئی اہم کتاب مطالعہ سے باقی نہیں رہی۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ میرے ذاتی مطالعہ اور فکر کا نتیجہ ہے اور ہزاروں صفحات کا خلاصہ۔ ''القادیانیہ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیہ'' کوئی مستقل تصنیف نہیں۔ اصلاً یہ ایک خط ہے جو میں نے صحیح حالات سے مطلع کرنے کے لیے اپنے مصری اور شامی

www.abulhasanalinadwi.org

احباب کے نام لکھا تھا، پھر اس کو ایک رسالے کی شکل دے کر شائع کر دیا۔ اس خط کی تحریر کے وقت میرے سامنے صرف مولانا مودودی کا ''قادیانی مسئلہ''، برنی صاحب کا ایک مضمون اور علامہ اقبال مرحوم کا انگریزی مضمون تھا، جو انہوں نے جواہر لال نہرو اور ''اسٹیٹسمین'' کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا، اس لیے ''القادیانی'' (عربی) اور ''قادیانیت'' (اردو) میں میرا یہ کہنا صحیح اور مطابقِ واقعہ ہے کہ اس کتاب سے پہلے مجھے قادیانی لٹریچر پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

باقی رہا یہ امر کہ یہ کتاب تمام تر ''قادیانی مذہب'' سے ماخوذ اور اس کی نقل ہے تو جو شخص دونوں کتابوں کو پڑھے گا، وہ اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ میری کتاب بہت سی حیثیتوں سے اوریجنل ہے اور اپنے بعض انکشافات اور تحقیقات میں منفرد ہے۔ مصنف نے اپنا اخلاقی فریضہ ادا کرنے کے لیے برنی صاحب مرحوم کی کتاب کی رہنمائی اور اس سے استفادہ کا ذکر کر دیا۔ قادیانی سہولت پسندوں نے اسی کو پکڑ لیا اور جواب کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے یہی کہنا آسان سمجھا کہ ''یہ کتاب محض 'قادیانی مذہب' کی نقل ہے۔''

میں نے مختصر عربی رسالہ ''القادیانیہ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیہ'' کا ایک نسخہ رجسٹری سے آپ کو بھجوایا ہے، تاکہ آپ اس کو خود ملاحظہ فرما سکیں۔

اُمید ہے، مزاج بخیر ہوں گے۔ ایک طویل و مسلسل سفر میں ہوں، اس لیے اتنا ہی عرض کر سکا۔

مخلص

ابوالحسن ندوی

یہ مکتوب ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء کو مل گیا تھا اور عربی رسالہ بھی، لیکن اس موضوع کا تذکرہ کرنے

www.abulhasanalinadwi.org

کی نوبت نہ آئی۔ ''الفضل'' نے جوشوشہ چھوڑا تھا اور جس کی حقیقت اس مکتوب سے واضح ہو جاتی ہے، اپنی نوعیت کے اعتبار سے معمولی نہیں تھا، بلکہ قادیانی علم کلام کے دوسرے حربوں کی طرح ناواقفوں کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان سطور کے راقم کو بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی سے اس کی فتنہ انگیزی کی وجہ سے وضاحت طلب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی بھی ایک حد تک اس الزام سے متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے ''صدق جدید'' کے ایک شذرے میں جہاں ''قادیانیت'' پر رائے ظاہر کی، وہاں حسب عادت بلطائف الحیل اس شبہ کی اشاعت بھی کر دی اور لکھا کہ اگر مصنف اصل قادیانی کتابوں کا حوالہ دے دیتے تو بہتر ہوتا۔ (اس وقت ''صدق جدید'' کا وہ پرچہ سامنے نہیں، اس لیے اصل الفاظ یہاں درج کرنے سے قاصر ہوں، تاہم مولانا کے الفاظ کا مفہوم یہی تھا اور اُن سے جو تأثر متبادر ہوتا تھا، وہ یہی تھا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اصل لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا، یا بہت کم کیا ہے، اور غالباً ''قادیانی مذہب'' ہی پر اکتفاء کیا ہے۔) حالانکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ''حرف گفتنی'' میں صاف لکھا ہے کہ:

> پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم کی کتاب ''قادیانی مذہب'' نے مصنف کی ابتدائی رہنمائی کی اور اس کتاب کی ترتیب کا خاکہ بنانے میں بڑی مدد ملی۔ اگرچہ مصنف نے منقولات و اقتباسات پر اکتفاء نہیں کیا اور مرزا صاحب اور قادیانی جماعت کی تصنیفات کا براہ راست اور بطورِ خود مطالعہ کیا، پھر بھی اس جلیل القدر کتاب سے بہت سے قادیانی مآخذ کا علم ہوا اور یکجا بہت سے معلومات حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دینی حمیت اور علمی خدمت قبول فرمائے اور ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

اور اپنی کتاب میں جا بجا اصل کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ ''قادیانی مذہب'' کا حوالہ صرف چھ سات مرتبہ آیا ہے اور وہ بھی ایسے مقامات پر جہاں اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ورنہ پوری کتاب کے ہر صفحہ پر اصل قادیانی لٹریچر کا حوالہ دیا گیا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جلیل احسن ندوی

مختارات

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ''علماء'' کا مقصد آفرینش امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں، اور یہ وہ پیغمبرانہ فریضہ ہے جس کے لیے شوخ مذہبی رنگ، بڑھتا ہوا ذوق وشوق، بے داغ سیرت، اعلیٰ کیرکٹر، بلندئ ہمت، استغناء، خود داری، نزاہت نفس اور نزاہت فکر عناصر جوہریہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت دنیا میں اصول ونظریات کی شدید جنگ ہو رہی ہے، اور مستقبل قریب میں اس سے زیادہ سخت معرکہ میں اس ''طائفہ'' کو اترنا اور اپنے اصول منوانا ہیں۔ اگر اس وقت ذرا سی بھی غفلت برتی گئی تو یقیناً تاریخ ہمیں ہزاروں میل دور پیچھے پھینک دے گی۔

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ زبان وادب کو کسی تمدن کی تعمیر وتشکیل میں بڑا مقام حاصل ہے، آپ دنیا کی لسانی وتمدنی تاریخ پڑھ جایئے، آپ پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جائے گی کہ صالح لٹریچر ہمیشہ صالح افراد کی تخلیق کرتا ہے، اور فاسد ادبی سرمایہ بہت تیزی کے ساتھ، مگر غیر محسوس طور پر، قوم کے افراد میں بے شمار اخلاقی معائب اور ذہنی تسفل پیدا کر کے اس کی اجتماعی زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیتا ہے۔

پھر کون نہیں جانتا کہ پختہ سیرت اور عمدہ کیرکٹر پیدا کرنے کا ایک بڑا اور اہم ذریعہ تعلیم ہے، اسی لیے تعلیم اور نصاب تعلیم کا مسئلہ زندہ قوموں کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، ان کے اہل علم مفکرین برسوں کے طویل غور وفکر کے بعد ایسا نصابِ تعلیم بناتے ہیں جو نئی نسل میں زندگی کی روح پھونکنا اور عمل کی قوت پیدا کرتا ہے، مگر بدقسمتی سے یہ مسئلہ دوسروں کے یہاں جتنا اہم ہے، ہمارے یہاں اتنا ہی غیر اہم اور ناقابل التفات بنا ہوا ہے۔ بہت سے دردمند علماء اور اصحابِ رائے مدت سے چیخ رہے ہیں، مگر ہنوز ان کی آواز صدا بہ صحرا اور اجنبی ہی ہے، لیکن میں اس حقیقت پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہوں کہ یہ ہلکی آواز جسے آج کوئی نہیں سنتا، کل اس میں اتنی قوت پیدا ہو جائے گی کہ اس سے ہماری پوری علمی فضا گونجنے لگے گی، ٹیونس کے مشہور لیڈر کواکبی کی یہ بات کبھی نہ بھولیے: صيحة في وادٍ لئن ذهبت بها الريح اليوم لتغاهبن غداً بالاوتاد

ہمارے مدارس کا نصاب تعلیم مجموعی طور پر ناقص ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ وہ ''ترمیم'' کا محتاج ہے یا ''تغییر'' کا؟ اس پر اس مختصر فرصت میں مجھے کلام کرنا نہیں ہے، ہاں اس کے خاص ادبی شعبے کے متعلق یہاں مجھے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ خصوصیت کے ساتھ وہ بے حد ناقص ہے اور اس کی اصلاح کی طرف فوری توجہ کرنا ازبس ضروری ہے جو لوگ ''ادب برائے ادب'' کا نظریہ رکھتے ہیں، ممکن ہے انہیں اس میں کوئی خامی نظر نہ آتی ہو، لیکن ہمارا نظریہ ''ادب برائے اسلام'' اور ''ہر فن برائے اسلام'' کا ہے، وہ ادب یا کوئی دوسرا فن جس کا بہاؤ اسلامیت کی طرف نہ ہو، ہماری ادنیٰ توجہ کا بھی مستحق نہیں۔

''نفحۃ الیمن'' [اور] ''مقامات حریری''

ہمارے سامنے ادب النثر کے سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب ''نفحۃ الیمن'' آتی ہے۔ جاننے کی چیز ہے کہ یہ کتاب ایک انگریز پرنسپل کی سرپرستی میں لکھی گئی ہے، پھر اس کتاب کے مصنف نے کسی خاص اور گہرے مقصد کے پیش نظر اس میں ایسی حیا سوز کہانیاں درج کی ہیں جن کو

www.abulhasanalinadwi.org

پڑھ کر عباسی سلاطین کی زندگی کا نہایت مکروہ اور گھناؤنا نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ عباسی سلاطین چاہے کتنے ہی برے ہوں، مگر واقعتاً وہ اتنے برے پھر بھی نہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ ''یہ محشی بہ حاشیہ انیقہ'' کتاب جس میں جنسی وغیر جنسی میلانات کے عجیب عجیب قصے بیان کیے گئے ہیں، کیا اس قابل ہے کہ اس کو ''ادبِ اسلامی'' میں شمار کیا جائے؟ اور وہ بھی نوعمری میں بچوں کے ہاتھ میں دیا جائے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے دوسری نثری کتاب ''مقامات'' آتی ہے، یہاں پر سب سے اہم اور قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ تعلیمی نقطہ نگاہ سے ''نفحۃ'' کے بعد اسے پڑھانا بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی مکتب کے درجہ دوم کے طالب علم کو ''دیوان غالب'' یا ''گلزار دبستاں'' پڑھنے والے طالب علم کو ''قصائد بدر چاچ'' پڑھانا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بلاشبہ اس کتاب کے پڑھنے سے لغات غریبہ کا ایک بڑا خزانہ ہمارے ہاتھ آتا ہے، مگر سوچنا چاہیے کہ اس کا بہاؤ اسلامیت کی طرف ہے یا ''جلبِ زر کے زریں اصولوں'' کی طرف؟ فیصلہ اہل نظر کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اس نفع قلیل کے بدلے اس اخلاقی ضررِ کثیر کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟ آخر افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ پاک چشمہ ادب جس سے بلاغت کی نہریں پھوٹتی ہیں اور جس کے خوشہ چیں صاحبِ مقامات اور امت کے تمام ادباء ہیں، کہاں چلا گیا؟ کیا خلفاء راشدین اور دوسرے اربابِ بلاغت کے خطبے اور تحریریں ہمارے پاس نہیں ہیں؟ اگر اس صالح ادب کا انتخاب پڑھا جائے تو کیا ہماری ادبیت میں کوئی نقص رہ جائے گا۔

بلاشبہ ہمارے یہ مدارسِ عربیہ اسلامی تہذیب کے مضبوط قلعے ہیں، ان ہی کے ساتھ ہماری ثقافتی زندگی وابستہ ہے، صالح افراد پیدا کرنے کی ساری ذمہ داری انہیں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ان مدارس نے اپنی اس بھاری ذمہ داری کو محسوس نہ کیا تو آئندہ ہمارا تمدنی و ثقافتی مستقبل حد درجہ تاریک ہو جائے گا۔ اب سے چند سال پہلے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب نے ''نفحۃ العرب'' لکھ کر اس سلسلہ کی ایک ضرورت کو پورا کیا تھا، اب دوسری کتاب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی یہ ''مختارات'' سامنے آئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ''نفحۃ العرب'' نفحۃ الیمن کے لیے بدل

www.abulhasanalinadwi.org

صالح تھی، اسی طرح ''نفحۃ العرب'' کے بعد طلبہ کے لیے ''مختارات'' عربی ادب نثر کی ایک بہترین کتاب ہے۔ مولانا علی میاں علماء اور طلبہ دونوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب لکھ کر اس اہم تعلیمی ضرورت کو پورا کر دیا ہے، بلاشبہ یہ کتاب ان تمام نقائص سے بالکل پاک ہے جو ہماری مروجہ نثر کی کتابوں میں عموماً پائے جاتے ہیں۔ اس میں عہد رسالت سے آج تک کے تقریباً ہر دور کے ادب عربی کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، تاریخ ادب کے طلبہ جانتے ہیں کہ جاہلی نثر میں تفکیکِ جمل اور بے ربطی معنی پائی جاتی ہے، اس لیے اس کو قصداً نظر انداز کر کے ''اعجازی نثر'' سے ابتدا کی گئی ہے۔ اس کتاب کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کسی زمانہ کا کوئی ایسا ادیب اس سے نہیں رہ گیا جو کسی جدید اسلوب کا موجد ہوا ہے۔ کتاب کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جامع اپنے ''مختارات'' کے ذریعہ طلبہ کو ایک خاص مقصد کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں، اور یہ مقصد وہی ہے جو ہر مسلمان بالخصوص علماء دین کا مقصد حیات ہے، یعنی دعوتِ دین اور خدمتِ اسلام، اس دعوت و خدمت کے لیے جس سیرت، ذوقِ عمل، سوز و درد، حسن نیت اور سرفروشی کی ضرورت ہے، مولانا علی میاں یہی اوصاف ہم میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ کتاب کے ابتدائی عنوانوں ہی سے پتہ چلتا ہے۔---

www.abulhasanalinadwi.org

٣

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

خالد علوی

ایک سچا داعی اسلام

مسلمانوں کی علمی روایت کے مطابق سید ابوالحسن علی ندوی ایک وسیع الاطراف شخصیت کے حامل تھے۔ وہ ایک عالم، صوفی، داعی، مورخ، ادیب، سفرنگار اور سب سے بڑھ کر دردمند دل رکھنے والے مسلمان تھے۔ بنیادی طور پر تو وہ ندوہ کی خصوصیات کے حامل مورخ اور ادیب تھے، لیکن اس پر مستزاد بے شمار خوبیاں تھیں جن سے ان کی شخصیت مزین تھی۔ اہل ندوہ نے تاریخ اور عربی ادب میں جو مقام حاصل کیا ہے وہ برصغیر پاک و ہند کے کسی اور ادارے کے فضلاء کو حاصل نہیں۔ تاریخ نویسی اور تاریخ کی تعبیر میں جس محققانہ اسلوب کی بنیاد علامہ شبلی نے رکھی تھی، اس علمی روایت کو ندوہ نے نہ صرف مستحکم کیا، بلکہ اسے فروغ بخشا۔ علی میاں اس روایت کا درخشندہ ستارہ تھے۔ عربی زبان میں ان کی قدرتِ اظہار کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کی تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' نے عالم عرب کے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا، اب اس کتاب کی حیثیت ایک ''کلاسیک'' کی ہے جو عالمی اسلامی حلقوں میں دروس و بحوث کا حصہ ہے۔ مجھے ان کی شخصیت کے جس پہلو کے متعلق کچھ کہنا ہے، وہ دعوت الی اللہ کے میدان میں ان کی مساعی کا پہلو ہے۔

تاریخی پس منظر

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مساعی کے تذکرے سے پہلے اس تاریخی پس منظر کو دیکھ لیا جائے جس کے نتیجے میں دعوت کا خاص اسلوب اختیار کیا گیا۔ انیسویں صدی مسلمانوں کی

www.abulhasanalinadwi.org

مغلوبیت کی صدی ہے۔ یورپ کی استعماری قوتیں اعلیٰ عسکری تنظیم، بہتر اسلحے اور عمدہ تدبیر کے ذریعے مسلمان ملکوں پر تسلط حاصل کرتی گئیں اور مسلمان اقوام آہستہ آہستہ ان کی محکوم ہوتی گئیں۔ بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں میں یہ غلبہ مکمل ہو گیا اور مسلم قوت منتشر ہو گئی۔ پہلی جنگ عظیم نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے اور افریقہ کے ساتھ مشرق وسطیٰ بھی استعماری قوتوں کے زیر تسلط آ گیا۔ غالب قوتوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ عسکری و سیاسی غلبے کے بعد محکوم قوموں کو فکری اور ثقافتی لحاظ سے بھی مغلوب کرتی ہیں۔ مسلمانوں کو بھی یہ حادثہ پیش آیا۔ غیر ملکی حکمرانوں نے آہستہ آہستہ اپنا فکری اور ثقافتی نفوذ شروع کیا اور مسلمانوں کی قوتِ مدافعت کو کمزور کرنے اور ان کے جذبہ مقاومت کو سرد کرنے کی تدابیر اختیار کیں، اگر ایک طرف تعلیمی نظام اور روزگار کے مواقع مسلمانوں کو سازگاری پر آمادہ کرنے کے ذرائع تھے تو دوسری طرف شدید فکری اور انتظامی دباؤ تھا، تاکہ مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کیا جا سکے۔ مسلمانوں کے اعتماد کی دو وجوہ تھیں، ایک اسلام کی حقانیت اور دوسری اسلامی تہذیب کی اعلیٰ اقدار۔ مسلمانوں کا شاندار ماضی اس اعتماد کے لیے پشت پناہی کا کام دے رہا تھا۔ استعماری قوتوں نے مشنریوں کو تمام سہولتیں بہم پہنچائیں، تاکہ وہ مسلمانوں کو مرتد بنانے کا کام کریں، لیکن یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا تھا جب تک مسلمانوں کو یہ باور نہ کرایا جائے کہ ان کا دین، دین حق نہیں ہے، ان کی کتاب قرآن مجید کتاب الٰہی نہیں ہے اور ان کا پیغمبر سچا اور قابل اتباع پیغمبر نہیں ہے، اور جہاں تک ان کی تاریخ کا تعلق ہے تو وہ خونیں تاریخ ہے، اس میں انسانی شرافت و شائستگی کی اعلیٰ مثالیں ناپید ہیں۔ اسی پر اکتفاء نہ کیا گیا، بلکہ ہندوؤں کو شہ دی گئی کہ وہ مسلمانوں سے اپنی محکومی کا بدلہ لیں۔ مسلم تہذیب سے متمتع ہونے والے ہندو یکا یک خونخوار منتقم کی صورت اختیار کر گئے۔ مسلم ہندوستان کی تاریخ از سر نو لکھی گئی اور اس کی اساس ظالم مسلمانوں سے انتقام پر رکھی گئی۔ استعماری سکالرز نے ہندو تشخص اور ہندو ثقافت کے احیاء کی حوصلہ افزائی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندو- مسلم اختلافات اور ہندو- مسلم فسادات رونما ہونے لگے۔ آریہ سماجیوں نے قرآن کریم، حضور اکرمؐ اور مسلم تاریخ پر رکیک حملے شروع کیے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مغربی مصنفین کا نشانہ تو پہلے دن سے ہی حضور اکرمؐ کی ذات تھی۔ ان کی حکمت عملی کا اصل ہدف مسلمانوں کا اعتماد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک دفعہ مسلمانوں کو اپنے نبی پر شک پیدا ہو گیا تو اپنے ماضی پر ان کا اعتماد اٹھ جائے گا اور جب یہ ہو گیا تو ہدف نرم پڑے گا اور اسے آسانی سے ختم کیا جا سکے گا۔

جارحیت کا یہ ماحول تھا جس میں مسلم علماء و مفکرین نے اپنا کام شروع کیا۔ کچھ ایسے حضرات تھے جنہوں نے مناظرے کیے، اعتراضات کے جوابات دیے، پمفلٹ اور کتابیں لکھیں اور عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں کے اٹھائے ہوئے طوفان کا مقابلہ کیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری ان میں سے چند نام ہیں۔ بعض بزرگوں نے مسلم تاریخ کو از سر نو پیش کیا اور عظیم شخصیتوں کے بارے میں معاندین کے اٹھائے ہوئے گرد و غبار کو صاف کیا۔ حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ کو نئے اسلوب میں پیش کیا۔ علامہ شبلی، قاضی سلمان منصور پوری اور سید سلیمان ندوی جیسی شخصیتیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح تاریخ، کلام اور دعوت میں نئے اسالیب وجود پذیر ہوئے۔ اسے آپ نئی علمی و فکری تحریک کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے بازوئے شمشیر زن پر اعتماد کیا ہے اور عسکری اعتبار سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئے، لیکن ان کے لیے تاریخ کا یہ پہلا تجربہ تھا کہ وہ عسکری طور پر مکمل مغلوبیت کے عالم میں تھے۔ وہ جو اقبال نے کہا تھا۔

جہاں میں اہل ایماں صورت خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

کسی طرح درست نہیں بیٹھ رہا تھا۔ چونکہ اب عسکری طور پر غلامی سے نکلنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی، اس لیے فکری طور پر اٹھنے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا، اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ ہر عسکری غلبے کے پیچھے فکری اعتماد اور ثقافتی برتری کا احساس موجود ہوتا ہے۔ ملت اسلامیہ کے احیاء اور اس کے اعتماد کو بحال کرنے کا کام عسکریوں کی بجائے علماء و مفکرین، محققین اور دانشوروں کے کرنے کا تھا، اور بلا شبہ انہوں نے کیا۔ جن عظیم رجال نے یہ کارنامہ

www.abulhasanalinadwi.org

انجام دیا، ان میں سید ابوالحسن علی ندوی کا نام شامل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمان خوش قسمت تھے کہ اس دور میں ـــــ انیسویں اور بیسویں صدی میں ـــــ اتنی قدآور شخصیتوں کی رہنمائی انہیں حاصل رہی کہ انہیں پسماندگی کا احساس نہیں ہوا۔ علامہ شبلی، شیخ الہند محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی صرف چند نام ہیں۔

دعوت کے دو اسلوب

مسلمانوں کا مجموعی فیصلہ تو احیاءِ ملت اور استحکام ملت کا تھا، لیکن اس کے لیے کام کرنے کے دو اسلوب تھے۔ ہم انہیں دعوت اسلامی کے دو اسلوب بھی کہہ سکتے ہیں۔ مسلم رجال کار نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اسلوب کا انتخاب کیا اور پھر اس میں صلاحیتیں کھپا دیں۔ ایک کو اجتماعی کہا جا سکتا ہے اور دوسرے کو انفرادی۔ اجتماعی اسلوب کے دعاۃ خلافت اسلامیہ کے احیاء، اسلامی نظامِ حکومت اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے سرگرم عمل تھے، جبکہ انفرادی طریق کے حاملین فرد کی اصلاح، اخلاقِ فاضلہ کے حصول، تعلق باللہ کے استحکام اور آخرت کے لیے تیاری کو اپنی منزل قرار دیتے تھے۔ پہلے طبقے میں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے اگرچہ اپنی منزل تبدیل کر لی تھی، لیکن ان کے ابتدائی دور کے آہنگ کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے۔ رجوع الی القرآن، خلافتِ اسلامیہ کا تصور اور مسلمانوں کے خوابِ غفلت کا مرثیہ مولانا ابوالکلام کی صداؤں کے اہم موضوعات تھے۔ اسی دور کی سب سے بلند آواز اقبال کی ہے، اس میں قرآن سے وابستگی، حضور اکرمؐ سے محبت، اسلام کی عظمت، اسلامی تہذیب کی برتری جیسے موضوعات کے ساتھ مغربی تہذیب و تعلیم پر ناقدانہ تبصرے شامل ہیں، وہ شکستہ خاطر اور محروم و مایوس مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

www.abulhasanalinadwi.org

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے تو احیاءِ ملت کے حوالے سے ایک بلیو پرنٹ دیا اور عملاً ایک تحریک پروان چڑھائی۔ اس حوالے سے بلاشبہ بیسویں صدی اقبال اور مودودی کی صدی ہے۔ اسلامی حکومت، خلافتِ اسلامیہ، اسلامی سیاست اور اسلامی معیشت کا استحکام اور فرد کی تربیت کا اجتماعی نظام ان کے بنیادی اہداف ہیں۔

دعوت کے انفرادی اسلوب کے حاملین انفرادی اصلاح سے آغاز کرتے اور اصلاح پذیر افراد سے مسلم جمعیتیں تشکیل دیتے ہیں جو معاشرے میں خیر پھیلانے کا باعث بنتی ہیں، انہیں حکومت وسیاست سے اعتناء نہیں، ان کے ہاں اچھے مسلمان کی تیاری کا اصل حوالہ فکرِ آخرت ہے۔ افراد کی دینی تربیت میں عبادات واذکار کو اولیں اہمیت حاصل ہے اور اس کے بعد اچھے انسانوں کی مصاحبت۔ علماء وصوفیاء کی بڑی تعداد نے اس اسلوبِ دعوت کو صدیوں سے اپنایا اور آزمایا ہے۔ یہ اسلوبِ دعوت اسلام کی بقا اور مسلمانوں کے دینی وروحانی استحکام کا ذریعہ رہا ہے۔ برصغیر میں اسے ایک منظّم صورت دینے اور مرتب پروگرام بنانے کا کام مولانا محمد الیاس نے کیا۔

سید ابوالحسن علی ندوی

سید ابوالحسن علی ندوی نے اس بحرانی دور میں شعور کی آنکھیں کھولیں جس میں مسلمان سرگرداں تھے۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں جہاں ان کے خاندان کے علمی وروحانی ماحول کا دخل تھا، وہاں ندوہ کی علمی تحریک بھی اثر انداز تھی۔ تاریخ اور عربی زبان وادب سے شغف نے انہیں ہندوستان سے باہر عالم اسلام سے منسلک کیا، ان کا ذہنی افق وسیع ہوا اور انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو عالمی تناظر میں دیکھا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے باشعور مسلمان اس فکر میں تھے کہ یہاں کے مسلمانوں کے مسائل کو کس طرح حل کیا جائے۔ تحریکوں، ہنگاموں اور سرگرمیوں کا یہ عہد

www.abulhasanalinadwi.org

ہر شخص کو جذب کر رہا تھا اور ہر سوچنے سمجھنے والا انسان اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی بساط کے مطابق مصروفِ عمل تھا۔ سید ابوالحسن علی جیسے حساس انسان کا حالات سے اثر پذیر ہونا ایک بدیہی امر تھا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مضامین نے مستقبل کے کام کا جو نقشہ تجویز کیا تھا، اس کے ساتھ فکری ہم آہنگی انہیں جماعت اسلامی میں لے گئی۔ وہ اگرچہ جماعت میں زیادہ دیر نہ رہے، تاہم ملت اسلامیہ کے اجتماعی مسائل اور ان کے ملی تشخص کے حوالے سے ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مجھے ان کی تصانیف سے استفادے کا موقعہ ملا ہے اور یورپ و امریکہ میں ان کے خطابات بھی سنے ہیں، میں نے ان میں واضح طور پر تحریکی تصور اور غلبہ اسلام کے عوامل و امکانات کو نمایاں دیکھا۔ سید مودودی کے تصورِ دین اور طریق دعوت سے انہیں اختلاف تھا، اس کی وضاحت انہوں نے ''عصر حاضر میں دین کی تفہیم وتشریح'' میں کی ہے۔ ان کے نزدیک حکومت کا قیام اور سیاست میں شمولیت کارِ دین نہیں ہے۔ اس اختلاف میں بھی ان کا انداز شائستہ اور علمی ہے۔ ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' ہی اس کتاب کا موضوع ہے اور اس ضمن میں جماعت کے دینی مزاج اور عبادات کی حیثیت پر بحث کی ہے۔ کوئی ذی شعور انسان بھی اس تنقید کو ایک علمی و دینی بحث ہی سمجھے گا اور اس اختلاف کا تجزیہ بھی علمی ہوگا۔ اس تنقید پر برا منانا علمی رویہ نہیں ہے۔ اس اختلاف کے باوجود علمی تحریکی حلقوں میں مولانا علی میاں کا اسی طرح احترام قائم رہا جس طرح کا احترام ایسی قد آور شخصیتوں کا استحقاق ہے اور ان کی شفقتوں میں بھی کمی نہیں آئی۔ ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں انہوں نے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ علمی غیر جانبداری کے باوجود اس تبصرے میں ایک تعلق نظر آتا ہے۔ اس تبصرے میں انہوں نے دو باتوں کا نمایاں ذکر کیا ہے، ایک فقہی و کلامی مسائل میں دینی حلقے کا سید مودودی سے اختلاف اور دوسرے عملی سیاست و انتخابات میں حصہ لینا۔ اس تبصرے کی زبان اور اسلوب قابل تقلید نمونہ ہے۔ ''پاکستان کی جماعت اسلامی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

جماعت اسلامی جس نے پاکستان میں اسلامی نظام اور اسلامی قانون کے نفاذ کا

www.abulhasanalinadwi.org

پُر زور مطالبہ کیا تھا، بہت کچھ اس توقع کو پورا کر سکتی تھی، اور اس خلا کو پر کرنے کے لیے سب سے زیادہ اس پر نظر پڑتی تھی۔ اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی میں متعدد ایسی صفات جمع تھیں جو ان کو ذہنی قیادت کے منصب بلند پر پہنچا سکتی تھیں، ان کو قدرت کی طرف سے ایک سلجھا ہوا دماغ، پرزور قلم اور ایک طاقتور اسلوب ملا تھا۔ وہ مغرب کے جدید مکاتب فکر اور فلسفوں سے واقف تھے۔ دوسری طرف ان کو اسلام کی تعلیمات اور ان کی زندگی کی صلاحیت پر عقیدہ تھا۔ مغربی تہذیب و افکار کی تنقید اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و ترجمانی میں ان کی تحریریں اعتماد اور طاقت سے پر ہوتی تھیں اور اس معذرت آمیز اور مدافعانہ لہجہ اور طرز سے پاک جو اس دور سے پہلے کے مسلمان اہل قلم اور مصنفین کا شعار بن گیا تھا۔ انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں اسلامی مسائل اور متکلمانہ و سیاسی مباحث پر جو پرزور مضامین و رسائل لکھے، انہوں نے ہندوستان کے اسلام پسند حلقہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور ان سب لوگوں کو ان کی ذات کی طرف متوجہ کر دیا جو اسلام کے اقتدار اور غلبہ کے خواہشمند اور موجودہ صورتِ حال سے بے چین تھے۔ اس تأثر کے نتیجے میں جماعت اسلامی کا وجود عمل میں آیا اور جن جن لوگوں کو ان کے قلم و فکر نے متاثر کیا تھا، وہ جمع ہو گئے۔ پاکستان بننے کے بعد قدرتی طور پر جماعت کی قیادت وہاں منتقل ہو گئی جو اسلامی فکر کی اشاعت و نفاذ کے لیے زیادہ موزوں میدان تھا۔

مولانا علی میاں کی تحریروں میں غلبہ اسلام کی آرزو جو تحریکی فکر کا خاصہ اور دعوت کے اجتماعی اسلوب کا منتہاء و مقصود ہے، پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

بہت سے اہل ذوق اور اہل نظر کا احساس ہے کہ فکر و نظر اور مسلمانوں میں احساسِ خودی پیدا کرنے اور ان کی شخصیت کو ابھارنے کے جس سلسلے کا آغاز عربی میں ''ماذا

www.abulhasanalinadwi.org

خسر العالم بانحطاط المسلمین‘‘ اور اردو میں ’’انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر‘‘ سے کیا گیا تھا، اس کی اس کتاب کے ذریعہ تکمیل کی گئی۔ اس طرح وہ اس سلسلہ کی پہلی اور یہ اس کی دوسری کڑی ہے۔ پہلی کتاب کا اختتام اقبال کے اس مصرعہ پر کیا گیا تھا۔

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

اب اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ عالم کی تعمیر نو میں اب کن حقائق و واقعات کا لحاظ اور کن پہلوؤں کی رعایت کرنی ہوگی[۲]۔

بلا شبہ مصنف کی یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کتاب کے آخری باب میں جو نتائج نکالے گئے ہیں، وہ اس کی شہادت دیتے ہیں۔ مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

اب اگر اسلامی ممالک اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالم انسانی میں پیدا ہوگا تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے، جو سنۃ اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے۔ اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کیا مغرب کی دائمی غاشیہ برداری اور کشکول گدائی مناسب ہے، یا دنیا کی رہنمائی کا منصب عالی، اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع، جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں۔ کیا اس کے لیے ظاہری نام و نمود، عہدہ و منصب، لذت و راحت، اور مادی و جسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے؟ اگر اس کے لیے سو جانیں بھی قربان کی جائیں تو در حقیقت یہ گھاٹے کا سودا اور زیان و نقصان کا معاملہ نہیں۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں[۳]

www.abulhasanalinadwi.org

میں سید ابوالحسن علی کی ان دو کتابوں کو پڑھ رہا تھا تو میری آنکھوں کے سامنے سید مودودی کی ''تنقیحات'' کے مضامین پھر رہے تھے اور میں یوں محسوس کرر ہا تھا کہ الفاظ وعبارات اور اسالیب و اظہارات کے تفاوت کے باوجود فکر وتصور کی ایک ہی لہر ہے جو دونوں کے ہاں رواں دواں ہے۔

تاہم ان کی شخصیت پر بالآخر جو اسلوب غالب آیا، وہ مولانا محمد الیاس کا تھا۔ مولانا عبدالقادر رائے پوری سے نسبت اور مولانا محمد الیاس سے اثر پذیری انہیں اس اسلوب کی طرف کھینچ لے گئی۔ تصوف، بیعت، روحانیت، حب الہی کا سوز و درد اور سلوک میں شخصی ارتقاء ان کے مزاج کے لازمی اجزاء قرار پائے۔ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کی تیسری جلد مشائخ چشت سے متعلق ہے۔ اس کتاب کی تصنیف میں مولانا عبدالقادر رائے پوری کی طلب کا ذکر انہوں نے مقدمے میں کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے وجدانی کیفیت میں لکھی ہے۔ مشائخ چشت کے ہاں سوز و گداز اور عشقِ الہٰی کی آگ کی جو جلوہ فرمائی ہے، اس کا اظہار لفظ لفظ سے ہوتا ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاء کے ذکر میں تو انہوں نے کمال کر دیا ہے، اسے پڑھتے ہوئے بار بار اقبال یاد آئے۔ وہ کہتے ہیں۔

شرار از خاک من خیزد کجا ریزم کرا سوزم
غلط کردی کہ درجانم فگندی سوزِ مشتاقی

سید احمد شہید کی دعوت کے جہادی پہلو کا ان کے فکر پر اثر ہے، لیکن اس کا ظہور صرف فکری چیلنج اور اسلام کی برتری کی حد تک ہے۔ مولانا محمد الیاس اور مولانا عبدالقادر رائے پوری پر ان کی کتابوں کو محض سوانح نگاری کے نقطہ نظر سے دیکھنا بڑی ناانصافی ہوگی۔ تاریخ مشائخ چشت کی طرح ان میں بھی سید ابوالحسن علی کی پوری روحانی شخصیت امڈ آئی ہے۔ مولانا محمد الیاس پر ان کی کتاب دراصل ان کے اسلوبِ دعوت کی توضیح ہے۔ مولانا محمد الیاس کی دینی دعوت پر ان کی اس تصنیف کا باب ہشتم خصوصی مطالعے کا مستحق ہے۔ اس میں انہوں نے مولانا کی دعوت کا ذہنی پس منظر، اس کے اصول ومبادی اور اس کی دینی وفکری اساس پر مفصل بحث کی ہے۔ اس سے نہ صرف

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا محمد الیاس کے تصورِ دعوت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بلکہ خود علی میاں کے رجحانات واحساسات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ دین کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ دعوت الی اللہ کے دو دائرے ہیں، ایک خارجی اور دوسرا داخلی۔ خارجی کا تعلق غیر مسلموں سے ہے جس میں ان کی ثقافت، ان کی روایات اور ان کے مذہبی افکار و اعمال کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کی جاتی ہے۔ اس میں حکیمانہ انداز، مضبوط استدلال اور مجادلہ احسن پر بنیاد رکھی جاتی ہے۔ دعوت کے داخلی دائرے کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت، ان کی اصلاح و فلاح اور مسلم معاشرے میں خیر کی مجموعی فضا اس کے اہداف ہیں۔ سید ابوالحسن علی نے اسے بطریق احسن بیان کیا ہے۔ وہ اس باب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

> جس مبارک دینی ماحول میں مولانا محمد الیاس صاحب کی عمر کا ابتدائی حصہ گزر رہا تھا، اس کی مخصوص دینی وروحانی فضا کی وجہ سے بمشکل اس بات کا احساس ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں سے ایمان ویقین کی دولت سرعت سے نکلتی جارہی ہے۔ دین کی طلب اور قدر سے دل تیزی کے ساتھ خالی ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اس ماحول میں چونکہ صرف خواص اہل دین اور اہل طلب سے واسطہ پڑتا تھا، اس لیے مسلمانوں کی دین سے بڑھتی ہوئی بے نیازی اور اس کی ناقدری اور اس کی تحقیر کا کوئی عملی تجربہ اور احساس نہ ہونا بے موقع نہ تھا۔ وہاں رہ کر یہی تصور ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی مکی دعوت وتبلیغ اور دین کی ابتدائی جدوجہد کی منزل سے آگے بڑھ چکی ہے اور اب صرف مدنی زندگی کے تکمیلی مشاغل کی ضرورت ہے، اس لیے وہاں رہ کر مدارسِ دینیہ کے قیام واہتمام، کتاب وسنت کی اشاعت، درسِ حدیث، دینی تصنیف و تالیف، قضاء وافتاء، رد بدعات، اہل باطل سے مناظرہ واحقاق حق اور سلوک و تربیتِ باطنی کے علاوہ کسی اور طرف ذہن کا منتقل ہونا مشکل تھا،---لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں آپ کی خاص رہنمائی فرمائی اور آپ کی بصیرت پر یہ حقیقت

www.abulhasanalinadwi.org

منکشف کی کہ جس سرمایہ کے اعتماد پر یہ سارا جمع خرچ ہے، وہ سرمایہ ہی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ جس زمین پر دین کے یہ درخت نصب کرنے ہیں، وہ زمین ریت کی طرح پاؤں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی ہے۔ امہات عقائد میں ضعف پیدا ہو گیا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے اور خود مولانا کے گہرے الفاظ میں "امہات عقائد میں امہات ہونے کی شان نہیں رہی، ان میں انبات عقائد (ضمنی وفروعی عقائد) کی تربیت و پرورش کی طاقت نہیں رہی۔" خدا کی خدائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا یقین کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، آخرت کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے، خدا کی بات کا وقار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا وزن اور دین و شریعت کا احترام کم ہو رہا ہے۔ اجر و ثواب کا شوق (ایمان واحتساب) دل سے اٹھتا جا رہا ہے[۴]۔

اس انکشاف وادارک نے مولانا محمد الیاس کی زندگی کا رخ بدل دیا اور طریق کار اصولی طور پر بدل گیا۔ "آپ کی زندگی بھر کی جدوجہد اور دعوت وتحریک کی بنیاد دراصل اسی امر واقعی کا ادراک تھا کہ مسلمانوں میں دین کی بنیاد متزلزل میں ہے اور اصل کام اسی کا استحکام ہے۔ آپ کی ساری جدوجہد کا محور و مرکز یہی خیال تھا جس نے آپ کی توجہ و دلچسپی کو ہر رخ سے ہٹا کر اسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا[۵]۔" مولانا حسین احمد مدنی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

نماز، روزہ، قرآن، انقیاد مذہب اور اتباع سنت کا نام لینے اور ان چیزوں کا تذکرہ کرنے سے ان چیزوں کے ساتھ عالم اسلام میں تمسخر اور مضحکہ واستخفاف کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رہتا۔ امور مذکور کی حرمت وعظمت کی طرف دعوت دینے ہی پر اس تبلیغ کی تحریک کا دارومدار ہے اور یہی اس کی بنیاد ہے کہ استخفاف سے تعظیم کی طرف فضائے عالم کے انقلاب کی کوشش کی جائے[۶]۔

مسلمانوں میں دینی طلب وقدر کا جو فقدان ہے، اسے دور کیا جائے اور ان میں دین کی طلب واحساس کی تبلیغ کی جائے۔ مولانا علی میاں تبلیغ کے طریق کار اور نظامِ کار پر مفصل بحث

www.abulhasanalinadwi.org

کرتے ہوئے مولانا محمد الیاس ہی کے الفاظ میں اسے تحریکِ ایمان قرار دیتے ہیں۔ ''ذکر کی پابندی، علم میں اشتغال، لایعنی اور بے کار باتوں سے اجتناب، امیر کی اطاعت اور جماعتی نظام کے ساتھ اس کام کو کرنے کی تاکید نے اسے دوسرے فتنوں اور خرابیوں سے محفوظ کر دیا۷۔''

سیاست کے حوالے سے مولانا محمد الیاس کا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''مولانا دین کے تمام کاموں میں ایمان اور مذہب کے اصول وارکان کے لیے جدوجہد اور تبلیغ و دعوت کو مقدم سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک انہی چیزوں سے پورے دین کے اخذ کرنے اور پوری شریعت پر عمل کرنے کی قابلیت وقوت ابھرتی ہے، اسی طرح عبادات کی درستی اور حکمت کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور دین کی دعوت کی کامیابی اور اس میں پوری جدوجہد سے سیاست کی قابلیت ابھرتی ہے، جس سیاست کی بنیاد دعوت پر نہیں ہے، وہ سیاست بے بنیاد اور متزلزل عمارت ہے۸۔''

اسلوب دعوت

تبلیغی جماعت میں بھی مولانا کی حیثیت مربی کی تھی۔ وہ تبلیغی جماعت کے تصور اور طریق کار سے اتفاق رکھتے تھے۔ تصوف کی تربیت نے ان کی شخصیت میں ایک خاص روحانی تاثیر رکھی تھی، وہ جہاں بیٹھتے گرد و پیش کو منور کر دیتے، دعوت اسلامی کے لیے عملاً جو طریقہ انہوں نے اختیار کیا، اس میں تقریر و تحریر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ مولانا علی میاں کو اللہ تعالیٰ نے تحریر و تقریر کی خصوصی صلاحیت عطا فرمائی تھی جسے وہ دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کرتے تھے، وہ مرتب و مدلل گفتگو کرتے اور ان کے خطابات میں ان کی شخصیت کا نور جھلکتا دکھائی دیتا تھا، اور ان کی روحانیت کی تاثیر صاف طور پر نظر آتی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ انہی ۶۰-۱۹۵۹ء میں اسلامیہ کالج - لاہور میں سنا، تب میں بی - اے کا طالب علم تھا اور آخری مرتبہ ۹۷-۱۹۹۶ء میں برطانیہ میں سنا جب وہ نونگھم میں جامعہ الھدیٰ کے افتتاح کے لیے تشریف لائے۔ جب بھی سنا، علمی و روحانی تسکین کا سامان میسر آیا۔ ان کی کئی کتابیں ان کے خطابات ہی کا نتیجہ ہیں۔ ان کے اسلوب دعوت میں تقریر

www.abulhasanalinadwi.org

وتحریر کو خصوصی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تحریر میں تاریخی وسوانحی موضوعات ان کی خاص دلچسپی کا باعث رہے، لیکن انہیں پیش کرتے ہوئے دعوتی نتائج ہمیشہ ان کے سامنے رہے۔ ان کی تحقیق، ان کا ادب، ان کا مشاہدہ اور ان کا اظہار سب ایک ہی رخ پیش کرتے ہیں اور وہ ہے دعوت اسلامی۔ مسلمانوں سے خطاب ہے یا غیر مسلموں سے، دعوت الی اللہ ہی مقصود ہے۔ ''مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں'' کے مقدمے میں مولانا محمد الحسنی نے سید ابوالحسن علی کے اسلوب دعوت کو خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس کتاب میں مصنف نے ایک مثالی داعی اسلام کی تصویر پیش کی ہے جو مغرب کو اسلام کی دعوت بغیر کسی معذرت وشرمندگی کے دیتا ہے، اور اس کے لیے غیر ضروری تاویلات کا سہارا نہیں لیتا، وہ اس کو کھل کر یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی قیادت میں اپنا اہم کردار ادا کرے اور زندگی کا رخ تبدیل کر دے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ علوم اور وسائل پوری انسانیت کو بلا تفریق و امتیاز حقیقی سعادت و کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ایمان اور صالح مقاصد کے ساتھ ان کا جوڑ ہو، لیکن وہ صرف اس پر اکتفاء نہیں کرتا، وہ اہل مغرب کو اس انانیت، تکبر، استغناء، اور علمی غرور کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے، جو قبول حق کے راستے میں حائل ہو گیا ہے، اور اس کی وجہ سے روشنی کے سارے روزن اس پر بند ہو چکے ہیں، اور یہ سب بڑی ہنر مندی و ذہانت، حکمت ایمانی اور اخلاص و دردمندی کے ساتھ کہا گیا ہے، اور دلی کرب و بے چینی کا آئینہ دار ہے۹۔

تعلق باللہ اور روحانی مرتبہ کے اعتبار سے مولانا علی میاں ایک ولی اللہ انسان تھے۔ ہمارے استاد سید ابوبکر غزنوی نے اپنے تجربے کی بناء پر ان کے اوراد و وظائف اور مشاغل شب کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اسی طرح کے الفاظ کہے تھے۔ ان کا تعلق اہل اللہ کے اس گروہ سے تھا جو اپنے قلبی واردات کے حوالے سے بھی اصلاحِ حق اور احیاء ملت کے لیے مصروف عمل رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

دعوت الی اللہ سے انہیں قلبی لگاؤ تھا اور یہ دلچسپی ہمیشہ قائم رہی۔ ان کے خطابات کے موضوعات میں دعوت و اصلاح کو خاص اہمیت حاصل رہی۔ اب تو دعوت الی اللہ ایک علمی مضمون ہے اور علماء و دعاۃ نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے، مگر مولانا سید ابوالحسن علی کا کام اس اعتبار سے بنیادی ہے کہ انہوں نے دعوت و اصلاح کی تاریخ مرتب کر دی ہے، اور ان کے اپنے الفاظ میں تاریخی تسلسل کو بیان کر دیا گیا ہے۔ ان کی کتاب ''تاریخ دعوت و عزیمت'' تاریخ اسلامی کی کتاب شمار ہوتی ہے، اسے فکر اسلامی کی تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے اور علماء و مشائخ کی سوانح کا نام بھی دیا جا سکتا ہے، لیکن درحقیقت یہ دعوت و اصلاح کے فکری و عملی خطوط کی کتاب ہے۔ مولانا علی میاں اس کتاب کی پہلی جلد کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:

> اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں جنہوں نے حالات سے کشمکش کی اور جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور عملی حیثیت سے عہد انحطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے، اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی، صرف چند گنی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷-۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں۔ یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور مایوسی ہے، جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و عزیمت پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی۔ یہ ایک احساس کمتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے، جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ۱۰۔

۱۸۰ ـــــ مولانا سیّد ابو الحسن علی ندوی:

www.abulhasanalinadwi.org

پھر اسلامی تاریخ پر موجود لٹریچر کے ناکافی ہونے کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''درحقیقت اسلام کے سلسلۂ دعوت واصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب وتالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی وعلمی خدمت ہے[1]۔''

ہمارے پیش نظر تاریخ دعوت وعزیمت کا جائزہ نہیں ہے، صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ دعوت و اصلاح کے کام میں پچھلی کوششوں سے آگاہی بصیرت کا باعث بنتی ہے اور مولانا علی میاں نے اسی ضرورت کو بطریق احسن پورا کیا ہے۔ ''تاریخ دعوت وعزیمت'' دعوتی سرگرمیوں کی تصویر ہی نہیں پیش کرتی، بلکہ منہاجِ دعوت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ دعوت کے کارکن کے لیے یہ کتاب ایک انمول تحفہ ہے۔

دعوت اسلامی کے حوالے سے اولیں اسوہ تو انبیاءؑ کی شخصیتیں ہیں۔ دعوت کا کوئی کام ان کے حوالے کے بغیر مصدقہ نہیں ہوسکتا۔ جو کام بھی پیغمبرانہ منہاج سے متصادم ہوگا، وہ مثبت نتائج نہیں پیدا کرے گا۔ مولانا علی میاں نے اس پر بھی کام کیا ہے، انہوں نے اس موضوع پر خطبات کا ایک سلسلہ شروع کیا جواب ''تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب'' کے عنوان سے چھپ گیا ہے۔ اس میں ابراہیمؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور نبی کریمؐ کی حکمت تبلیغ کا تذکرہ ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے جس کا ترجمہ مولانا عبداللہ عباس ندوی نے کیا ہے۔ کتاب مختصر، جامع اور بے حد مفید معلومات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف دعوت کے بنیادی اصولوں کو بیان کیا گیا ہے، بلکہ انبیاء کے ایمان افروز تجربات کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ والد اور قوم سے خطاب کے پس منظر میں سورہ شعراء کی آیات کے حوالے سے حضرت ابراہیمؑ کے اسالیبِ دعوت کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ان آیات کریمہ [سورہ شعراء] کو بار بار پڑھنے سے آپ محسوس کریں گے کہ ان میں ایک جہانِ معانی آباد ہے۔ ایک معنی سے دوسرے معنی روشن ہوں گے، ایک بات سے دوسری کارآمد بات نکلے گی اور ان دونوں انداز بیان (والد کو دعوت دینے اور قوم کو مخاطب کرنے) کا فرق واضح ہوگا اور یہ اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر

www.abulhasanalinadwi.org

برحق حضرت ابراہیم کو کس درجہ انسانی نفسیات پر عبور عطا فرمایا تھا اور ذہن وقلب کے باریک سے باریک سوتوں کو جگانے اور صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مہارت انہیں حاصل تھی۔ اپنے مخاطبین سے کس طرح انہوں نے سب کچھ اگلوا لیا جو ان کے دل ودماغ میں محفوظ تھا[12]۔

یوسف کے طریقِ دعوت کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک اہم اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہی سبب ہے کہ جو شخص دعوت وتبلیغ کو اصول وقواعد کی حد بندیوں میں محصور کرتا ہے، وہ دراصل اس کی کارکردگی کو محدود کر دیتا ہے۔ دعوت، نشاط، جوش اور جرأت کی متقاضی ہے، داعی اور مبلغ پر بھی یہ ظلم ہے کہ اس کو ضوابط کا پابند بنایا جائے[13]۔

داعی ہر حال میں داعی ہے۔

موسیٰؑ کی قوم مصائب سے تنگ آ کر شکایت کرتی ہے کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچیں اور آنے کے بعد بھی (أوذینا من قبل ان تاتینا ومن بعد ماجئتنا [14])، اور موسیٰؑ اس کے جواب میں کہتے ہیں: "قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنا دے، پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو (قال عسی ربکم ان یهلك عدوكم ویستخلفكم فی الارض فینظر كیف تعملون[15])

مولانا علی میاں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک داعی کی شان ہی نرالی ہوتی ہے، وہ ہر حال میں اور ہر جگہ داعی ہوتا ہے، یہاں تک کہ آپ کہیں تو غلط نہیں ہوگا کہ وہ کھانے پینے میں بھی داعی دکھائی دیتا ہے، اپنے گھر میں، اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ، اپنے بال بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے میں،

www.abulhasanalinadwi.org

رنج وغم کے موقع پر اس کے داعی ہونے کی شان اس سے جدا نہیں ہوتی۔ ہمیں رسول اللہ کی سیرت طیبہ میں یہی بات نظر آتی ہے کہ ہر حال میں آپ داعی نظر آتے ہیں۔ یہاں موسیٰ کی سیرت میں بھی یہی نقشہ نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناشکری اور ناقدری کی بات نے اثر ہی نہیں کیا اور اس کو نظر انداز کر کے کہنے لگے، ''قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر دے اور اس کی جگہ تمہیں زمین کا خلیفہ بنا دے''۔ حضرت موسیٰ نے اسی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ یہ بھی سمجھانا چاہا کہ ہوش میں رہنا، کہیں تمہارا نفس تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور دوبارہ پھر کہیں انہی غلطیوں کا ارتکاب نہ کر بیٹھو جو پہلے تم سے سرزد ہو چکی ہیں، اس لیے فرمایا: **فینظر کیف تعملون** پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو[۱۶]۔

غزوہ حنین کے موقع پر تقسیم غنائم کے سلسلے میں انصار کے بعض لوگوں نے جو کچھ کہا اور حضور اکرمؐ نے اس پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اسے مولانا علی میاں پیغمبرانہ حکمت اور عقلی بلاغت کا ایک نادر نمونہ قرار دیتے ہیں[۱۷]۔ اس پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

ایک سچا اور دانا داعی

ایک داعی کی حیثیت سے انہوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے ہی سوچا۔ سعودی عرب کی حکومت کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم تھے، لیکن اس خیر خواہ اور دردمند دل رکھنے والے انسان نے اپنے ذاتی مصالح کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی بات کی۔ اس کی صحیح تصویر ان کی کتاب ''حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب، امیدوں اور اندیشوں کے درمیان'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ایک سچے داعی اسلام کی حیثیت سے اپنی زندگی گزاری۔ اگر مسلمانوں کے زوال وانحطاط پر افسوس ہوا تو ان کی اصلاح وفلاح اور ان کے استحکام کے لیے

www.abulhasanalinadwi.org

سرگرم عمل رہے۔ جماعت اسلامی سے لے کر مسلم مجلس مشاورت تک ان کے ہر اقدام کے پیچھے اسلام اور مسلمانوں کی سچی محبت کارفرما رہی۔ ان کی تقریر وتحریر کے موضوعات کا تعلق ہمیشہ مسلمانوں کے احوال، ان کی اصلاح، اسلام کی حقانیت، اسلامی تہذیب کی برتری سے رہا۔ نہ صرف اصول اور تاریخ دعوت پر انہوں نے بہترین تصانیف یادگار چھوڑیں، بلکہ اپنی ساری زندگی کارِ دعوت ہی کی نذر کی۔ ایک داعی کی حیثیت سے ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو ایک متبع سنت نبوی داعی کے اندر ہونے چاہییں۔ علم کی وسعت، مشاہدے کی قوت، بیان کا حسن اور تحریر کی شگفتگی سب کچھ دین ہی کے لیے تھا۔ حساس طبیعت، دردمند دل اور تواضع کی حامل شخصیت کا مالک یہ انسان اس بحرانی دور کا آخری شخص تھا جس نے مسلمانوں کے غمگسار خادموں کی ایک کھیپ پیدا کی تھی۔ عصر حاضر کے عالم اسلام اور دعوت اسلامی کا مورخ و تجزیہ نگار سید ابوالحسن علی ندوی کی بلند قامت شخصیت کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

اہل ندوہ اگرچہ تاریخ نویسی اور عربی دانی کے لیے مشہور ہیں، لیکن ندوہ کے ایک فرزند نے جس طرح داعیانہ زندگی گزاری ہے، اس نے دعوت دین کے میدان میں ندویوں کا مرتبہ بلند کیا۔ مولانا رابع ندوی کے مطابق تو دعوت دین کا کام ندوہ کے مقاصد میں شامل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ندوہ کی تاسیس جن مقاصد کے لیے ہوئی تھی، ان میں اہم ترین مقصد دعوتِ دین کے لیے ذہنی وعلمی تربیت دینا تھا۔ اگر آپ ندوہ کے نصاب پر نظر ڈالیں تو صاف نظر آئے گا کہ پورا نصاب جس محور کے گرد گھومتا ہے، وہ قرآن کریم اور رسول اکرمؐ کی سنت مطہرہ ہے اور تبلیغ ودعوت کی روح اس پورے نصاب میں کارفرما ہے[۱۸]۔

بہرحال سید ابوالحسن علی ندوی میں ایک داعی کی اعلیٰ صفات موجود تھیں اور انہوں نے کار دعوت میں شاندار کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ اللهم اغفر له وارحمه۔

www.abulhasanalinadwi.org

حواشی

۱- سید ابوالحسن علی ندوی، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام (۱۹۸۱ء)، صفحات ۱۲۸-۱۲۹

۲- ایضاً، ص ۱۰

۳- ایضاً، ص ۳۱۴

۴- سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام (۱۹۷۹ء)، صفحات ۲۳۱-۲۳۲

۵- ایضاً، صفحات ۲۳۲-۲۳۳

۶- ایضاً، ص ۲۳۳

۷- ایضاً، ص ۲۴۱

۸- ایضاً، صفحات ۲۴۹-۲۵۰

۹- سید ابوالحسن علی ندوی، مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام (۱۹۷۹ء)، صفحات ۷-۸

۱۰- سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، لکھنؤ: مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام (۱۹۷۹ء)، حصہ ۱، صفحات ۱۱-۱۲

۱۱- ایضاً، ص ۱۲

۱۲- سید ابوالحسن علی ندوی، تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب، صفحات ۳۴-۳۵

۱۳- ایضاً، صفحات ۵۸-۵۹

۱۴- الاعراف: ۱۲۹

۱۵- ایضاً

۱۶- سید ابوالحسن علی ندوی، تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب، حوالہ مذکورہ، ص ۹۱

۱۷- ایضاً، ص ۱۳۵

۱۸- ایضاً، ص ۹

☆☆

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

محمد طفیل ہاشمی

مولانا علی میاں کا پیغام۔ امت مسلمہ کے نام

بلند پایہ خاندانی نسبتوں اور علمی و روحانی تربیت کے ساتھ مولانا علی میاں کی شخصیت کا توازن و اعتدال، اسلاف سے حسن عقیدت، معاصرین کے ساتھ تعلقات میں تواضع و اعتراف، مختلف الخیال افراد، عناصر اور جماعتوں کے سلسلے میں اُن کا حسن ظن اور جمع بین الاضداد کی قوت و صلاحیت ان کا ایک ایسا نمایاں وصف ہے جو میرے محدود علم کی حد تک ماضی قریب میں مولانا مناظر احسن گیلانی اور حکیم الاسلام قاری محمد طیب کے علاوہ کسی شخصیت میں اتنی وافر مقدار میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وصف خاص کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو مولانا علی میاں کی تالیفات میں سے ''پرانے چراغ'' کے وہ حصے دیکھے جائیں جہاں آپ نے بعض ان شخصیات کا تذکرہ کیا ہے، جن میں باہم فکری آویزش رہی ہے یا جن سے خود مولانا علی میاں کے فکری اختلافات تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا گراں قدر وصف ہے جس کی بدولت انسان کی نگاہ وقتی اور مقامی بندشوں اور وابستگیوں سے بلند تر ہو کر جامعیت اور آفاقیت کو محیط ہو جاتی ہے۔

مولانا علی میاں کا تعلق جس خانوادے سے تھا، اسے انیسویں صدی کے آغاز ہی میں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلامیت اور مغربیت میں ایک ہمہ گیر تہذیبی کشمکش کا بازار گرم ہونے جا رہا ہے، اور ان اہل نظر کا باطنی اشراق انہیں بتا رہا تھا کہ اس کشمکش کے نتیجے میں، اور کچھ اپنی ساخت میں چند بنیادی خرابیوں کے باعث مغربی تہذیب کارگہ حیات کی بازی ہار جائے گی۔ اس خانوادے نے متنوع اور ہمہ جہتی تحریکوں کے ذریعے امت مسلمہ کی تربیت کا بیڑا اٹھایا تاکہ مستقبل کے اس خطرے سے وہ بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔ دارالعلوم ۔ دیوبند اور ندوۃ العلماء ۔ لکھنؤ کی

www.abulhasanalinadwi.org

تعلیمی تحریکیں، مولانا محمد الیاس کی اصلاحی تحریک، علامہ اقبال کی فکری تحریک، مصر اور برصغیر میں الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی کی تحریک دعوت دین درحقیقت ایک ہی مقصد کے حصول کے متنوع راستے تھے، جن کے تاریخی کردار پر مولانا علی میاں نے ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش'' کے زیرعنوان نہایت وقیع تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ مولانا علی میاں ان تحریکوں کے اختلافِ فکر وعمل کو تنوع پر محمول کرتے ہیں، وہ انہیں باہم متضاد اور متعارض خیال نہیں کرتے۔

مولانا علی میاں کی ذاتی فکری تشکیل وارتقاء میں سید احمد شہید بریلوی کی تحریک اصلاح و جہاد اور حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کو غالباً سب سے زیادہ دخل حاصل ہے۔ ان میں سے اوّل الذکر تحریک حکومت اسلامیہ کے قیام کی راست کوشش تھی۔ اس کے کارکن پورے جذبہ ویقین کے ساتھ سرگرم عمل رہے تھے، تاہم جب گرد چھٹی تو مسلمانوں کی یہ ایک بڑی عسکری طاقت تحلیل ہو چکی تھی، اس کے برعکس حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی کوشش حکومت الٰہیہ کے قیام کی بالواسطہ جدوجہد تھی جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے نتیجے میں مغل سلطنت کو اورنگ زیب عالمگیر جیسے دیندار بادشاہ کی قیادت میسر آئی۔

مولانا علی میاں کو اس سلسلے میں شرح صدر حاصل تھی کہ برصغیر کی حد تک بالخصوص اور تمام عالم اسلام میں بالعموم اصحابِ دعوت وعزیمت اور مصلحین امت کو حصول اقتدار کی آویزشوں اور انتخابی سیاست کی فتنہ سامانیوں سے بالاتر رہ کر ان افراد، طبقوں، جماعتوں اور گروہوں میں کام کرنا چاہیے جن کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور ہے، یا وہ برسر اقتدار آ سکتے ہیں۔ اگرچہ پاکستان، مصر، ترکی اور الجزائر میں اسلامی تحریکوں کے ایک قابل لحاظ طبقے کو اس طرز فکر سے اتفاق نہیں، جبکہ سوڈان میں یہ فکر اختیار کرنے سے مثبت نتائج حاصل کرنے کی راہ ہموار ہوئی ہے، تاہم یہ ہمارا موضوع بحث نہیں کہ آج کے معروضی حالات میں ان میں سے کون سا طریق کار یقینی نتائج کا حامل

www.abulhasanalinadwi.org

ہو سکتا ہے، اور یوں بھی ایک مسلمان نتائج کا نہیں، بلکہ جہد وعمل کا مکلف ہے۔ صرف یہ بات واضح کرنا مقصود ہے کہ مولانا علی میاں مجددی طریق کار کو زیادہ مفید، نتیجہ خیز، ثمرآور اور محفوظ تر سمجھتے تھے، چنانچہ اُنہوں نے اپنی تالیف ''تاریخ دعوت وعزیمت'' میں جن اساطین امت کی داستانِ عزم وجہد، ایثار وقربانی، حق گوئی وبے باکی کو موضوع بنایا ہے، ان میں عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ غالبًا کوئی حکمران شامل نہیں ہے اور عمر بن عبدالعزیز بھی خلیفہ ہونے کے ناتے نہیں، بلکہ مجدد ہونے کی نسبت سے اس فہرست میں شامل کیے گئے ہیں۔

مجددین اور مصلحین کے تذکرہ نگاروں نے بالعموم دو میں سے کوئی ایک طریقۂ تالیف اختیار کیا ہے، یا تو انہوں نے تجدیدی کاموں کی قدر وقیمت کے تعین کے لیے اپنے پیمانے تشکیل دے کر مجددین کے کاموں کا جائزہ لیا ہے، اور پھر ان کی لغزشیں، کوتاہیاں اور فروگزاشتیں نمایاں کر کے ایک تنقیدی انداز نگارش اختیار کیا ہے۔ جن مؤلفین نے عقیدت کے قلم سے تذکرہ نگاری کی، اُنہوں نے مجددین ومصلحین امت کو ایسی مافوق البشر شخصیات کے طور پر پیش کیا ہے جو الہامات وکرامات کے مجسم پیکر تھے اور فطرت کی تمام قوتیں ان کے سامنے مسخر تھیں، گویا انہوں نے کوئی ایسے نقوشِ قدم نہیں چھوڑے جن پر چلنا عام انسانوں کے بس کی بات ہو۔

مولانا علی میاں کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے ان دونوں راہوں سے ہٹ کر ایک ایسی راہِ وسط اختیار کی ہے جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

> شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد وپیش، اس زمانہ کی علمی وفکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جا سکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لا کر اپنے زمانہ کے پیمانوں اور تقاضوں اور اپنے ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے

www.abulhasanalinadwi.org

جانچنا، پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیع بن جاتی ہے، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی ناانصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لیے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدان عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جا سکتا ہے، ورنہ ہر عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مؤرخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جا سکتی ہے اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جا سکتی[۱]۔

دوسری طرف مولانا علی میاں نے اگرچہ ان شخصیات کی زندگی کے داخلی پہلوؤں، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا ہے، لیکن ان کی تالیفات اولیاء و مصلحین کے کشف و کرامات اور الہامات و تصرفات کے تذکرے سے خالی ہیں، تاکہ اس راہ میں قدم رکھنے کے خواہش مند یہ بات پہلے سے جان لیں کہ

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

مولانا علی میاں کے فکر و دانش میں تسلسل اور توازن کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا اقتباس ۱۹۵۴ء کی تصنیف سے لیا گیا ہے۔ اس کے ۲۳ سال بعد ۱۹۷۷ء میں شکاگو میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے امریکہ میں اسلامی تنظیموں اور اداروں کے کارکنوں کو ان الفاظ میں نصیحت کی:

ایک بات میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ آپ سلف صالحین اور امت کے ان لوگوں سے جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دینی و ملی کام کیا ہے، بدگمان نہ ہوں۔

۱۹۰ ـــــ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی:

www.abulhasanalinadwi.org

یہ بڑے خطرے کی بات ہے، یہ بات ہمارے ان بھائیوں میں بہت زیادہ پیدا ہوتی جارہی ہے، جن کا سارا انحصار مطالعہ پر ہے، وہ تنقیدی کتابیں اور مضامین پڑھتے ہیں تو ان کو ایسا نظر آنے لگتا ہے کہ کسی نے اسلام پر مکمل کام ہی نہیں کیا، ان کتابوں کے اثر سے وہ دینی خدمت کے ناپنے کے لیے ایک فیتہ بنا لیتے ہیں جس سے وہ ہر مصلح اور مجدد کو ناپتے ہیں، جیسے فوج میں بھرتی ہونے والے رنگروٹ ناپے جاتے ہیں، یہ صحیح نہیں[۲]۔

مولانا علی میاں کا انداز تالیف یہ ہے کہ جب وہ کسی شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کی تصنیفات، مواعظ اور علمی وفکری آثار کے ماحول میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ اپنا وقت خاص اسی ماحول میں گزار رہے ہیں اور ان اثرات و کیفیات سے گزر رہے ہیں جو زیر موضوع شخصیت کے معاصرین اور ہم نشینوں پر طاری ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قاری کو بھی اسی ماحول میں لے جاتے ہیں اور مطالعہ محض مطالعہ نہیں رہتا، بلکہ دید وشنید بن جاتا ہے[۳]۔

الغرض مولانا علی میاں کے پیغام کا ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اصحاب دعوت وعزیمت کو اسلامی فکر کے احیاء، اسلامی تمدن کی بالادستی اور اسلامی روایات واقدار کی سربلندی کے لیے نہ صرف قافلۂ دعوت وعزیمت کے سرخیل مصلحین امت سے حسن عقیدت رکھنا چاہیے، بلکہ ان کے نقش قدم پر دور حاضر کے چیلنج کے مقابلے کے لیے میدانِ دعوت وتجدید میں آنا چاہیے۔

دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر ماضی کے عالی شان کارناموں اور تاریخ کے جھروکوں میں زندگی بسر کرنے والے افراد کی ذاتی زندگی کی گردان حال اور مستقبل کے صیغوں سے خالی ہوتی ہے، لیکن مولانا علی میاں ماضی کے تذکرہ نگار ہونے کے باوجود مسلمانوں کے ماضی سے مستقبل کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے مسالا حاصل کرتے ہیں، ان کی نظر ہر وقت مستقبل کے تقاضوں پر مرکوز رہتی ہے۔ مولانا علی میاں نہ تو اسلام کے غیر جانب دار مورخ ہیں اور نہ معروف معنی میں نقاد۔ درحقیقت وہ ایک ایسے معمار قوم ہیں جسے معلوم ہے کہ مسلم قوم کے مستقبل کی تعمیر کے لیے ماضی کے

www.abulhasanalinadwi.org

کھنڈروں میں سے کون سی ایسی چیزیں دست یاب ہیں جن سے مستقبل کی عمارت تعمیر ہوسکتی ہے۔ انہوں نے اپنی توانائیاں ماضی کی راکھ کرید کر بے مصرف سنگ وخشت کی رونمائی میں ضائع نہیں کیں، بلکہ ایسے تمام موتی، ہیرے اور جواہرات چن کر الگ کر لیے ہیں جو مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔ بقول اقبال:

ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

مولانا علی میاں ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلامی شخصیات کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ پٹی ہوئی لکیریں بار بار پیٹی جائیں اور پامال راہوں پر نئے سرے سے سفر شروع کیا جائے اور لکھی ہوئی دستاویزات مکرر لکھی جائیں۔ علامہ شبلی نعمانی سے اپنی عقیدت ومحبت کے باوجود لکھتے ہیں:

ایک زمانہ تھا جب مولانا شبلی کی کاوش ''حجۃ الاسلام'' [کذا] معرکۃ الآ را کتاب سمجھی جاتی تھی۔ ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' گویا علمی فتح تھی، اسی طریقے سے ''کتب خانہ اسکندریہ'' بڑی محققانہ کتاب یا یوں سمجھئے کہ اسلام کی طرف سے ایک حجت تھی، لیکن آج یہ مباحث اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ زمانہ اب بہت زیادہ کا طالب ہے۔ اب متوسط درجے کی لیاقت کافی نہیں۔ اب یہ امر کسی درسگاہ کے لیے باعث افتخار نہیں کہ مسلمانوں کی کسی تہذیبی وتمدنی خدمت پر، یا کسی دور حکومت پر یا کسی مسلمان حکمران خاندان پر ایک کتاب لکھ دی جس میں سلیقے کے ساتھ مواد جمع کر دیا گیا ہو۔ آج تحقیق ومطالعہ کا میدان بہت وسیع ہو چکا ہے، بہت سے قدیم مباحث اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔

زمانہ آسانی کے ساتھ کسی کو تسلیم نہیں کرتا، اس کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ اس وقت جو سب سے بڑا معرکہ عالم اسلام کو درپیش ہے، وہ اسلامیت اور مغربیت کی

www.abulhasanalinadwi.org

کشمکش ہے۔ اس وقت اس طبقے جس کے ہاتھ میں زمام حکومت ہے، اور سواد اعظم اور عامۃ المسلمین کے درمیان ایک بہت بڑی ذہنی کشمکش برپا ہے۔ آج دنیا کی زمام کار جس طبقے کے ہاتھ میں ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسلام کا نظام اپنی ساری افادیت کھو چکا ہے، آج کا سب سے اہم کام آج کے دور کی دانش اور ذہانت کے مطابق اس چیلنج کو قبول کرنا اور کارگہ افکار میں اسلام کی بالادستی کو اس طرح ثابت کرنا ہے اور علم کا وہ نمونہ اور معیار سامنے لے کر آنا ہے جو زبان کے اعتبار سے اس معیار کا ہو کہ زمانہ خود آگے بڑھ کر اسے قبول کرے۔ علامہ اقبال نے اسی چیلنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آج زمانے کا مجدد کہلانے کا مستحق وہ شخص ہوگا جو اسلام کی برتری ثابت کرے اور زندگی سے اس کا پیوند لگائے اور یہ ثابت کرے کہ اسلامی قانون، انسانوں کے تمام خود ساختہ قوانین سے آگے ہے[۳]۔

مولانا علی میاں کے نزدیک اس زمانے کا چیلنج اور عہد جدید کا فتنہ کبریٰ یہ ہے کہ اسلام کو اس کی جداگانہ تہذیب، اس کی مخصوص معاشرت، اس کے عائلی قانون، اس کے نظام تعلیم، اس کے زبان وادب اور رسم الخط اور اس کے پورے ورثہ سے الگ کر دیا جائے اور اسلام چند عبادات اور چند رسوم وتقریبات کا مجموعہ بن کر رہ جائے گویا

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

آج کے دور میں فلسفہ اور علم کلام اپنی طاقت کھو بیٹھے ہیں۔ سائنس میں بھی اب پڑھے لکھوں کو ملحد بنانے کی وہ طاقت نہیں جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھی۔ آج سیاسیات، معاشیات، تاریخ، ادب، سوشیالوجی وغیرہ سے تشکیل والحاد کا کام لیا جا رہا ہے گویا

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات و منات

www.abulhasanalinadwi.org

آج کا دور جس زبان کو سمجھتا ہے وہ صرف نفع اور زندگی کے استحقاق کی زبان ہے۔ بقائے انفع کا قانون ہی اقوام کو، تہذیبوں کو، اداروں کو، افراد کو اور جماعتوں کو زندہ رکھ سکتا ہے، کوئی قوم رحم کی اپیل پر زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ قدامت اور تاریخ کے سہارے پر کوئی ادارہ زندہ رہ سکتا ہے، اس لیے زندہ رہنے کے لیے زندگی کا استحقاق پیدا کیجیے اور وہ یہی ہے کہ امّا ما ینفع الناس فیمکث فی الارض

مسلم ممالک کے عوام اور حکمرانوں کے باہمی تعلق پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا علی میاں نے مسلم حکمرانوں کی دوعملی اور منافقانہ کردار کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جب حکمرانوں کو عوام کی حمایت، ان کی قربانی اور ان کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ مذہبی نعروں کے ذریعے، اللہ کے نام کی بلندی اور اسلام کی سربلندی، احکام خداوندی کے اجراء کا لالچ دے کر عوام کی حمایت حاصل کرتے ہیں اور جب ملک وقوم کی قسمت ان سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ آ جاتی ہے تو انہیں ملک وقوم کو مغربیت اور سیکولرزم کی راہ پر ڈالنے اور اسلامی قوانین کی ترمیم وتنسیخ کی اتنی جلدی ہوتی ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے قربانیاں دی ہوتی ہیں، یہ سوچنے لگتے ہیں کہ انہوں نے شاید قربانیاں دے کر غلطی کی ہے۔ یہ اسلامی ممالک کی ایک مسلسل تاریخ ہے جو بلا استثناء تمام اسلامی ممالک میں دہرائی جاتی ہے۔

مغربی اور مسلم ممالک کے قائدین اور اہل اقتدار کا موازنہ کرتے ہوئے وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ آج جس چیز کو یورپ نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور ان کمزوریوں کے باوجود جن کے ساتھ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، وہ نہ صرف زندہ ہے، بلکہ برسر اقتدار ہے۔ وہ شہری زندگی کی ذمہ داری کا احساس اور سیاسی شعور ہے۔ یورپ اور امریکہ کا اخلاقی بگاڑ انفرادی دائروں میں محدود ہے، وہاں آپ کو ایسے لوگوں کی مثالیں شاذ ہی ملیں گی جو قومی خیانت کا ارتکاب کرتے ہوں، یا اپنے ملک کو سستے داموں فروخت کر ڈالتے ہوں، یا جو حکومت کے اسرار فاش کر دیتے ہوں، یا خراب و

www.abulhasanalinadwi.org

ناکارہ اسلحہ اور ذخیرہ جنگ کی خریداری کے مجرم ہوں، جبکہ مسلمان ممالک کے قائدین اور اہل اقتدار سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کبھی اپنے کسی حقیر فائدے یا لذت وخواہش کے ماتحت اپنے ملک کو رہن رکھ دیں، یا اس کا بیع نامہ لکھ دیں، یا اپنی قوم کو بھیڑ بکری کی طرح فروخت کر دیں، یا اپنی قوم کو کسی ایسی جنگ میں جھونک دیں جو اس کی مرضی و مصلحت کے خلاف ہو، اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ قوم اس کے باوجود ان کی قیادت کا جھنڈا لے کر چلتی رہے۔

بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں عوام کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ جہاں عوام صرف محنت و مشقت کے لیے اور خواص صرف عیش و عشرت کے لیے ہیں۔ انسانیت سوز افعال و جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ شریعت کے احکام پامال کیے جاتے ہیں، لیکن نہ عوام اور جمہور مسلمین میں اس سے غم وغصہ کی کوئی لہر پیدا ہوتی ہے نہ کسی قلب کو اس سے اذیت پہنچتی ہے۔

ان حالات کی تبدیلی کے لیے کسی سربراہ حکومت، بادشاہ، صدر یا وزیر اعظم کی تبدیلی کوئی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اصل کام یہ ہے کہ قوم کا ضمیر اور شعور اتنا بیدار ہو جائے کہ وہ کسی غلط چیز اور مجرمانہ فعل کو کسی حالت میں اور کسی شخص کے لیے برداشت نہ کرے۔

بدلنا ہے تو مے بدلو، نظامِ مے کشی بدلو
فقط پیمانہ و ساغر اگر بدلا تو کیا بدلا

حواشی

۱- سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، لکھنؤ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۷۹ء، حصہ ا، صفحات ۱۳-۱۴

۲- سید ابوالحسن علی ندوی، نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں، لکھنؤ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ۱۹۷۸ء، صفحات ۱۳۲-۱۳۳

۳- سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، حوالہ مذکورہ، ص ۱۴

۴- سید ابوالحسن علی ندوی، پاجا سراغ زندگی، کراچی: مجلس نشریاتِ اسلام، ۱۹۷۸ء، صفحات ۸۴-۹۰ (ملخص)

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

حبیب الرحمٰن عاصم

اسلام کی تجدید واحیاء کیسے ممکن ہے؟

مولانا علی میاں کی تحریروں کی روشنی میں

ہم مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ انسانی زندگی کی ترتیب وتزئین اور خیر وفلاح کے لیے انسان نے جن متنوع نظریات اور مذاہب کا تجربہ کیا ہے، ان میں اسلام اپنی تعلیمات کے لحاظ سے سب سے بہتر، کامل اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔ اِس دعوے کی نظری سچائی سے قطع نظر عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں اِس کا بہترین شکل میں عملی اظہار ہوا تھا۔ اس دور میں نظامِ حکومت میں عدل و انصاف، نظامِ معاشرت میں اخوت ومحبت، نظامِ معیشت وتجارت میں دیانت وخیر خواہی، حرب و ضرب میں شجاعت وحق شناسی اور صلح وامن میں عزت ووقار اور عہد کی پاس داری جیسی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔

عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں نبی اکرمؐ اور اُن کے ساتھیوں نے جو معاشرہ اور ریاست تشکیل دی تھی، اس میں بتدریج انحطاط آتا چلا گیا۔ خیر اور بھلائی کی قوتیں کمزور ہوتی گئیں، اور شر اور بدی کی قوتوں نے زور پکڑ لیا۔

شر کا پہلا حملہ

شر کی قوتوں نے سب سے پہلے اسلامی معاشرے اور ریاست کے اس حصے پر حملہ کیا جو سب سے زیادہ نمایاں تھا، اور جس کا اثر ہمہ گیر تھا، یہ حصہ اہلِ اختیار واقتدار پر مشتمل تھا۔ لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے، اور اُن کا حکم پورے علاقے میں نافذ ہوتا تھا۔ شر

www.abulhasanalinadwi.org

نے ان لوگوں کے ذہن میں یہ بات ڈالنا شروع کی کہ حصولِ اقتدار اور اقتدار پر براجمان رہنے کے لیے کوئی سا بھی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے، اقتدار ہاتھ میں آ جانے کے بعد انسان خزانوں کا نگہبان نہیں، بلکہ مالک بن جاتا ہے۔شر نے ان لوگوں کو یہ بھی باور کرا دیا کہ اُن کی حبِ جاہ اور خیانت سے عقیدے اور دین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔اس ذہنی تبدیلی کا اثر یہ ہوا کہ حکمران مسجدوں میں حاضری دیتے رہے اور حج کے قافلے روانہ کرتے رہے، مگر انُہوں نے شریعت کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ اُن کے کسی عمل کو غلط قرار دے سکے۔اُن کی ذاتی پسند و ناپسند حکم کا درجہ اختیار کر گئی اور وہ اپنی خرابیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کے بجائے عامۃ المسلمین کو اطاعتِ امر کی تلقین کرتے رہے۔مولانا علی میاں کے بقول:

> خلافتِ راشدہ کے اختتام اور بنی امیہ کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی۔وہ قدیم جاہلی رجحانات جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت اور خلافت راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا۔کتاب و سنت نہیں رہا، جبکہ عربی سیاست اور مصالح ملکی بن گیا[1]۔

ان حکمرانوں کے درباروں کا حال کیسا ہو گیا تھا؟ مولانا علی میاں نے صاحب ''الاغانی'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''اموی عہد کے شاعر اخطل (م ۹۵ھ) خلیفہ عبدالملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آتا تھا کہ گلے میں سونے کی صلیب ہوتی اور داڑھی کے بالوں سے شراب کے قطرے ٹپکتے اور اُس کو کوئی ٹوکنے والا نہ ہوتا[2]۔''

بیت المال جو حکمرانوں کے پاس مسلمانوں کی امانت تصور ہوتا تھا، ذاتی ملکیت بن کر رہ گیا۔حکمرانوں کا جی چاہا تو کسی گویے کا منہ موتیوں سے بھر دیا، اور اگر کسی رقاصہ سے خوش ہوئے تو اس کے قدموں پر زر و جواہر کے ڈھیر لگا دیے۔ذاتی زندگی میں بھرپور تعیش کے ساتھ ساتھ کبھی

1۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی: ۱۹۸

www.abulhasanalinadwi.org

کبھار اولیاء اللہ کے ہاں بھی حاضری دے لی جاتی تھی، اور مدرسہ و خانقاہ کی خدمت کر لی جاتی تھی۔ مولانا علی میاں حسن بن سہل کی شادی خانہ آبادی کا ذکر کرتے ہیں:

> تمام افسران ملکی و خدام حسن بن سہل کے مہمان [ہوئے]، اور برابر انیس دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہمان داری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لیے امیرانہ زندگی بسر کر لی۔ خاندانِ ہاشم و افسرانِ فوج اور تمام عہدہ دارانِ سلطنت پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسپِ خاصہ، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا، جس کے حصہ میں جو گولی آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہو اُسی وقت وکیل الخزن سے دلا دیا جائے[۳]۔

مسلمان حکمرانوں کا یہ طرزِ زندگی جاری رہا، پہلے عامۃ المسلمین نے اِسے ناپسند کیا، اور پھر اِسے حقیقت کے طور پر قبول کر لیا، تاہم ہر دور میں صلحائے امت نے اصلاح حال کی کوششیں کیں، اور مولانا علی میاں کے الفاظ میں:

> بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگر چہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انہوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلانِ حق کی ایک نظیر قائم کر دی، اگر چہ عملاً وہ [صلحائے امت] اس میں کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن اُن کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر، قربانی اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں۔ اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جواں مردوں سے قائم ہے جنہوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سر نہیں ڈالی اور صحیح مقصد کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا[۴]۔

www.abulhasanalinadwi.org

شر کا دوسرا حملہ

حکمرانوں کے جبر اور تعیش کے خلاف اہل اصلاح وتزکیہ کی مزاحمت کمزور کردینے کے لیے شر نے ایک نئی چال چلی، انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ حکمرانوں اور اہل اصلاح وتزکیہ کے دائرہ ہائے کار جدا جدا ہیں، انہیں ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت نہ کرنا چاہیے۔ اسی میں عافیت ہے، ورنہ کشمکش سے خلقِ خدا کو پریشانی ہوتی ہے۔

اس سوچ نے دین و دُنیا کی تفریق پیدا کی اور اسلام کے نظامِ کامل ہونے کے تصور کو زک پہنچی۔ اسلام کی تعلیمات جو دریائے بے کنار کی حیثیت رکھتی تھیں، گھٹ کر جوئے کم آب بن کر رہ گئیں۔ بالفاظ مولانا علی میاں:

> دین اور سیاست میں عملی تفریق ہوگئی، اس لیے خلفاء علم اور دین میں ایسا مرتبہ نہیں رکھتے تھے جس سے اُن کو علماء اور اہل دین کی ضرورت نہ پڑے۔ انہوں نے حکومت وسیاست کو تنہا اپنے ہاتھ میں رکھا اور مشیر یا ماہرینِ خصوصی کے طور پر جب چاہا اور جب اُن کے مصالح کا تقاضا ہوا، علماء واہل دین سے مدد لی، اور جتنی بات انہوں نے چاہی قبول کر لی، اور جب چاہا ان کے مشورہ پر عمل نہیں کیا، اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے آزاد ہوگئی اور پیلِ بے زنجیر بن گئی[۵]۔

حکمران بے لگام اختیارات کے مالک ٹھہرے، اہل ذکر وتزکیہ نے خانقاہوں میں پناہ لی اور اہل علم وفتویٰ مدرسے کی چار دیواری میں محصور ہو کر رہ گئے، انہیں باہر کی دنیا سے کوئی دلچسپی رہی اور نہ رغبت۔ اور جب کچھ اہلِ جنوں نے دین و دنیا کی تفریق کے خلاف آواز اٹھائی تو انہیں نہ صرف حکومتوں کے ایوانوں میں سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، بلکہ اہل مدرسہ وخانقاہ بھی اُن کے درپے ہو گئے، اور بحیثیت مجموعی امتِ مسلمہ کو کیا دن دیکھنے پڑے، اس کے لیے تاتاریوں کی داستان اور ماضی قریب میں نوآبادیاتی طاقتوں کی کامیابیوں سے لے کر الغائے خلافت تک بے شمار عبرت کی

۵۔ ___ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی:

www.abulhasanalinadwi.org

مثالیں موجود ہیں۔

الحمدللہ نوآبادیاتی دور ختم ہوا۔ حریت اور آزادی کے متوالوں نے کہیں قانونی ودستوری جنگ لڑکر، اور کہیں جہاد کا علم بلند کر کے منزل پالی، مگر دین کے احیاء کی کوششوں کے اثرات تا حال اس درجے پر نہیں پہنچے کہ امتِ مسلمہ کی روشن تاریخ باردِگر متشکل ہو جائے۔

تجدید واحیائے اسلام کیسے ممکن ہے؟

مولانا علی میاں نے دعوت وعزیمت کی تاریخ اور بلند پایہ داعیانِ اسلام کے کارناموں کا بڑا مفصل جائزہ لیا ہے، اور اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسلام کی تجدید واحیاء اُن ہی بنیادوں پر ہوسکتی ہے جن پر نبی اکرمؐ نے اسلامی معاشرت وریاست کی عمارت اٹھائی تھی۔ ان کے الفاظ میں ''امت محمد یہ کے مزاج کے مطابق یہ ضروری ہے کہ داعی اور دعوت اور طریقِ دعوت تینوں چیزیں ٹھیک ٹھیک طریقِ نبوت اور اسوۂ نبوت کے مطابق ہوں[٦]۔''

اولاً ''دعوت'' یعنی دین کے درست فہم اور اس پر پختہ یقین کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اگلے مرحلے میں قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ جب تک ذہن فکر کی سچائی اور صحت سے آراستہ نہ ہو، عمل کی دُنیا میں کوئی تبدیلی دیرپا نہیں ہوسکتی۔

نبی اکرمؐ نے جو دین ہمیں دیا ہے، وہ کامل اور جامع ہے جس کی جملہ تعلیمات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ اِس میں علم وحکمت، ذکر وفکر، سیاست وحکومت، معاشرت اور معیشت سب ایک ہی سرچشمے سے متعلق ہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا جائے تو مطلوبہ نتائج مرتب نہ ہوں گے۔ ''علم وحکمت'' اور ''ذکر وفکر'' کو جدا کرنے سے کیا نتیجہ سامنے آیا تھا، مولانا علی میاں کے الفاظ میں:

مسندِ ظاہر [علم ودانش] کے درس گو باطن [ذکر وفکر] کے کورے اور باطن [ذکر وفکر] کے روشن دل ظاہر [علم ودانش] سے عاری ہونے لگے، ۔۔۔ تا آنکہ علومِ ظاہر کے

www.abulhasanalinadwi.org

لیے مدارس کی چار دیواری اور تعلیم و تزکیہ باطن کے لیے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی۔ اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے، اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علماء دین کے بجائے علماء دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار و کمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے ۷۔

دین کامل کا صحیح شعور حاصل کرنا اور اِسے امت میں عام کرنا تجدید و احیاء اسلام کی جانب پہلا قدم ہوگا۔ اِس موقع پر اِس غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری ہے کہ دینِ کامل محض ذاتی عقائد کی اصلاح، عبادات کے اہتمام اور نجی معاملات کو درست کر لینا ہی نہیں، بلکہ ہر انسان اپنی ذات کی اصلاح و تربیت کے ساتھ اس بات کا پابند ہے کہ دین کے اجتماعی غلبے کے لیے کوشاں رہے۔ انفرادی اور نجی اصلاح کی حیثیت بالکل ایسے ہی ہے کہ گرد و نواح میں گندگی کے ڈھیر لگے ہیں، اور اُنہیں ہٹانے کی کوئی کوشش نہ کی جائے، البتہ اپنے گھر کی صفائی ستھرائی پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔ اِس طرزِ عمل کا جو نتیجہ نکلتا ہے اُس سے ہر شخص واقف ہے کہ وبائی امراض پھیلنے پر کوئی شخص ان سے محض اِس لیے نہیں بچ سکتا کہ اُس نے گھر کی صفائی پر پوری توجہ دے رکھی تھی۔ مولانا علی میاں نے ''مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت'' پر لکھتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کا قول نقل کیا ہے: ''اگر میں پیری مریدی کروں تو کسی پیر کو دنیا میں کوئی مرید نہ ملے، لیکن میرے سپرد ایک دوسرا ہی کام ہے، اور وہ شریعت کو رواج دینا اور دین کو قوت بخشنا ہے ۸۔''

اور مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا عبداللطیف (ناظم مدرسہ مظاہر العلوم۔ سہارنپور) کو لکھا تھا:

زیادہ زور اِس امر پر دیا جائے کہ قوم اپنی پنچایتیں اور اپنے سب کاروبار اور سب فیصلے شریعت کے موافق کرنے ہی کو اسلام سمجھے، ورنہ اسلام نہایت ناقص ہے، بلکہ بسا اوقات احکامِ شرعیہ کی بے وقعتی اور بے رخی اور توہین کی بدولت اسلام جاتا رہتا

www.abulhasanalinadwi.org

ہے،اور یقیناً کفر ہو جاتا ہے۹۔

مولانا محمد الیاس نے مبادیاتِ دین کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و تلقین کو جو اہمیت دی، اس کا ''منتہا و مقصد'' کیا تھا؟ وہ مخلصینِ دعوت سے کیا توقع رکھتے تھے، اُن کے اپنے الفاظ میں:

--- مخلصین کی اسکیم یہ ہونی چاہیے کہ تبلیغ کی ابجد الف، ب، ت یعنی مبادیات کو دُنیا میں پھیلانے کی سکیم شروع کر کے اس کو منتہا پر پہنچانے کی کوشش میں لگ جائیں۔ معاملات، معاشرت اور باہمی اخلاق کی اصلاح و درستگی کے ذریعہ سیاست تامہ تک رسائی ہوگی۱۰۔

اسلام کا غلبہ اس کی شان و شوکت کو بڑھاتا ہے، لیکن یہ شان و شوکت ملک کا نام اسلامی اور فرد کا نام مسلم رکھ دینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ مولانا علی میاں اسلام کے ''جسم و روح'' یا ''صورت و حقیقت'' کے درمیان تعلق برقرار رکھتے ہوئے ''جسم و روح'' کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ظاہری صورت [جسم] کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مقام و مرتبہ ہے، کیوں کہ ''حقیقت'' [روح] صدیوں سے اسی صورت میں رہی ہے، اور اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے، کیونکہ یہ اس کے دوستوں اور احباب کی صورت ہے۔ ہمیں اِس صورت کی حفاظت کرنا چاہیے، لیکن صرف ظاہری صورت پر انحصار کرتے ہوئے ''حقیقت'' [روح] کی توہین سے بھی اجتناب برتنا چاہیے۱۱۔

تجدید و احیائے دین کے لیے دین کے پختہ شعور کے بعد، ثانیاً اِسے غالب کرنے کے لیے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ آج جب کہ مولانا علی میاں کے تجزیے کے مطابق عالمِ اسلام اس دورِ آخر میں فکری ''ارتداد'' کے تجربے سے گزر رہا ہے، یہ ارتداد ہمہ گیر ہے، اور یہ اپنی گہرائی، سختی اور قوت کے اعتبار سے نہایت کامیاب ہے۔ مسلمانوں کا کوئی گھرانہ اور کوئی علاقہ اس سے محفوظ نہیں رہا۔ اس ارتداد کی ایک شکل عالم اسلام کے خلاف یورپ کی ثقافتی یلغار کی صورت میں ہمارے

www.abulhasanalinadwi.org

سامنے ہے[۱۲]۔

اس ثقافتی یلغار نے جو مادیت پرستانہ مغربی تہذیب کا ایک مظہر ہے، جہاں وحی ونبوت کا انکار کیا ہے، وہیں اخلاقی اقدار کو تلپٹ کر دیا ہے۔ خوب و ناخوب کے پیمانے بدل گئے ہیں، انسان کی ''حیوانیت'' ہی کو اس کی ''اصل'' قرار دے دیا گیا ہے، اور حیوانی خواہشات کی تسکین ہی افراد اور اقوام کا منتہائے نظر بن گیا ہے۔ معاشرے کو اس سے نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، اس سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ذاتی مفاد اور زیادہ سے زیادہ اسبابِ آسائش و تعیش کا حصول ہی مقصد زندگی قرار دیا گیا ہے۔ مولانا علی میاں کے نزدیک یہ دورِ حاضر کا ''ارتداد'' ہے اور آج ارتداد کے خلاف بند باندھنے، بلکہ اس کی جگہ ایمان راسخ کرنے کے لیے ایک ابوبکرؓ کی ضرورت ہے جس کا انتظار ہر دردمند مسلمان کر رہا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی یاد تازہ کرنے والے اُن ہی لوگوں میں سے اٹھیں گے جو معاشرے کی تعلیم و تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ مولانا علی میاں فرماتے ہیں:

> تعلیم و تربیت کے ذمہ داروں کا یہ فرض ہے کہ ہر اس شے کا مقابلہ کریں جو عجز و تخنث پیدا کرتی ہے، عریاں صحافت، فحش اور ملحد ادب کی روک تھام کریں جو نوجوانوں میں نفاق، بے حیائی، فسق و فجور اور شہوت پرستی کی تبلیغ کرتا ہے[۱۳]۔

مغربی تہذیب کی اقدار کی پیش رفت اور نفوذ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا بنیادی کردار ہے۔ سائنسی اور تکنیکی ایجادات و آلات ہی پس ماندہ اقوام میں قبولیت حاصل نہیں کرتے، بلکہ سائنسی برتری اور پیش رفت ان کے ذہنوں کو مرعوب کر دیتی ہے۔ نوآبادیاتی دور میں امت مسلمہ بوجوہ سائنسی ترقی میں کوئی معرکہ انجام نہ دے سکی۔ مولانا علی میاں انیسویں صدی میں امت مسلمہ کی ''کوتاہ قدمی'' کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> قوموں کی تاریخ اس دور میں نئے سرے سے ڈھل رہی تھی۔ اس زمانے کا ایک ایک لمحہ کئی کئی دن اور ایک ایک دن کئی برسوں کے برابر تھا۔ جس نے فرصت اور

www.abulhasanalinadwi.org

تیاری کا ایک لمحہ ضائع کیا، اس نے طویل زمانہ ضائع کر دیا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے ''لمحات'' ضائع نہیں کیے، بلکہ صدیاں ضائع کیں اور مغربی قوموں نے ایک ایک منٹ کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا، اور صدیوں کی مسافت برسوں میں طے کر لی[۱۴]۔

بیسویں صدی امت مسلمہ کی قسمت میں تبدیلی لے کر آئی۔ آزادی کی تحریکوں نے تقویت حاصل کی، مسلم اہل فکر و دانش نے اپنی شناخت نمایاں کی اور امتِ مسلمہ میں کچھ ایسی شخصیات نے جنم لیا جنہوں نے دین کامل کے شعور کے ساتھ اِس کے غلبے کے لیے راستہ ہموار کرنا شروع کیا، اور دین کامل کو زندگی میں چلتا پھرتا دیکھنے کی تمنا کے لیے منصوبہ بندی کی۔

احیاء و تجدید دین کے لیے، ثالثاً، امت مسلمہ اور بالخصوص اِس کے اصحاب فکر و دانش کے لیے ضروری ہے کہ اجتہادی صلاحیتوں سے کام لیں۔ اجتہاد یا اجتہادی صلاحیت سے کیا مراد ہے؟ مولانا علی میاں وضاحت کرتے ہیں:

> اجتہاد سے ہماری مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہو، وہ نئے پیش آنے والے مسائل زندگی میں انفراداً اور اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور استعداد رکھتے ہوں۔ وہ روح اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصولوں سے اتنی واقفیت، اور استنباطِ مسائل کی اتنی صلاحیت رکھتے ہوں کہ امت کی مشکلات کا حل تلاش کر سکیں، اور اسے اشتباہ و تحیّر کے عالم میں رہنمائی فراہم کر سکیں، نیز امامت و سیادت پر فائز افراد اتنی عقل، علم اور استعدادِ کار رکھتے ہوں، اور محنت کے لیے تیار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبیعی قوتیں بیدار کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو دفینے محفوظ رکھے ہیں، ان سے کام لے سکیں، اور انہیں اسلام کے مقاصد کے لیے مفید انداز میں استعمال میں لا سکیں[۱۵]۔۔۔

مولانا علی میاں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ عالم اسلام جب تک علم و صنعت میں غیروں کا

www.abulhasanalinadwi.org

محتاج رہے گا، غیر اُس کے وسائل سے استفادہ کرتے رہیں گے، اور عالمِ اسلام اُن سے قرض لے کر لشتم پشتم گزر بسر کرنے پر مجبور ہوگا اور غیروں کا غلبہ برقرار رہے گا۔

خود انحصاری کی تلقین کے ساتھ مولانا علی میاں کو یہ حقیقت پریشاں کیے رہی کہ امت مسلمہ میں نفاق کی بیماری نے گھر کر لیا ہے۔ اُن کے بقول "آج ہمارا مرض کفر و شرک نہیں، بلکہ نفاق ہے۔ یہ ہماری دورنگی اور تضادِ عملی ہے جس نے معاشرے کا سینہ جکڑ رکھا ہے، اور مسلمان کچھ کرنے کے قابل نہیں رہے۔ وہ اسلام کا پیغام دنیا کے سامنے پیش کرنے سے ہچکچا رہا ہے، حالانکہ ہمارے معاشروں کو اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنا چاہیے[۱۶]۔" مولانا علی میاں قافلۂ دعوت وعزیمت کے فردِ فرید شیخ عبدالقادر جیلانی کے ایک وعظ کی جانب توجہ دلاتے ہیں جس میں حضرت جیلانی نے مسلمانوں کے قائدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

> اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان [اسلاف] سے کیا نسبت۔ اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے بندگان خدا کے ڈاکوؤ! تم کھلے نفاق میں مبتلا ہو۔ یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو اور زاہدو! بادشاہوں اور سلاطین کے لیے کب تک منافق بنے رہو گے کہ اُن سے دنیوی زر و مال اور اس کی شہوات و لذات حاصل کرتے رہو گے[۱۷]۔

مزید براں تجدید و احیائے دین کے لیے امت مسلمہ کی حقیقی وحدت ضروری ہے۔ آج امت مسلمہ نوآبادیاتی اثرات اور ذاتی و گروہی نفسانی خواہشات یا جاہلی عصبیتوں کے تحت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے۔ اِس میں وحدت کا سرا کہیں گم ہو گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں، اور ایسا تو مسلسل ہو رہا ہے کہ امت مسلمہ کے کسی ایک حصے کے خلاف مسلسل جارحیت ہوتی رہتی ہے، مگر امت کے باقی حصے ٹس سے مس نہیں ہوتے، اور بعض اوقات تو ان کا شمار جارحیت کرنے والوں کے دوستوں میں ہوتا ہے۔ مولانا علی میاں کے الفاظ میں آج امت مسلمہ "بکھری ہوئی بھیڑوں کا ایک گلہ" بن گئی ہے، اور اِس میں ہر جماعت

www.abulhasanalinadwi.org

''بس اپنے چارے اور نسل کشی میں لگ گئی ہے اور ہر ایک نے فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ اپنی ذات میں مگن رہے گی۔ جب سے یہ حال ہوا ہے، اسلام اور مسلمان ذلت کا شکار ہو گیا ہے[۱۸]۔''

قرآن وسنت کے احکام میں جہاد بالسیف کو بایں سبب اہمیت حاصل ہے کہ دین حق کی مفید اور پاکیزہ فصل اگانے کے لیے باطل کی نقصان دہ اور ضرر رساں جڑی بوٹیوں کا اکھاڑنا ضروری ہے۔ توحید و رسالت کے لیے کفر والحاد اور شرک و بے راہ روی کا خاتمہ ضروری ہے۔ ظالم سے رحم کی بھیک مانگی جائے تو ظالم دلیر ہو جاتا ہے۔ دشمن درخواستوں اور اپیلوں سے اپنی روش تبدیل نہیں کرتے۔ مومن کے لیے جذبۂ صادقہ کے ساتھ مادی قوت کا حصول ضروری ہے، اور گھوڑے تیار رکھنے کا اسے حکم ہے۔ امت مسلمہ نے جب سے یہ رویہ پس پشت ڈالا ہے، عزت و وقار اُس سے روٹھ گئی ہے۔ دشمن کے بالمقابل کیل کانٹے سے لیس ہونے کے ساتھ سخت کوشی اور دلوں میں جذبۂ جہاد کا موجزن ہونا بھی ضروری ولابدی ہے۔ آرام وآسائش کے رسیا اور دُنیوی فوائد ولذات کو ہی سب کچھ سمجھنے والوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ میدانِ جنگ کی مشقتوں اور تکلیفوں سے عہدہ برآ ہوسکیں گے۔ مولانا علی میاں نے امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب کی ایک تقریر کا اقتباس نقل کیا ہے جو مجاہدین کو مخاطب کرتے ہوئے کی گئی تھی، کہا گیا ہے:

> تن آسانی وراحت طلبی کی زندگی اور عجمی لباسوں سے ہمیشہ دور دور رہنا، دھوپ میں بیٹھنے اور چلنے کی عادت برقرار رکھنا کہ وہ عربوں کا حمام ہے۔ جفاکشی، سادہ زندگی، صبر وتحمل، موٹے جھوٹے پہننے کے عادی رہو، گھوڑے پر جست لگا کر بے تکلف بیٹھنے کی عادت ڈالو[۱۹]۔

آج دنیا کی صورتِ حال بدل چکی ہے، گھوڑے پر جست لگا کر بیٹھنے کی جگہ ٹینکوں میں سوار ہونے، اور آواز سے تیز تر طیاروں پر ماہرانہ قدرت کی ضرورت ہے اور اِس سب کچھ کے لیے اُسی محنت، جفاکشی اور یکسوئی کی ضرورت ہے جس کی توقع حضرت عمرؓ اپنے مجاہد ساتھیوں سے کر رہے تھے۔

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا علی میاں نے اسلام کی تجدید و احیاء کے لیے فکری اور عملی پہلوؤں پر اظہارِ خیال کے ساتھ اس بنیادی مسئلے پر بھی توجہ دی ہے کہ اس کارِ عزیمت کے لیے افرادِ کار کی ضرورت ہے۔ مولانا نے لکھا ہے:

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک اس میں وقتاً فوقتاً ایسے اشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ دماغی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اتحاد، جوش اور قوتِ عمل پیدا کردیں[۲۰]۔

ایک اور موقع پر آپ نے کہا:

ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اس دعوت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں، اور پھر اس کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیں، وہ کسی منصب و جاہ کے خواہش مند نہ ہوں، حکومت و ملازمت ان کا مقصد نہ ہو، وہ کسی سے کینہ و بغض نہ رکھیں، وہ فائدہ دینے والے ہوں، نقصان نہ پہنچائیں۔ وہ دینے والے بنیں، لینے والے نہ بنیں[۲۱]۔

مولانا علی میاں نے مولانا محمد الیاس کے ایک خط کا اقتباس نقل کیا ہے:

ذکر سے اپنی خلوتوں کو اور خلوص کے ساتھ اللہ کی نہایت عظمت لیتے ہوئے دعوت الی الحق سے اپنی جلوتوں کو مشغول رکھو۔ ہاری تھکی طبیعتیں مت رکھو۔ ہشاش بشاش چلتا پھرتا آدمی اللہ کو نہایت محبوب ہے[۲۲]۔

مولانا علی میاں کی تمام تر کتابوں، خطابات اور مکتوبات میں احیائے اسلام کی تڑپ محسوس کی جاسکتی ہے، اور جب وہ اسلام کی بات کرتے ہیں تو وہ کامل اور مکمل دین کی بات کرتے ہیں، جو

www.abulhasanalinadwi.org

غالب ہونے کے لیے آیا ہے، مغلوب رہنے کے لیے نہیں۔ وہ ایک اکائی ہے، اس کے تمام اجزاء مل کر وحدت تشکیل دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کو کروٹ کروٹ راحتیں نصیب فرمائے، اورانہیں اپنے مقربین میں شامل کرے، اور ہمیں دینِ اسلام کا صحیح فہم دے اور اِس کے لیے کچھ کر گزرنے کی ہمت اور حوصلہ ارزانی فرمائے (آمین)۔

حواشی

۱- سید ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، کراچی: مجلس نشریات اسلام (۱۹۷۸ء)، ج۱، ص۴۱

۲- ایضاً، ص۴۲ (حاشیہ)

۳- ایضاً، ص۹۱

۴- ایضاً، ص۸۹

۵- سید ابوالحسن علی ندوی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، شام: دار القرآن الکریم (۱۹۷۷ء)، صفحات ۱۹۶-۱۹۷

۶- سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت، لکھنؤ: کتب خانہ الفرقان (۱۹۵۵ء)، ص۸

۷- ایضاً، ص۵

۸- ایضاً، ص۲۵۹

۹- ایضاً، ص۲۱۱

۱۰- ایضاً، ص۲۱۵

۱۱- سید ابوالحسن علی ندوی، بین الصورۃ والحقیقہ، لکھنؤ: المجمع الاسلامی العلمی، دار العلوم ندوۃ العلماء (۱۹۸۰ء)، ص۱۶

۱۲- سید ابوالحسن علی ندوی، ردۃ ولا ابا بکر لھا، لکھنؤ: المجمع الاسلامی العلمی، دار العلوم ندوۃ العلماء (۱۹۸۰ء)، ص۹

۱۳- سید ابوالحسن علی ندوی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، حوالہ مذکورہ، ص۴۳۵

۱۴- ایضاً، ص۲۳۵

۱۵- ایضاً، ص۱۹۵

۱۶- سید ابوالحسن علی ندوی، فی ظلال البعثۃ المحمدیہ، ص۱۴

www.abulhasanalinadwi.org

۱۷- عبدالقادر جیلانی، فیوض یزدانی، کراچی: دارالاشاعت (۱۹۶۵ء)، ص۹ ۲۷

۱۸- سیدابوالحسن علی ندوی، واعتصماہ، لکھنؤ: المجمع الاسلامی العلمی، دارالعلوم ندوۃ العلماء (۱۹۸۰ء)، ص ۱۰

۱۹- سیدابوالحسن علی ندوی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، حوالہ مذکورہ، ص ۴۳۴

۲۰- سیدابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت وعزیمت، حوالہ مذکورہ، ج ۱، ص ۳۵

۲۱- سیدابوالحسن علی ندوی، فی ظلال البعثۃ المحمدیہ، حوالہ مذکورہ، ص ۲۱

۲۲- سیدابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد الیاس اوران کی دینی دعوت، حوالہ مذکورہ، ص ۲۷۱

www.abulhasanalinadwi.org

۳

www.abulhasanalinadwi.org

خورشید رضوی

مولانا علی میاں بحیثیت ادیب

بیسویں صدی کے غروب کے ساتھ علم و ادب اور صلاح و تقویٰ کا وہ آفتابِ درخشاں بھی غروب ہو گیا جس کی رحلت عربی کے دو مشہور شعر یاد دلاتی ہے۔ ایک شعر عبدہ بن الطبیب کا ہے:

فما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنّه بنيان قوم تهدّما [1]

(قیس ایسا نہ تھا کہ اُس کے مرنے کو فردِ واحد کا مرنا تصور کیا جا سکے، وہ تو پوری ایک قوم کی عمارت تھی جو منہدم ہو گئی۔)

اور دوسرا ابونواس کا

وليس لله بمستنكر
ان يجمع العالم في واحد [2]

(اللہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ ایک جہان کو ایک فرد میں سمو دے۔)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، یا مختصراً مولانا علی میاں کی شخصیت ایسی ہی جامع صفات شخصیت تھی۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور اُن کی رخصت ایک فرد کی نہیں، ایک ادارے کی رخصت ہے۔ مولانا کی کثیر الجہات شخصیت کا ایک پہلو اُن کا ادبی پہلو ہے جس پر مجھے سرسری سی نظر ڈالنا ہے۔

زہد و ورع کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق ایک ایسا امتزاج ہے جو نایاب نہیں تو بہت کم یاب ضرور ہے۔ مولانا علی میاں کو یہ امتزاج ورثے میں ملا۔ اُن کے پردادا سید عبدالعلی

www.abulhasanalinadwi.org

صاحب، فقر و درویشی کے علاوہ شاعری میں بھی دستگاہ رکھتے تھے اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے[3]۔ مولانا کے دادا حکیم سید فخر الدین صاحب طب اور علوم ظاہری میں ید طولیٰ رکھنے کے ساتھ ساتھ شیخ طریقت تھے، صاحب تصانیف بھی اور اردو، فارسی اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر بھی[4]۔ مولانا کے والد گرامی سید عبدالحی صاحب بھی طبیب، عالم باعمل، صوفی صافی تھے اور اردو، فارسی اور عربی میں شعر بھی کہتے تھے[5]۔ ''جنۃ المشرق''، ''معارف العوارف'' اور ''نزہۃ الخواطر'' جیسی بلند پایہ عربی تصانیف کے علاوہ ایام علالت میں دل بہلانے کی غرض سے انہوں نے شعرائے اردو کا مشہور تذکرہ ''گل رعنا'' ترتیب دیا[6]، جو اردو کی تاریخ شعر وادب میں ایک اہم حیثیت رکھتا ہے۔

شغل بے کاری میں تارے توڑ لاتے ہیں یہ لوگ
دیکھیے اہل جنوں کو کچھ نہ کرنے دیجیے

ان کے عربی طرز تحریر کے بارے میں خود مولانا علی میاں رقم طراز ہیں کہ ''وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی پوری ہزار سالہ علمی تاریخ میں ایسی سلیس و شگفتہ عربی زبان لکھنے والا (ہمارے علم میں) نہیں گزرا''[7]۔ مولانا علی میاں کی والدہ ماجدہ، سیدہ خیر النساء بھی عابدہ، زاہدہ اور حافظۂ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ مصنفہ و شاعرہ تھیں۔ اُن کی مناجاتوں اور نعتوں کا مجموعہ ''بابِ رحمت'' کے نام سے ۱۹۲۵ء میں شائع ہو کر نہایت مقبول ہوا[8]۔

اس علمی میراث کے سونے پر مولانا علی میاں کی ذاتی وسعتِ مطالعہ اور ریاضت نے سہاگے کا کام کیا، اور آپ کے قلم نے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں یکساں سلاست و سہولت سے روانی دکھائی اور ایک ایسا ادبی اسلوب پیدا کیا جس کی خوشبو مشرق سے مغرب تک پھیل گئی۔ دونوں زبانوں میں مولانا کی تصانیف کی فہرست صرف طویل ہی نہیں، بلکہ اس اعتبار سے عریض و عمیق بھی ہے کہ اُن کے موضوعات میں بلا کا تنوع ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اس فہرست میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' جیسی فکری تصانیف بھی ہیں جن کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا، سیرت مطہرہ پر وقیع کام بھی ہے، سفر نامے بھی ہیں، ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کی ولولہ انگیز جلدیں بھی ہیں، ''پرانے چراغ'' جیسے زندہ و متحرک شخصی خاکے بھی ہیں، ''کاروان زندگی'' جیسی تفصیلی آپ بیتی بھی ہے، سید احمد شہید اور دیگر بزرگوں کے تذکرے بھی ہیں، بچوں کے لیے ''قصص النبیین'' جیسا دل کش سلسلہ بھی ہے، اقبالیات پر ''روائع اقبال'' جیسی مؤثر کتاب بھی ہے جس نے دنیائے عرب میں اقبال کو متعارف کرانے میں بہت اہم کردار ادا کیا، غرض موضوعات کی ایک دھنک ہے جس کے سب رنگوں میں ان کا قلم اپنی بہار دکھاتا ہے، اور مواد ہی نہیں، اپنے لطیف ادبی اسلوب سے بھی متاثر کرتا ہے۔

اردو ادب اور اُس کی تاریخ پر مولانا علی میاں کی دقیق نگاہ کا اندازہ کرنا ہو تو وہ بیس بائیس صفحے دیکھ لینا کافی ہوگا، جو انہوں نے اپنے والد ماجد کی تصنیف ''گل رعنا'' پر بات کرتے ہوئے، اور مولانا محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے ''حیاتِ عبدالحی'' میں شامل کیے ہیں۹۔ یہ تحریر دیکھ کر ذرا دیر کو تو یہی خیال ہونے لگتا ہے کہ مولانا کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے اور وہ اسی کوچے کے آدمی ہیں۔ ساتھ ہی امام شافعی کا یہ شعر یاد آتا ہے:

ولو لا الشعر بالعلماء یُزری
لکنتُ الیوم أشعر من لبید۱۰

(اگر یہ بات نہ ہوتی کہ شاعری اہل علم کے شایان شان نہیں تو
آج میں لبید سے بھی بڑا شاعر ہوتا۔)

مولانا کا اردو میں صاحب اسلوب ہونا تو اس لیے چنداں تعجب کی بات نہیں کہ اردو اُن کے گھر کی زبان تھی، مگر قرآن کی زبان سے اُن کا شغف اس قدر بے پایاں تھا کہ مجھے بسا اوقات یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُن کا عربی اسلوبِ نگارش خود اُن کے اردو اسلوب کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی مبالغہ محسوس نہیں ہوتا کہ اُن کی عربی تحریر پر اہل زبان رشک اور ہم فخر کر

www.abulhasanalinadwi.org

سکتے ہیں۔ مولانا کی عربی اس قدر سلیس، خوش آہنگ، دل نشیں اور خواندنی (readable) ہوتی ہے کہ کتاب ایک دفعہ ہاتھ میں لے کر ختم کیے بغیر رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

عربی سے مولانا کا شغف بچپن ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ سولہ سترہ برس کی عمر میں وہ اس قابل ہو چکے تھے کہ اُن کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب نے سید احمد شہید صاحب پر مولانا محی الدین قصوری کا ایک بسیط مضمون عربی میں ترجمے کے لیے انہیں دیا، اور یہ ترجمہ اُس وقت عالم اسلام کے وقیع ترین رسالے ''المنار'' میں اشاعت کے لیے اس کے مدیر علامہ سید رشید رضا کو بھجوا دیا گیا۔ علامہ نے اسے نہ صرف ''المنار'' میں بالاقساط شائع کیا، بلکہ ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے عنوان سے علیحدہ رسالے کی شکل میں بھی اسی کی اشاعت کا اہتمام کیا[۱۱]۔

اسی زمانے کے لگ بھگ پہلی بار اُن کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی اور انہوں نے علامہ کی نظم ''چاند'' کا عربی ترجمہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ علامہ نے اسے بغور دیکھا اور اُن سے بعض عرب شعراء کے بارے میں چند سوال کیے تاکہ اس میدان میں اُن کی معلومات اور مطالعے کا اندازہ ہو سکے[۱۲]۔ شاید اقبال کو یقین نہ آیا ہو کہ یہ عربی ترجمہ واقعی اسی سولہ برس کے لڑکے نے کیا ہے، اور انہوں نے اطمینان کرنا چاہا ہو۔

مولانا علی میاں کو کلام اقبال سے زندگی بھر گہرا شغف رہا۔ اکتوبر ۱۹۹۷ء میں جب وہ رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار میں شرکت کے لیے لاہور تشریف لائے تو کئی بار اُن سے ملنے اور ان کے ارشادات سننے کا شرف حاصل ہوا۔ شخصیت کی اُس پاکیزگی کے علاوہ جسے دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، مولانا کی شیریٔ گفتار اور اُن کے ارشادات کے ادبی معیار نے بھی بہت متاثر کیا۔ وہ اپنے احساسات کی وضاحت کے لیے اقبال کے اشعار اپنی گفتگو میں برجستہ شامل فرماتے تھے۔ ایک موقع پر اقبال کے عمیق اسلامی احساسات اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اُن کا مشہور فارسی قطعہ:

www.abulhasanalinadwi.org

باین پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ[۱۳]

کمال گرمی اور جوش کے ساتھ پڑھا اور وضاحت فرمائی کہ اقبال کی یہ تصویر کس قدر زندہ و حقیقی ہے اور کس طرح پایانِ عمر میں یہ احساس کہ زندگی مقیم آستانِ غیر رہنے میں گزر گئی، اس پرندے کے احساس سے مشابہ ہے جسے صحرا میں شام ہو جائے اور وہ تیزی سے آشیانے کی طرف پر کشا ہونا چاہے۔

عربی میں مولانا کے قلم کی روانی نے دنیائے عرب کو خوب سیراب کیا۔ مثال کے طور پر دمشق سے نکلنے والے ایک ہی ماہنامہ ''المسلمون'' کی پچاس کی دہائی کی فائلیں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ مصطفیٰ السباعی، عمر فروخ، علی الطنطاوی، شکیب ارسلان، مصطفیٰ الزرقاء، محمود شلتوت، سید قطب، محمود محمد شاکر، محمد البشیر الابراہیمی، حسن البنا، عبدالقادر عودہ، محبّ الدین الخطیب اور محمد عزہ دروزہ جیسے اہل زبان اہل قلم کے پہلو بہ پہلو مولانا علی میاں کی تحریریں تسلسل کے ساتھ ان صفحات کی زینت نظر آئیں گی، بلکہ ان کا تناسب اور تسلسل دوسرے سب لکھنے والوں کی تحریروں سے زیادہ ہوگا۔ شاید ہی کوئی شمارہ ایسا نکلے جس میں مولانا علی میاں کی تحریر شامل نہ ہو۔

اسی رسالے ''المسلمون'' کی چھٹی جلد کے تیسرے شمارے میں مولانا کے نام شیخ علی الطنطاوی کا وہ کھلا خط شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے کمال محبت و لجاجت کے لہجے میں مولانا سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ عالم عرب کو کلام اقبال کے صحیح ذائقے سے روشناس کرائیں کہ اب تک کے عربی تراجم یہ کام نہیں کر سکے۔ شیخ علی الطنطاوی نے لکھا:

فهل تضيف يا أخي! يا أبا الحسن إلى مآثرك هذه المأثرة، فتفتح

www.abulhasanalinadwi.org

للعرب كوة على هذه الروضة المحجبة أو تحمل إليهم زهرات منه فتحسن بذلك إلى العرب و باكستان وإلى الأدب والإسلام[14]

(سوا ے بھائی، اے ابوالحسن! کیا تم اپنے فضائل میں اس ایک فضیلت کے اضافے سے ممنون کرسکو گے کہ اس پوشیدہ چمن کی جانب، عربوں کے لیے ایک روزن کھول دو، یا اس میں سے کچھ پھول چن کر انہیں لا دو اور یوں عربوں کے ساتھ اور پاکستان کے ساتھ اور ادب اور اسلام کے ساتھ ایک نیکی کرو۔)

اس کے جواب میں اِس خُلق کریمانہ نے مولانا کے سینے میں جوش مارا جو نجیبوں کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ خود انہی کے الفاظ سنیے جو عربی میں اُن کے سلیس، بلیغ اور دل نشیں اسلوب کی ایک مثال بھی ہیں:

وقد صادف هذا الاقتراح مني هوىً و نشاطاً و أثار القريحة، التي خمدت و فترت من زمان، فترجمت قصيدته البديعة " في مسجد قرطبة" في جلسة واحدة. و شعرت باستعداد في نفسي ورغبة لذيذة في الترجمة، لا استطيع لها دفعاً، وجاء ت المقالات تترى و نشرت في بعض المجلات العربية الاسلامية---[15]

(اس تجویز سے میرے دل میں ایک آرزو اور امنگ جاگ اٹھی اور مدتوں کی بجھی ہوئی افسردہ طبیعت نے جوش مارا اور میں نے، ایک ہی نشست میں اقبال کی بے مثل نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ترجمہ کر ڈالا اور مجھے اپنے دل میں ایک ایسی آمادگی اور ترجمے کے لیے ایسی پر لطف رغبت کا احساس ہوا جسے ٹالنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔ مضامین پے بہ پے وارد ہوتے چلے گئے اور بعض عربی اسلامی رسالوں میں شائع ہوئے۔)

یہی وہ مضامین تھے جنہوں نے مولانا کی معرکے کی کتاب ''روائع اقبال'' کی شکل اختیار

www.abulhasanalinadwi.org

کی۔ اس کتاب نے دیارِ عرب میں اقبالیات کے تعارف میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا اور عرب نوجوانوں میں بہت مقبول ہوئی۔ یہاں پھر مولانا ہی کا ایک عربی اقتباس لانا چاہوں گا کہ یہ اقتباسات ''مشک آنست کہ خود ببوید'' کے مصداق میرے آج کے موضوع کے لیے مضبوط ترین دلیل فراہم کرتے ہیں۔ کتاب کی تیسری اشاعت کے پیش لفظ میں بطور تحدیثِ نعمت مولانا نے لکھا:

> **و قد تلقى هذا الكتاب بقبول عظيم، و كان من كتب الشباب المسلمين المثقفين الحبيبة الاثيرة المفضلة، فكثرت قراء تهم له، وعنايتهم به، حتى وعته ذاكر تهم، و ذلت به السنتهم و أقلامهم، و حفظ كثير منهم قطعا و صفحات من الكتاب، و كثر اقتباسهم منه، و استشهادهم به في أحاديثهم و مقالاتهم[١٢]**
>
> (اس کتاب کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ پڑھے لکھے شائستہ مسلمان نوجوانوں کی پسندیدہ کتاب ٹھہری جسے وہ ترجیحی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے اسے خوب پڑھا اور اس پر خوب توجہ دی، تا آنکہ یہ اُن کے حافظے پر نقش ہوگئی اور زبان وقلم پر رواں ہوگئی۔ بہت سوں نے اس کے ٹکڑے کے ٹکڑے اور صفحوں کے صفحے زبانی یاد کر لیے اور اپنی گفتگو اور تحریروں میں جابجا اس کے اقتباسات لانے اور اس سے استشہاد کرنے لگے۔)

مولانا کے مندرجہ بالا دو اقتباسات ہی ـــــ جواز خود سیاق کلام میں آ گئے ہیں، چُن کر نہیں لائے گئے ـــــ اُن کے اُس فطری و برجستہ، شستہ و رفتہ عربی اسلوب کی آئینہ داری کے لیے کافی ہیں جس میں کسی مشاطگی کے بغیر فطرت کی حنا بندی کا حسن، نگاہوں کو خیرہ نہیں کرتا، بلکہ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ''**قراء تهم له**''، ''**عنايتهم به**'' اور ''**اقتباسهم منه**'' جیسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں صِلات کی صحت کا اہتمام لائق توجہ ہے۔ مولانا کے اسلوب کی یہ سادگی و

www.abulhasanalinadwi.org

پرکاری سہل ممتنع کی سادگی و پرکاری ہے جو دیکھنے میں بڑا آسان، مگر حقیقت میں بہت ریاضت طلب ہوتا ہے۔

مولانا کی عربی نگارشات میں جابجا ایسے جملے آجاتے ہیں جو عربوں کے قدیم ادب وثقافت میں رچے ہوئے اور ٹھیٹھ عربی سلیقۂ کلام میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں ایک ٹھیٹھ عرب کی طرح عربی ہی میں سوچا گیا ہے، چنانچہ ان کا ترجمہ کرنا ان کے لطف کو برباد کردینے کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سیرت پر مولانا اپنی عربی تصنیف ''المرتضیٰ'' کے دیباچے میں یہ بیان فرماتے ہوئے کہ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کی یہ فرمائش تھی کہ میں حضرت علیؓ کی سیرت پر قلم اٹھاؤں، کہتے ہیں:

> **قال لي ذلك و قوسي موترة و فرسي مسرجة في ميدان التاليف والكتابة** ۱۷ (یہ بات انہوں نے مجھ سے اس زمانے میں کہی جب تصنیف وتالیف کے میدان میں میرے گھوڑے پہ زین اور میری کمان میں تانت خوب کسی ہوئی تھی۔)

گویا اردو کے محاورے میں

یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں تھا

اب اس ''قوسي موترة'' و ''فرسي مسرجة'' کا لطف اٹھانے اور داد دینے کے لیے عربی ادب کا ذوق اور ایسا جملہ لکھنے کے لیے برسوں کی ریاضت درکار ہے۔

بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں، بلکہ بڑوں کے لیے لکھنے سے بدرجہا زیادہ مشکل ہے۔ مولانا علی میاں نے بچوں کے لیے عربی زبان میں ''قصص النبیین'' کے عنوان سے پانچ حصوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی کہانیوں پر مشتمل جو سلسلہ تحریر کیا ہے، وہ اُن کے ادبیانہ

www.abulhasanalinadwi.org

کمال کی توثیق مزید ہے۔ ''قصص النبیین'' مولانا نے ابتداءً اپنے برادر زادے کے لیے لکھنا شروع کی جس نے عربی میں ابتدائی استعداد حاصل کر لی تھی، لیکن یہ وہی ''خطاب بہ جاوید۔ سخنے بہ نژادنو'' والا معاملہ تھا کہ ایک بچے کے پردے میں ساری ملت کے بچوں کے لیے ایک سرمایہ تیار کیا جارہا تھا۔ مولانا نے پہلے حصے کے پیش لفظ میں لکھا:

ابن أخي العزيز

أراك حريصا على القصص والحكايات. و كذلك كل طفل فى سنك. تسمع هذه القصص بكل رغبة و تقرأها بكل رغبة . ولكنى اتاسف لا نى لا أرى فى يدك الا حكايات السنانير و الكلاب و الاسد والذئاب والقردة والدباب . و علينا العهدة فى ذلك فذلك هو الذى تجده مطبوعا[18]

(عزیز بھتیجے!

میں دیکھتا ہوں کہ تم قصے کہانیوں سے بہت شغف رکھتے ہو۔ تمہاری عمر کے ہر بچے کا یہی حال ہے۔ تم یہ کہانیاں کمال شوق سے سنتے اور کمال ذوق سے پڑھتے ہو، مگر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ میں بلی کتوں، شیر بھیڑیوں اور بندروں ریچھوں کی کہانیاں ہی دیکھتا ہوں، اور اس کے ذمہ دار ہم ہیں، کیونکہ تمہیں یہی کچھ چھپا ہوا ملتا ہے۔)

''قصص النبیین'' میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات نہایت سادہ، مگر از حد دل کش پیرائے میں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بیان کیے گئے ہیں، اور بعض الفاظ کی تکرار اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے تأثر بھرپور ہو گیا ہے، مگر اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ پانچوں حصوں کے اسلوب میں تدریج (gradation) کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ حصہ اول میں جملے بہت مختصر اور تکرار زیادہ ہے۔ رفتہ رفتہ تکرار کم ہوتی جاتی ہے، جملے لمبے اور عبارت رواں ہونے لگتی ہے اور ذخیرہ الفاظ میں دبے

www.abulhasanalinadwi.org

پاؤں کچھ ایسے الفاظ بھی شامل ہونے لگتے ہیں جو اگر آغاز میں آتے تو مشکل معلوم ہوتے۔ قرآنی آیات کو جا بجا کہانی کے سیاق میں جوں کا توں کھپا دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے حصے میں جب وہ واقعہ بیان ہو چکا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو توڑ کر کلہاڑی بڑے بت کی گردن میں لٹکا دی تو ''من فعل هذا ؟ (یہ کس کا کام تھا؟)'' کے عنوان سے کہانی یوں آگے بڑھتی ہے:

ورجع الناس و دخلوا في بيت الاصنام

وأراد الناس أن يسجدوا للأصنام لأنه يوم عيد

ولكن تعجب الناس و دهشوا

و تأسف الناس و غضبوا

قالوا! :(من فعل هذا بآلهتنا)؟

(قالوا: سمعنا فتى يذكرهم يقال له إبراهيم)

(قالوا: أ أنت فعلت هذا بآ لهتنا يا إبراهيم)

(قال: بل فعله كبيرهم هذا فاسئلوهم إن كانوا ينطقون)[19]

قارئین دیکھ سکتے ہیں کہ آخری چار سطریں قرآنی متن پر مشتمل ہیں جنہیں کمال چابک دستی سے کہانی کا حصہ بنا کر بچوں کے لیے مطالعۂ قرآن کی راہ ہموار کر دی گئی ہے۔ جب وہ یہی الفاظ قرآن میں پڑھیں گے تو اُن کے دل و دماغ کے لیے یہ بات یاد کی خوشگوار سنسنی (nostalgic thrill) کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ ادب کے لیے نفسیات دانی اور بلاغت کے لیے کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا جس انداز میں ضروری ہے، اُس کا اظہار ''قصص النبیین'' میں بڑی خوبی سے ہوتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے کے حرفِ آغاز میں ازہری استاد احمد الشرباصی نے بہت خوب کہا ہے:

ولست محتاجا إلى الإفاضة في الإشادة بما وهب الله لأخينا المفضال السّيد أبي الحسن من مواهب يغبط عليها عند كرام

www.abulhasanalinadwi.org

الرجال و يُحسد عليها عند لئامهم. فحسبه فخراً أن يوفقه الله فيؤلّف كتبا للخاصّة، تعلو و تدقّ، و تتّسع و تعمق، و تسير بين القارئين الكبار فتشرق و تغرّب بعد أن ازدانت بالفكرة السليمة والأسلوب الرّفيع والتحليق السّامي، ثمّ يوفقه الله أيضا إلى أن يُقرب بعبارته السهلة و بيانه الرقيق أهداف القصة القرآنية إلى عقول الناشئة المسلمة، "ذلك فضل الله يوتيه من يشاءُ والله ذو الفضل العظيم". ۲۰

(اللہ نے ہمارے فاضل بھائی سید ابوالحسن کو جو صلاحیتیں عطا کی ہیں، مجھے اُن کی توصیف میں طول کلام کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ وہ صلاحیتیں ہیں کہ جن پر کریموں کو رشک اور لئیموں کو حسد ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر فخر کی کیا بات ہوگی کہ اللہ کی توفیق سے وہ خواص کے لیے کتابیں لکھتے ہیں جن میں بلندی اور باریکی اور وسعت اور گہرائی ہوتی ہے اور وہ بڑوں میں خوب رواج پاتے ہوئے سلامتی فکر، رفعتِ اسلوب اور بلند پروازی سے آراستہ مشرق و مغرب میں پھیل جاتی ہیں۔ پھر اللہ ہی کی توفیق سے وہ اپنی سہل عبارت اور لطیف بیان سے قرآنی کہانی کے مقاصد کو مسلمانوں کی نئی نسل کے ذہنوں کے قریب لے آنے کا کام بھی کر دکھاتے ہیں۔ ''یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔'')

کتاب کے اس دوسرے حصے میں مولانا نے کہانیوں کے بین السطور کچھ تاریخی و تفسیری اشارات بھی بڑے سلیقے سے سمو دیے ہیں جن کے بارے میں بچوں کے متجسس ذہنوں میں سوال ابھر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ بت پرستی کا آغاز کیوں ہوا؟ مولانا نے اس کی نفسیاتی وجوہ کو کمال تدریج کے ساتھ تصویر، تمثیل اور صنم پرستی کے مراحل کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے بڑی سادگی کے ساتھ یہ واضح کر دیا ہے کہ، بقول اقبال:

www.abulhasanalinadwi.org

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را[۲۱]

مولانا کا دل کش عربی اسلوب دیکھ کر میرے دل میں یہ تجسس پیدا ہوتا تھا کہ اُن کے پسندیدہ عرب ادیب کون کون سے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں جب اُن سے ملاقات کا موقع ملا تو میں نے یہ سوال کر ہی ڈالا۔ انہوں نے فوری طور پر دو نام لیے، ایک سید قطب اور دوسرے ڈاکٹر احمد امین۔ ''قصص النبیین'' کے تیسرے حصے کا دیباچہ سید قطب کے قلم سے ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا علی میاں کے پسندیدہ ادیب نے اُن کے کام پر یہ رائے دی ہے:

ولقد قرأت الكثير من كتب الأطفال ـــ بما في ذلك قصص الأنبياء عليهم الصلوات والسلام ـــ و شاركت في تأليف مجموعة "القصص الدّيني للأطفال" في مصر، مأخوذًا كذلك من القرآن الكريم. ولكني أشهد في غير مجاملة– أنّ عمل السيّد أبي الحسن في هذه القصّة التي بين يديّ، جاء أكمل من هذا كلّه ـــ[۲۲]

(میں نے بچوں کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں جن میں انبیاء علیہم الصلوات والسلام کی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ میں نے خود بھی مصر میں ''بچوں کے لیے دینی کہانیاں'' کے عنوان سے ایک مجموعے کی تالیف میں شرکت کی ہے جو اسی طرح قرآن کریم سے ماخوذ تھا، لیکن میں کسی خوشامد کے بغیر یہ کہتا ہوں کہ اس کہانی میں جو میرے سامنے ہے، سید ابوالحسن کا کام اس سارے کام سے بڑھ کر مکمل ثابت ہوا ہے۔)

مولانا علی میاں ادب لکھتے ہی نہیں، ادب بولتے بھی تھے۔ مثال کے طور پر اُن کی تقاریر کا وہ مجموعہ ہی دیکھ لیجیے جو ''حدیث پاکستان'' کے عنوان سے شائع ہوا[۲۳]، اور جس میں اُن کے ۱۹۷۸ء کے دورۂ پاکستان کے دوران میں مختلف اجتماعات، جامعات اور مدارس میں کی گئی تقاریر کا ریکارڈ ہے۔ ان تقریروں میں بھی ویسی ہی برجستگی اور ادبی شان نظر آتی ہے جو مولانا کی تحریروں کا خاصہ ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اپنی تشنہ و عاجلانہ سی تحریر ختم کرنے سے پیشتر ایک بات عرض کر دینا برمحل معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک ادبی صلاحیت سمیت تمام انسانی مواہب کا کمال اسی بات میں مضمر ہے کہ انہیں حق اور اس کی اعلیٰ اقدار کے فروغ کا وسیلہ بنایا جائے۔ ۱۹۹۷ء میں انہوں نے لاہور میں اپنے ایک خطاب کے دوران میں کمال خروش کے عالم میں علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھے:

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا، وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا[۲۴]

حواشی

۱- دیوان الحماسۃ، باب المراثی، دوسرا قطعہ

۲- دیوان أبی نواس (تحقیق احمد عبدالمجید الغزالی)، بیروت: دار الکتاب العربی (۱۹۵۳ء)، ص ۴۵۴

۳- سید ابوالحسن علی ندوی، حیات عبدالحی، پونہ: اردو مراٹھی پرکاشن (۱۹۸۸ء)، ص ۲۶، ص ۲۸

۴- ایضاً، صفحات ۳۵-۳۶

۵- اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، لاہور: دانش گاہ پنجاب (۱۹۷۳ء)، جلد ۱۲، صفحات ۸۵۵-۸۵۷

۶- سید عبدالحی، تذکرۂ شعرائے اردو موسوم بہ گلِ رعنا، اعظم گڑھ: مطبع معارف (۱۳۷۰ھ)، ص ۳ (دیباچہ)،

www.abulhasanalinadwi.org

نیز دیکھیے: حیات عبدالحی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۳۳

۷- سید ابوالحسن علی ندوی، حیات عبدالحی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۵۷

۸- سید ابوالحسن علی ندوی، ذکرِ خیر، کراچی: مجلس نشریات اسلام (۱۹۷۷ء)، صفحات ۲۲-۲۳، صفحات ۴۶-۴۷

۹- سید ابوالحسن علی ندوی، حیات عبدالحی، حوالہ مذکورہ، صفحات ۳۱۷-۳۴۰

۱۰- دیوان الشافعی (تحقیق محمد عفیف الزعبی)، بیروت: دارالنور (۱۹۷۱ء)، ص ۳۹

۱۱- سید ابوالحسن علی ندوی، حیات عبدالحی، حوالہ مذکورہ، ص ۹ (پیش لفظ)

۱۲- ابوالحسن علی الندوی، روائع اقبال، کراچی: مجلس نشریات اسلام (۱۹۸۳ء)، ص ۷

۱۳- اقبال، کلیات اقبال فارسی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ص ۹۰۶

۱۴- سید ابوالحسن علی ندوی، روائع اقبال، حوالہ مذکورہ، ص ۱۵

۱۵- ایضاً، صفحات ۱۵-۱۶

۱۶- ایضاً، آغاز کتاب (صفحہ ندارد)

۱۷- سید ابوالحسن علی الندوی، المرتضیٰ، دمشق: دارالقلم (۱۹۸۹ء)، ص ۸

۱۸- سید ابوالحسن علی الندوی، قصص النبیین، کراچی: مجلس نشریات اسلام (س-ن)، حصہ ۱، ص ۳

۱۹- ایضاً، صفحات ۱۰-۱۱

۲۰- ایضاً، حصہ ۲، ص ۵

۲۱- اقبال، کلیات اقبال فارسی، حوالہ مذکورہ، ص ۶۳۶

۲۲- سید ابوالحسن علی ندوی، قصص النبیین، حصہ ۳، ص ۴

۲۳- سید ابوالحسن علی ندوی، حدیث پاکستان، کراچی: مجلس نشریات اسلام (۱۹۷۹ء)

۲۴- اقبال، کلیات اقبال اردو، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، صفحات ۵۸۰-۵۸۱

www.abulhasanalinadwi.org

سہیل حسن

عرب دُنیا، عربی زبان وادب اور مولانا علی میاں

اگر یہ کہا جائے کہ بیسویں صدی کا آخری سال ۱۹۹۹ء، ملت اسلامیہ کے لیے عام الحزن ثابت ہوا ہے، تو چنداں مبالغہ نہ ہوگا۔ جون میں ایک عظیم عالم دین اور سعودی عرب کے مفتی اعظم سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن باز کا سانحہ ارتحال پیش آیا، اکتوبر میں محدث دوراں علامہ ناصر الدین الالبانی دنیا سے اُٹھ گئے، بیسویں صدی کے اختتام میں ابھی چند ساعتیں باقی تھیں کہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اس جہانِ آب وگل سے رشتہ توڑ کر اپنے رب سے جا ملے، گویا دنیا کا ایک بڑا حصہ، جب اکیسویں صدی کے لمحہ اوّل کے استقبال میں مصروف تھا، ملت اسلامیہ اپنے روشن چراغوں کے بجھ جانے پر مغموم تھی۔

مولانا سید ابوالحسن علی، جو علمی دُنیا میں علی میاں کے مختصر نام سے زیادہ معروف ہیں، عربی زبان وادب اور تاریخ وثقافت کے دلدادگان میں شامل تھے۔ وہ ایک عجمی تھے، مگر ان کی عربی نگارشات نے عالم عرب کے صاحبانِ ادب وانشاء سے جو خراج تحسین وصول کیا ہے، وہ زمانہ قریب میں کسی دوسرے غیر عرب مصنف کو حاصل نہیں ہوا۔

مولانا علی میاں کی اِس کامیابی کا راز تلاش کیا جائے تو اولاً محسوس ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ایک ایسے خانوادے میں جنم لیا تھا جسے عربی زبان وادب سے ایک گونہ شغف تھا۔ انہیں بے حد کم سنی میں اپنے عظیم والد حکیم سید عبدالحیٔ حسنی کے زیر سایہ علمی صحبتوں اور مجلسوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ خاندان کے علمی ماحول نے کم سن علی میاں میں عربی زبان سے محبت اور شیفتگی پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا، ثانیاً وہ از حد خوش قسمت تھے کہ اُنھیں انتہائی قابل اور اپنے فن میں

www.abulhasanalinadwi.org

کامل اساتذہ کی صحبت نصیب ہوئی۔ عربی زبان وادب کی تحصیل اُنہوں نے جن ماہرفن اساتذہ سے کی اُن میں ایک نام علامہ خلیل عرب کا ہے جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی زبان وادب پڑھاتے تھے، وہ نسلاً یمنی تھے، ان کے دادا شیخ حسین بن محسن انصاری ۱۸۶۹ء میں ہندوستان آئے اور ریاست بھوپال میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ شیخ حسین عربی زبان وادب کے رموز شناس تو تھے ہی، مگر اُن کی ایک دوسری حیثیت بلند پایہ محدث کی تھی۔ مولانا علی میاں کے والد سید عبدالحئی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔

مولانا علی میاں نے علامہ خلیل عرب سے ابتدائی درسی کتابوں سے لے کر عربی کے کلاسیک ادب تک کا مطالعہ کیا۔ اُن کے ہم درس علامہ خلیل عرب کے چھوٹے بھائی حسین بن محمد تھے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ''عرب'' اور ایک ''ہندی'' کو یکساں انداز تدریس سے استفادے کا موقع ملا۔

مولانا علی میاں اپنی عربی تعلیم اور علامہ خلیل عرب کے طریقۂ تدریس کے بارے میں فرماتے ہیں:

> عرب صاحب کا اپنا ایک اجتہادی نصاب تھا جس میں مصر کی نصابی نوتالیف کتابیں ''الطریقۃ المبتکرہ ۱-۴''، ''مدارج القراءۃ ۱-۳''، ''کلیلہ ودمنہ''، ''مجموعۃ من النظم والنثر للحفظ والتسمیع'' شامل تھا، چند ہی دن بعد اُنہوں نے عربی میں بولنا لازم کردیا، اردو بولنے پر دو پیسے یا ایک آنہ کا جرمانہ ہوتا تھا جو ہم لوگوں کو اکثر ادا کرنا پڑا، صرف ونحو کے سلسلہ میں زیادہ زور مشق، صحیح پڑھنے، اور وجوہ اعراب سمجھنے اور بتانے پر تھا، انشاء کی مشق بھی تھی، سبق پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم لوگ پورا سبق تیار کر کے لائیں، اور ان کو سنا دیں، ''کلیہ ودمنہ'' میں خاص طور پر اس کا اہتمام تھا۔ میرا نسخہ بہت سقیم تھا، اس کی تصحیح بھی کرنی پڑتی تھی، سبق بھی تیار کرنا پڑتا تھا، نحو کے ابتدائی مسائل کے لیے اُنہوں نے میرے ہی ایک ہم نام ابوالحسن الضریر کی چھوٹی سی

www.abulhasanalinadwi.org

کتاب ''الضریری'' پڑھائی جس میں تقریباً نحو کے سب مسائل آ گئے ہیں، جن کی عملاً ضرورت ہوتی ہے، لیکن اس میں فقہ النحو یا فلسفۃ النحو بالکل نہیں ہے۔ صرف ونحو کی قدیم نصابی کتابوں میں سے میں نے ''میزان''، ''منشعب''، ''صرف میر''، ''نحو میر'' اور ''پنج گنج'' اپنے چچا مولوی سید عزیز الرحمٰن صاحب سے پڑھی جو بڑی محنت اور نگرانی سے ان کتابوں کو پڑھاتے تھے، اور جن کے یہاں تساہل وتسامح کا کوئی خانہ نہ تھا، جب کچھ زیادہ دنوں کے لیے رائے بریلی آتا تو اس عربی کتاب کا حصہ بھی ان سے پڑھتا رہتا جو عرب صاحب کے یہاں زیر درس ہوتی تھی۔ ''مجموعۃ من النظم والنثر'' میں حصہ نثر کو بھی زبانی یاد کرنا اور سنانا پڑتا تھا، ان ابتدائی کتابوں کے بعد عربی زبان کی قدیم معیاری کتابوں کے پڑھنے کی نوبت آئی، مثلاً ''نہج البلاغۃ''، ''مقامات حریری''، ''دلائل الاعجاز'' اور ''عشر قصائد''----۱

عربی زبان وادب کے دوسرے استاد جن سے مولانا علی میاں کو استفادے کا شرف حاصل ہوا، علامہ شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی تھے، علامہ موصوف عربی زبان کے ان گنے چنے اساتذہ اور فضلاء میں سے تھے جو انشاء ولغت میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ان کے امتیاز کے لیے اتنی شہادت کافی ہے کہ جب اپنے وقت کے دو بلند پایہ انشاء پردازوں یعنی علامہ سید رشید رضا مدیر ''المنار'' اور علامہ امیر شکیب ارسلان مصنف ''حاضر العالم الاسلامی'' کا نحو وعربیت کے کسی مسئلے میں اختلاف ہوتا تو دونوں ہلالی صاحب کو ثالث بناتے تھے۲۔

علامہ ہلالی کسی وجہ سے حجاز کی سکونت ترک کر کے ۱۹۳۰ء میں ہندوستان آئے تو مولانا علی میاں کے برادر بزرگ ڈاکٹر سید عبدالعلی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے انہیں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کی دعوت دی۔ مولانا علی میاں کے الفاظ میں ''وہ عربی کیا بولتے تھے، منہ سے پھول جھڑتے تھے، الاغانی (ابوالفرج الاصفہانی) اور الامامۃ والسیاسۃ (ابن قتیبہ دینوری) کی زبان بولتے ہوئے انہیں کو سنا۳۔'' علامہ ہلالی دارالعلوم سے وابستہ ہوئے تو عام طلبہ کے ساتھ

www.abulhasanalinadwi.org

وہاں کے اساتذہ نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا، اور بالخصوص لغت اور نحو کے مسائل پر ان سے رہنمائی لی۔ مولانا علی میاں نے علامہ ہلالی سے استفادے کے حوالے سے لکھا ہے:

حقیقتاً شیخ خلیل عرب صاحب نے جو کام شروع کرایا تھا اور ہندوستان میں عربی زبان وادب کی تعلیم کے صحیح طریقے اور اس کا صحیح ذوق پیدا کرنے کا جو دور شروع کیا تھا، ہلالی صاحب کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی، میں نے بے ضابطہ طریقہ پر تو ان سے بہت استفادہ کیا، روزانہ ان کی خدمت میں حاضری دیتا، اور ان کی صحبتوں مجلسوں سے فائدہ اٹھاتا، لیکن باقاعدہ طریقہ پر ''دیوان نابغہ'' ان سے پڑھا، اور ان کے افادات نوٹ کیے، ''شرح شذور الذہب'' کی ایک جماعت میں بھی جس کو وہ اپنے گھر میں پڑھاتے تھے، شریک ہوا، ان کی ایک تصنیف کردہ ناتمام تفسیر بھی ان سے پڑھی، بھائی صاحب اور عرب صاحب کے تعلق کی وجہ سے وہ مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، اور استفادہ کا موقع دیتے تھے[۴]۔

جس محنت اور توجہ سے مولانا علی میاں نے عرب اساتذہ سے استفادہ کیا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا علی میاں کی پہلی عربی تحریر جو امام سید احمد شہید کی سیرت کے بارے میں تھی، علامہ رشید رضا نے اپنے مجلہ ''المنار'' میں شائع کی، حالانکہ مولانا کی عمر اس وقت صرف سولہ برس تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ علامہ رشید رضا نے یہ مضمون رسالے کی صورت میں الگ سے بھی شائع کیا۔ اس مضمون کے بارے میں مولانا علی میاں نے لکھا ہے:

اس سے بڑھ کر ایک ہندی نوعمر طالب علم کا کیا اعزاز ہوسکتا تھا کہ اس کا رسالہ علامہ سید رشید رضا مصر سے شائع کریں، تھوڑے عرصہ میں ''ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید'' کے عنوان سے وہ رسالہ چھپ کر آ گیا، اور میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی، میری عمر اس وقت ۱۶ سال کی رہی ہوگی، یہ میری پہلی تصنیف ہے جو نہ صرف ہندوستان، بلکہ مصر سے شائع ہوئی[۵]۔

www.abulhasanalinadwi.org

عربی زبان میں رسوخ و ممارست کا ایک اور ذریعہ وہ عربی اخبارات تھے جو ندوۃ العلماء میں آتے تھے، خصوصاً جدید عربی ادب کا تعارف انہی سے حاصل ہوا۔ ان جرائد میں دمشق کا ''فتی العرب'' اور فلسطین کا ''الجامعۃ الاسلامیہ'' (جو مفتی امین الحسینی صاحب کا ترجمان تھا)، ''المنار''، ''الہلال''، ''المقتطف''، ''مجلۃ الزہراء''، ''مجلۃ المجمع العلمی'' اور ''العرفان'' شامل تھے۔

علامہ ہلالی صاحب کی ترغیب پر محب الدین الخطیب کا ''الفتح'' بھی منگوانا شروع کیا گیا۔ اس رسالے میں اس وقت کے بلند پایہ اور فکر اسلامی کے علمبردار اہل قلم (امیر البیان شکیب ارسلان وغیرہ) مضمون لکھتے تھے۔ مولانا علی میاں کے بقول ''اس رسالہ کے مطالعہ سے جو ادب عالی اور فکر اسلامی کا جامع تھا، انہیں اور اُن کے احباب کو بڑا فائدہ پہنچا[۶]۔

ایک اور عالم جن سے مولانا علی میاں نے استفادہ کیا اور مختلف مواقع پر اُن کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے، وہ ان کے پھوپھا سید طلحہ حسنی تھے۔ ان کے بارے میں مولانا علی میاں لکھتے ہیں: ''وہ میری نگاہ میں صرف ونحو کے امام تھے، عربی کے ایسے ادیب و عالم تھے کہ عہد جاہلی و اسلامی کے مسلم الثبوت شعراء کے کئی ہزار اشعار---ان کو حفظ اور نوک زبان تھے، اسی طرح اساتذہ فارسی و اردو کا منتخب کلام ان کو بکثرت یاد تھا، عربی کے علوم بلاغت و معانی و بیان پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی اور اعجاز القرآن پر اس برصغیر ہندو پاکستان کے چند ہی علماء کا مطالعہ اتنا وسیع ہوگا---[۷]''

عربی زبان وادب کی اس ٹھوس اور راسخ تعلیم کے بعد مولانا علی میاں نے بہت جلد تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھ دیا، اور بقول مولانا علی میاں کے جب جون ۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ لاہور جانا ہوا تو علامہ اقبال کے یہاں انہیں یہ کہہ کر پیش کیا گیا کہ یہ مصنف ''گل رعنا'' [سید عبدالحی] کے فرزند ہیں اور انہوں نے آپ کی بعض نظموں کا عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے، اس وقت تک نوجوان علی میاں نے علامہ اقبال کی نظم ''چاند'' کا ترجمہ کیا تھا جسے علامہ مرحوم نے ملاحظہ فرمایا اور داد دی[۸]۔

مولانا علی میاں نے جہاں عربی زبان میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، وہاں ایک معلم

www.abulhasanalinadwi.org

اور اسلامی علوم کی تعلیم و تدریس کے لیے وقف ادارے ـــــ ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' ـــــ کے منتظم اعلیٰ کی حیثیت سے عربی زبان کی تدریس کے لیے نصابی کتب مرتب کیں، اس سلسلے میں ''مختارات''، ''قصص النبیین'' اور ''القراءۃ الراشدہ'' وہ معروف اور مفید درسی کتب ہیں جو برصغیر پاک و ہند کے مدارس میں ہی نہیں، بلکہ عالم عرب میں بھی اپنی افادیت منوا چکی ہیں۔

عربی زبان کی تدریس کے لیے اپنی اولین کتاب ''مختارات'' کے بارے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

> مجھے سب سے پہلے عربی نثر و ادب کے ایسے مجموعہ کی ترتیب کا خیال پیدا ہوا جو قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک کے اعلیٰ ادبی نمونوں پر مشتمل ہو، اور جو سجع و قافیہ، تصنع و تکلف سے آزاد، دلی جذبات، صحت مند خیالات اور صالح مقاصد کا آئینہ دار ہو، اور جو عربی زبان کو صرف ایک ہی رنگ و آہنگ (جس کا مثالی نمونہ ''مقامات حریری'' ہے جو ہندوستان کے علمی اور درسی حلقوں میں چھ سو برس سے حکمرانی کرتی رہی ہے، اور عربی تحریر کا واحد نمونہ ہے) پیش نہ کرے، اس بنیادی خیال کی وضاحت کے لیے جو ابتداء میں ''مختارات'' کی تالیف کا محرک ہوا اور پھر اس کی بنیاد پر ''منثورات'' [تالیف مولانا محمد رابع ندوی] اور بعض دوسری کتابیں لکھی گئیں۹۔

مولانا علی میاں کی تالیف کردہ نصابی کتب میں مقصد سے لگن کی جھلک اور دلچسپی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ عربی زبان کے لیے قرآن و حدیث کو ہی بہترین استاد سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> مجھے حدیث کے درس کے زمانہ ہی سے اس کا احساس تھا کہ صحاح میں بکثرت ایسی طویل روایات ہیں، جن میں کسی صحابیؓ یا صحابیہؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا، یا اپنا کوئی واقعہ، سفر کا حال، زندگی کا کوئی اہم حادثہ، تفصیل اور بے تکلفی کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس میں روزمرہ زبان کی بے ساختگی اور جذبات و احساسات کی

www.abulhasanalinadwi.org

عکاسی اور مصوری اپنے پورے حسن کے ساتھ آ گئی ہے، اس کا نمونہ دیکھنا ہو تو حضرت عائشہؓ کی روایت ''حدیث ہجرت''، ''حدیث افک''، حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے قصہ رضاعت، حضرت کعبؓ بن مالک کے واقعہ ابتلا اور قصہ تبوک میں دیکھا جائے کہ عربی زبان اور فصحائے عربی کی قوت بیان ان روایات میں نقطہ عروج پر ہے، اور ان سے بہتر عربی زبان، عربی محاورات وتعبیرات کا نمونہ کتاب اللہ کے بعد عربی زبان وادب کی پوری تاریخ میں نہیں مل سکتا، اس طرح جہاں کسی قادر الکلام، فصیح اللسان صحابی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک یا اپنے کسی دوسرے جلیل القدر ساتھی کا حلیہ اور اس کے خدوخال بیان کیے ہیں ۱۰۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا علی میاں کی مرتبہ درسی کتابوں کی بدولت برصغیر میں عربی کا کچھ ذوق پیدا ہوا ہے، دینی مدارس کے نصاب میں شامل سرمایۂ شعر وادب سے عربی زبان کا ذوق تو کیا پیدا ہوگا، الٹا عربی انشاء وادب سے طلبہ کو نفرت ہونے لگتی ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ درس نظامی کی کتب ادب، تدریس کا طریقہ کار اور نصاب پر از سرِ نو غور کیا جائے اور صحیح معنی میں ان نصابی کتابوں سے کتاب اللہ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فہم اور تعلق پیدا کیا جائے۔

مولانا علی میاں کی ڈیڑھ سو سے زائد کتب ورسائل میں ایک معتد بہ تعداد عربی کتب کی ہے۔ ان میں مشہور ترین تصنیف ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' ہے، جو ۱۹۴۷ء میں لکھی گئی، اور تین برس بعد مصر سے شائع ہوئی۔ اس کتاب نے سارے عالم عرب سے خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ بہت سے عرب مصنفین کے بقول بیسویں صدی کی یہ سب سے زیادہ چھپنے والی عربی کتاب ہے، اب تک اس کے ستر باضابطہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، مصنف یا قانونی ناشرین کی اجازت کے بغیر چھپنے والے ایڈیشن اس کے علاوہ ہیں۔ یہ کتاب مولانا علی میاں کے بقول مصر، شام اور سوڈان کے پہلے سفر میں ان کا وزیٹنگ کارڈ تھی۔ ۱۹۵۱ء میں آپ پہلی دفعہ مصر تشریف لے گئے اور وہاں مصری علماء اور مفکرین سے ملاقاتیں کیں اور ان کی مجالس میں شرکت کی۔ آپ کی اس کتاب

www.abulhasanalinadwi.org

سے متاثر ہوکر ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے تعارفی کلمات، سید قطب شہید نے ''مقدمہ'' اور استاد احمد الشرباصی نے آپ کا تفصیلی خاکہ تحریر کیا جو کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے علاوہ آپ کی متعدد دوسری کتابوں نے بھی عالم عرب سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

ایمان اور مادیت کی کشمکش کے بارے میں ''الصراع بین الاسلام والمادیۃ''، عقل پر وحی کی برتری ثابت کرنے کے لیے ''النبوۃ والانبیاء''، قرآنی مطالعے کا نچوڑ ''تأملات فی سورۃ الکہف''، جہاد فی سبیل اللہ کے احیاء کے لیے ''اذاھبت ریح الایمان'' اور ''سیرۃ السید احمد بن عرفان''، عالم اسلام کے فکری قائدین کے تذکرے کے بارے میں ''رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام'' اور علامہ اقبال سے اپنے لگاؤ کے اظہار کے لیے ''روائع اقبال'' لکھی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کو عرب دنیا میں متعارف کرانے کی سعادت مولانا علی میاں کو حاصل ہوئی۔ قوم پرستی اور جاہلی تعصب سے انہیں سخت نفرت تھی، اور اس کی عکاسی ان کی درجنوں تحریروں میں ہوئی ہے۔ ''محمد رسول اللہ''، ''روح العالم العربی''، ''اسمعو ھامنی صریحۃ''، ''أیہا العرب''، ''العرب والاسلام''، ''اسمعی یامصر''، ''اسمعی یاسوریا''، ''اسمعی یازھرۃ الصحراء''، ''کیف ینظر المسلمون الی الحجاز وجزیرۃ العرب''، ''کیف دخل العرب التاریخ''، ''العرب یکتشفون انفسہم'' وغیرہ۔ ان کے علاوہ بے شمار چھوٹی بڑی عربی کتب ہیں، جن کے ذریعے سے عرب دنیا کا ان سے گہرا تعلق قائم تھا۔

عالم عرب کے بہت سے فرمانرواوں، خصوصاً سعودی عرب کے حکمرانوں سے مولانا کا ناصحانہ تعلق رہا۔ شاہ فیصل مرحوم سے اُن کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور سلسلہ مراسلت رہا، اسی طرح ملک سعود بن عبدالعزیز اور اردن کے ملک عبداللہ مرحوم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔

مولانا عالم اسلام، اور بالخصوص عرب دُنیا کی متعدد تنظیموں کے رکن اساسی یا رکن تھے، رابطہ عالمِ اسلامی - مکہ مکرمہ اور جامعہ اسلامیہ - مدینہ منورہ کے تاسیسی ارکان میں شامل تھے، دعوت اسلامی کی عالمی مجلس اعلیٰ قاہرہ، اسلامی یونیورسٹیوں کی انجمن رباط، عربی اکیڈمی - دمشق، عربی

www.abulhasanalinadwi.org

اکیڈمی - قاہرہ، شاہی اکیڈمی برائے اسلامی تمدن - اردن اور اسلامی یونیورسٹی - اسلام آباد کی مجالسِ امناء کے رکن تھے۔ ادب اسلامی کی ترویج واشاعت کے لیے آپ کا اہم کارنامہ ''رابطہ ادب اسلامی'' کا قیام تھا جس کے آپ بانی صدر تھے، اس کا ایک دفتر لکھنؤ میں اور دوسرا ریاض میں ہے، اس کا ایک ترجمان عربی میں ریاض سے ''مجلۃ الادب الاسلامی'' کے نام سے شائع ہوتا ہے۔

مولانا علی میاں کی انہی مخلصانہ اور دردمندانہ کاوشوں کی وجہ سے انہیں ۱۹۷۹ء میں شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا اور ۱۹۹۹ء میں دبئی کی حکومت نے اُنہیں ۱۹۹۸ء کی سب سے بڑی اسلامی شخصیت قرار دیا۔

عالم عرب کی جن نامور شخصیات سے مولانا علی میاں کے قریبی مراسم تھے، ان میں مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی، اخوان المسلمون کے ڈاکٹر سعید رمضان، سید قطب شہید اور شیخ محمد الغزالی، شام کے علامہ بہجۃ البیطار، عراق کے بہجہ الاثری، حجاز کے مشہور رئیس اور عالم شیخ محمد نصیف، المجمع العربی - دمشق کے علامہ کرد علی اور مشہور عرب شاعر استاد خلیل مردم بک، مشہور محقق وادیب علامہ عبدالقادر مغربی، ڈاکٹر طہٰ حسین، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی اور سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز وغیرھم سے ان کے تعلقات اور ملاقاتوں کا ذکر ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا علی میاں کی قبر پر انوار کی بارش برسائے، اُنہیں جنت فردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُن کے بعد آنے والوں کو اُن کا بہترین خلف بنائے۔ آمین

حواشی

۱- سید ابوالحسن علی ندوی، کاروان زندگی، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س-ن، [جلد ا]، صفحات ۸۹-۹۰۔ مزید تفصیل کے لیے مولانا خلیل عرب کی یاد میں لکھا گیا مولانا علی میاں کا مقالہ دیکھیے: پرانے چراغ، لکھنؤ: مکتبہ فردوس، ۱۹۷۵ء، صفحات ۲۰۷-۲۱۸

۲- سید ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، حوالہ مذکورہ، صفحات ۱۱۵-۱۱۶

www.abulhasanalinadwi.org

۳- ایضاً، ص۱۱۶

۴- ایضاً، ص۱۱۷

۵- ایضاً، ص۱۱۹

۶- ایضاً، ص۱۲۶

۷- سید ابوالحسن علی ندوی، پرانے چراغ، حوالہ مذکورہ، صفحات ۲۳۴-۲۳۵

۸- ایضاً، ص۲۴۱

۹- سید ابوالحسن علی ندوی، کاروانِ زندگی، حوالہ مذکورہ، ص۲۰۵

۱۰- ایضاً، ص۲۰۸

www.abulhasanalinadwi.org

فضل الرحیم

مولانا ابوالحسن علی ندویؒ: ایک روحانی شخصیت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصدِ بعثت میں ایک مقصد تزکیہ نفس بھی قرار دیا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو جامع الصفات تھی اور آپ بیک وقت تلاوتِ آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفس کا فریضہ انجام دیتے تھے، جبکہ آپ کے وصال کے بعد تبلیغِ دین کے یہ فرائض اس امت کے علماء، صلحاء، فقہاء، محدثین اور مفسرین کے سپرد کردیے گئے۔ ایک طرف اگر حفاظ وقراء قرآن کریم کی تلاوت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں تو دوسری طرف مفسرین ومحدثین اس کے معانی اور مفہوم کھول کھول کر بیان کررہے ہیں۔ ایک جماعت قرآن پاک کے مفہوم اور معانی کی حفاظت پر مامور ہے تو دوسرا گروہ اصلاح نفس اور تزکیہ باطن کی طرف متوجہ ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اقدس سے لے کر آج تک علمائے کرام، مصلحین اور مربیین امت کا یہ سلسلہ برابر چلا آرہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک باقی رہے گا۔ عہد حاضر کے ان مصلحین اور مربیین امت میں ایک نام مولانا ابوالحسن علی ندوی یا مختصراً مولانا علی میاں کا تھا۔ حضرت مولانا کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ اپنی علمی اور عملی خدمات کی بدولت پوری دنیا میں لازوال شہرت رکھتے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی حصہ یا ملک ایسا ہوگا جو ان کے علمی فیوض وبرکات سے مستفید نہ ہوا ہو۔

مولانا علی میاں کا تعلق جس علمی مرکز دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ہے وہ پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہے، علم وادب کے لحاظ سے اس کا نام ہی ثقاہت کی علامت سمجھا جاتا ہے، خصوصاً ادب عربی کے حوالے سے یہ ادارہ برصغیر پاک وہند میں ایک سند سمجھا جاتا ہے، تاہم اس ادارے کی دو

شخصیات ایسی ہیں جو علم وادب کے ساتھ روحانی دنیا میں بھی آفتاب اور مہتاب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے میری مراد حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا علی میاں ندوی ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف ادیب، مورخ اور مبلغ تھے، بلکہ مصلح اور داعی حق بھی تھے جو احسان وسلوک کے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی متصوفانہ خدمات نسبتاً سب پر بھاری ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ حضرت مولانا علی میاں کی اکثر وبیشتر کتب اس پر شاہد عادل ہیں، ان کی اکثر تقاریر ومواعظ کا تعلق اصلاح نفس ہی سے ہے۔ تزکیہ نفس کی اہمیت اور ضرورت کے مدنظر حضرت مولانا اپنی تصنیف ''تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک'' میں تحریر فرماتے ہیں۔

> تزکیہ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اور فن کی شکل اختیار کرلی، نفس وشیطان کے مکائد کی نشاندہی، نفسانی اور اخلاقی بیماریوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے حصول کے ذرائع وطرق کی تشریح وتربیت جس کی اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے ماثور وشرعی الفاظ میں پہلے سے تھی اور جس کا عرفی واصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں تصوف پڑ گیا، اسی اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے۔ رفتہ رفتہ اس فن کو اس کے ماہرین نے اجتہاد کے درجہ تک پہنچادیا، اور اس کو دین کی بڑی خدمت اور وقت کا جہاد قرار دیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قلوب ونفوس کی مردہ کھیتیوں کو زندہ کیا، اور روح کے مریضوں کو شفا عطا کی۔ ان مخلص علماء ربانیین اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے ذریعہ دنیا کے دور دراز گوشوں اور طویل وعریض ممالک (جیسے ہندوستان، جزائر شرق الہند اور براعظم افریقہ) میں وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت ہوئی اور لاکھوں انسانوں نے ہدایت پائی، ان کی تربیت سے ایسے مردان کار پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں مسلم معاشرہ میں ایمان ویقین اور عمل صالح کی روح پھونکی اور بارہا میدان جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا، اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو

www.abulhasanalinadwi.org

وہ شخص کرے گا، جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں، یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں تصوف وسلوک یا تزکیہ نفس کو الہامی نظام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک اخلاق کی پاکیزگی اسی نظام کی بدولت حاصل ہوسکتی ہے، چنانچہ ایک اور موقع پر تحریر فرماتے ہیں۔

> تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک وصاف کیا جائے، مختصر الفاظ میں تزکیہ کی وہ شکل جس کے شاندار نمونے اور مثالیں ہم کو صحابہؓ کی زندگی میں نظر آتی ہیں اور ان کے اخلاص اور اخلاق کی آئینہ دار ہیں۔ وہ تزکیہ جس کے نتیجے میں ایسا صالح، پاکیزہ اور مثالی معاشرہ وجود میں آیا، جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے، اور ایسی معدلت شعار اور حق پرست حکومت قائم ہوئی، جس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہ مل سکی۔

مزید لکھتے ہیں:

> احسان اور فقہ باطن سب علمی وشرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اصول ہیں جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں، اگر اہل تصوف اس مقصد کے حصول کے لیے (جس کو ہم تزکیہ اور احسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص اور متعین راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لیے کہ زمان ومکان اور نسلوں کے مزاج اور ماحول کے ساتھ اصلاح و تربیت کے طریقے اور ان کے نصاب بھی بدلتے رہتے ہیں) اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے، اور اختلاف کا سررشتہ ہی باقی نہ رہتا، سب دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں، صاف اقرار کرتے، اور اس بات کو بلا تامل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی روح دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت

www.abulhasanalinadwi.org

ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی جائے، اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہوسکتا، اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آ سکتا ہے۔

مولانا نے ایسے لوگوں سے بھی خبردار کیا ہے جو تصوف کی آڑ میں دین اسلام کی غلط تاویلات کرتے اور دین کا حلیہ بگاڑتے ہیں۔ مولانا رقم فرماتے ہیں:

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے لوگ بھی پیدا کر دیے ہیں جو دین کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف، باطل راستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک وصاف اور عجمیت اور فلسفہ سے محفوظ کرتے رہے، بغیر کسی تاویل یا تحریف کے خالص تزکیہ کی دعوت دیتے رہے، جس کا نام احسان اور فقہ باطن ہے۔ انہوں نے اس طب نبوی کی ہر زمانہ میں تجدید کا فرض انجام دیا، وہ امت اسلامیہ میں نئی روح اور نیا ایمان پیدا کرتے رہے۔ بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ، معاشرہ کا تعلق للّٰہیت اور اخلاص کے ساتھ استوار کرتے رہے، ایک طرف وہ عوام میں خواہشِ نفس، دنیا پرستی اور مال واولاد کے فتنہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتے رہے، دوسری طرف انہوں نے خواص میں وہ ایمان ویقین اور روحانی قوت پیدا کی جس نے بادشاہوں کے انعامات اور تازیانوں دونوں کا مقابلہ کیا، اور ان کے وعدوں اور ان کی تعزیروں کا مقابلہ کرنے، جابر بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے، امراء اور بادشاہوں کا احتساب کرنے، اور مادی مظاہر کی بے وقعتی اور کفاف پر قناعت کی طاقت وصلاحیت پیدا کرتے رہے اور تاریخ میں ایسی مثالیں نظر آئیں کہ ایک بزرگ سے بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر اس کی دست بوسی کرنے کو کہا گیا، تو انہوں نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں تو اس پر بھی راضی نہیں کہ وہ میرا ہاتھ چومے، نہ یہ کہ میں اس کا ہاتھ چوموں، اے لوگو! تم ایک دوسری دنیا میں ہو اور میں ایک دوسرے عالم میں ہوں۔

www.abulhasanalinadwi.org

بعض لوگوں کو بادشاہوں نے اپنے ملک میں بڑی سے بڑی پیشکش کی، لیکن انہوں نے اس کا جواب دیا کہ:

اللہ تعالیٰ اس دنیا کا (باوجود اس کے طول وعرض کے) بڑی حقارت اور ذلت کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ قل متاع الدنیا قلیل۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس چھوٹے سے ٹکڑے میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا عطا فرمایا ہے۔ اب میں اس میں بھی حصہ لگاؤں؟ مجھے پسند نہیں۔

ایک بزرگ ایک امیر کے سامنے پیر پھیلا کر بیٹھے تھے جب وہ امیر واپس ہوئے تو انہوں نے اشرفیوں کی ایک تھیلی ان کی خدمت میں بھجوائی، انہوں نے یہ کہہ کر اس کو لینے سے انکار کر دیا کہ جو اپنا پیر پھیلاتا ہے، وہ اپنا ہاتھ نہیں پھیلاتا۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا جس کا رواج عام ہوا، اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا، نہ میں تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی و غلط فہمی سے بری سمجھتا ہوں، اور نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس خلا کو جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے، جلد پر کیا جائے، اور تزکیہ واحسان اور فقہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا، اور یہ سب منہاجِ نبوت اور کتاب اور سنت کی روشنی میں ہو، بہر حال ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہوں، یہ ضروری ہے، اس لیے کہ حقیقت میں یہ خلا ایک عظیم خلا ہے، اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے اثرات اور نتائج بہت دوررس ہیں۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ نے جن خیالات کا اظہار اپنی کتابوں میں کیا ہے، اس پر عمل کر کے بھی دکھایا۔ انہوں نے منازل سلوک طے کرنے کے لیے حضرت مولانا احمد علی لاہوری

www.abulhasanalinadwi.org

قدس سرہ کے دست مبارک پر بیعت فرمائی۔ حضرت تھانوی قدس سرہ، مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابر علماء کرام سے تعلق اسی تصوف وسلوک کی بنیاد پر قائم رکھا۔ آپ نے ان کتب میں جا بجا ان حضرات کا تذکرہ، ان کی رفاہی رشد وہدایت کی مجالس کے حوالے سے کیا ہے۔

مختصراً مولانا سید ابوالحسن ندویؒ ایک ایسے بالغ نظر، روشن خیال اور وسیع النظر مفکر اور روحانی بزرگ تھے جنھوں نے مختلف زاویوں سے ذاتی اصلاح پر زور دیا، اور احسان وسلوک کے مدرسہ فکر کی اہمیت واضح کی۔ وہ اسلام کی علمی تعبیر کے ساتھ ساتھ عملی اور روحانی تعبیر کے شدت سے قائل تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ''عامل کامل'' ہی نہیں، ایک ''مرشد کامل'' بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان ''مرشد کامل'' کے درجات بلند فرمائے، اور ہمیں بھی خلوص نیت سے، تزکیہ نفس و تربیت باطن کے اس پروگرام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس کے خطوط مولانا نے اپنی کتابوں میں وضع کیے ہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

محمد الغزالی

''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے''

ماضی قریب میں ہمارے دور کے ایک عظیم مفکرِ اسلام اور مفسرِ قرآن، صاحب طرز ادیب اور عہد ساز انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے ۱۹۷۴ء میں اپنی کتاب ''معاصرین'' میں مولانا علی میاں کے بارے میں لکھا تھا:

> مرحوم نہیں ماشاء اللہ زندہ سلامت ہیں، اور خدا کرے خدمتِ دین وملت کے لیے مدتوں اس خاکدان کو زندہ و سرسبز رکھیں، سن میں مجھ سے کہیں چھوٹے ہیں، لیکن علم و فضل میں، سنجیدگی فکر میں، اخلاص میں، تقویٰ میں، عبادت میں، ریاضت میں، خشیت و طاعت میں، میرے بڑوں میں شامل ہونے کے قابل۔ رائے بریلی کے سید زادے خاندان کے اور لوگوں سے بھی میں واقف ہوں، باپ اور بھائی کا کیا کہنا، دونوں نور علی نور، پاک صاف، طاہر و مطہر مٹی (جو تیمم کے قابل ہو) اس سے بنے ہوئے۔ دوسرے اعزہ بھی اپنی جگہ قابل قدر و قابل فخر۔ یہ اس تاروں کے جھرمٹ کے درمیان آفتاب!

ایک عالمِ ربانی، صوفی صافی اور ایک ایسے ادیب نقاد اور مفکر و قاد کی گواہی آپ نے سن لی جو آسانی سے کسی سے متاثر ہونے والے آدمی نہ تھے۔ گواہی دینے والے بزرگ نے جس کے بارے میں گواہی دی، وہ بھی اس وقت جیتے جاگتے تھے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اپنے معاصرین، اور اس قدر اعلیٰ پائے کے بزرگوں میں کوئی اتنا مقبول ہو جائے، اور پھر بلا کی تنقیدی نظر رکھنے والے اساتذہ کی نظروں میں وہ جچے، اور وہ سب کے سب بلا تأمل اسے علم و فضل کی رفعتوں اور

اخلاق وکردار کی بلندیوں کی سند دے دیں۔ مولانا علی میاں ایسے ہی خوش بخت اور سعید انسان تھے جو اپنے زمانے کے دین دار اہل علم کے ہر طبقہ افراد کے درمیان درخشاں ستارہ بن کر ابھرے اور مختلف رجحانات کے حامل مکاتب فکر وخیال کے لوگوں میں یکساں طور پر مقبول ہوئے، وہ صرف ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دار المصنفین کے حلقے کی آنکھوں کا تارا نہیں بنے کہ اسی میں ان کی نشو ونما ہوئی تھی اور اسی مذاق کے لوگوں کے ہاتھوں ان کی تربیت ہوئی تھی، بلکہ اپنے وقت میں ہندوستان کے تمام قابل ذکر علمی اداروں، فکری مکاتب اور روحانی مسالک کے لوگوں نے ان کو آنکھوں پر بٹھایا اور انہیں احترام واستناد کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز کیا۔ جہاں وہ خالص علمی وتحقیقی اداروں کی جان بنے رہے، وہاں وہ اپنے زمانے کی تمام قابل ذکر دینی، روحانی اور اصلاحی تنظیموں اور تحریکوں کے بھی روح رواں بنے۔ ایسا عز وشرف، اتنی تکریم وتوقیر، دنیا بھر کے اچھے انسانوں میں اس قدر مقبولیت کیا، بلکہ محبوبیت کم ہی کسی کے حصے میں آتی ہے۔

ایسی عظیم الشان، مقبول عام اور محبوب خلائق شخصیت کے بارے میں مجھ جیسے کم علم اور بے بضاعت آدمی کا کچھ کہنا محاورۃً نہیں، بلکہ واقعتاً سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، لیکن ایک تو اللہ کے اس مخلص ومتقی، مطیع اور فرمانبردار بندے کے تذکرے میں شمولیت حاصل کرنا بجائے خود باعثِ سعادت ہے، دوسرے شاید یہ تذکرہ تحدیث نعمت ربی کے زمرے میں آتا ہے کہ اللہ کا فضل ہی تو ہوتا ہے ایسے بندوں کا دنیا میں آنا اور رہنا، تیسرے سنت الٰہی یہ ہے اور اللہ کا وعدہ بھی ہے کہ جتنا اس کی نعمتوں کا شکر کرو گے، اتنا ہی وہ اس میں اضافہ کرتا چلا جائے گا تو کیا یہ کوئی معمولی نعمت ہے کہ مجھ جیسا عاجز وقاصر بندہ ایسے جلیل القدر عالم اور حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے وفادار جاں نثار کے ساتھ معاصرت کا شرف لے کر اسی کرہ زمین پر ایک ساتھ جیا۔ اگر حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاصرت انسانیت کا اعلیٰ ترین اعزاز ہے تو آپ کی مسند ارشاد واصلاح کے جانشینوں، آپ کے علوم کے حاملین، آپ کے پیغام کی روشنی دنیا میں پھیلانے والے اللہ کے سچے، مخلص اور متقی بندوں کی معاصرت میں رہنا اور ان کو ایک نظر دیکھ

www.abulhasanalinadwi.org

لینا بھی مجھ جیسے لوگوں کے لیے کوئی کم اعزاز نہیں۔ یہ بات تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی صراحت سے بتا گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ علم کو علماء کے واسطے سے عطا فرماتا ہے اور انہی کو اپنے پاس بلا کر یہ دولت واپس لے لیتا ہے۔ اللہ کرے کہ یہ دولت جو مولانا علی میاں کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ۱۹۱۴ء سے ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء تک اس امت مسلمہ کو عطا کر رکھی تھی، اس کا نعم البدل وہ ہم بے کس محروموں کو عطا فرمائے۔ ایسے حروفِ زریں لوحِ جہاں پہ بار بار رقم کیے جائیں اور مولانا علی میاں جیسے بہت سے انسان ہمارے درمیان اور پیدا ہو جائیں کہ یہ امت اس وقت اصحابِ صلاح وتقویٰ اور اہلِ فکر وہنر کے لیے بہت پیاسی ہے اور عالم اسلام آج کل قحط الرجال کے جس شدید ترین بحران سے گزر رہا ہے شاید ہی پہلے کبھی گزرا ہو۔

مولانا علی میاں کی شعوری زندگی کا ایک ایک لمحہ فکری وعلمی تحقیقات، ادبی شاہکاروں اور عملی کامیابیوں سے لبریز ہے، اور ان ۸۸ برسوں میں سے جو انہوں نے اس خاکدان میں گزارے، کم از کم ۷۰ برس تو ایسے ہیں جن کو بلا مبالغہ علم وعمل، تصنیف وتحقیق، تعلیم وتربیت، اصلاح وارشاد کا ایک طویل موسم بہار قرار دیا جا سکتا ہے، یہ روشنی کا ایک مسلسل سفر تھا جو پوری آب وتاب سے سات دہائیوں تک جاری رہا۔

جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں، مولانا نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، اور پھر اسی مادر علمی میں تدریسی ذمہ داریاں تادم واپسیں ادا کرتے رہے۔ آپ نے عالمِ اسلام کی اس منفرد تربیت گاہ کے انتظام وانصرام کو بھی نصف صدی سے زائد عرصے تک بخیر وخوبی سنبھالے رکھا، اور اس ادارے کو اپنے حسن انتظام سے چار چاند لگا دیے، ساری عمر آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی، روحانی، اخلاقی اور علمی وفکری رہنمائی کی، دنیائے اسلام کے نت نئے مسائل سے عہدہ برآ ہوئے، اس کے تمام قابل ذکر علمی وفکری اداروں کو مسلسل علمی سرمایہ اور فکری غذا مہیا کرتے رہے، امت مسلمہ کو درپیش مصائب وآلام کو کم کرنے کی خاطر، مسلسل کوشش اور سعی پیہم کرتے رہے، حرمین شریفین کی حفاظت کی طرف دنیائے اسلام کے اہل اقتدار کو متوجہ کرتے

www.abulhasanalinadwi.org

رہے، قبلہ اول کی آزادی کے لیے ہمیشہ مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر کو جھنجوڑتے رہے، اس کے علاوہ آپ مغربی دنیا میں بسنے والے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے، ہر اہم مسئلے پر اُن کی مسلسل رہنمائی کرتے رہے۔ آپ کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے اسلامی ادب کی عالمی تنظیم قائم کر کے خالص اسلامی ادبیات کو فروغ دینے کے نصب العین کی دل و جان سے آبیاری کی اور اس مقصد کے لیے دنیائے اسلام میں مسلم ادباء کا ایک وسیع حلقہ قائم کیا، اور اس کی کوششوں اور کاوشوں کو مربوط کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے عائلی قوانین مرتب کر کے نافذ کرانے میں آپ نے اپنا پورا زور صرف کیا اور کامیاب ہوئے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں دعوت و ارشاد کا کام پھیلاتے رہے، اسے منظم کرتے رہے اور مغربی دنیا کی وقیع جامعہ اوکسفرڈ میں اسلامی تہذیب کے مطالعے کا مرکز قائم کر کے اور اسے کامیاب، فعال اور نتیجہ خیز بنانے کی دُھن میں تو زندگی کے آخری سانس تک لگے رہے، الغرض مولانا علی میاں کی خدمات اس قدر زیادہ، اتنی عظیم الشان، منفرد اور ممتاز ہیں کہ یہ تنگ صفحات ختم ہو جائیں گے، زبانیں خشک ہو جائیں گی، مگر شاید یہ تذکرہ تمام نہ ہو سکے گا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس نعمت خداوندی جس کا نام علی میاں تھا کی توصیف کا حق مجھ عاجز سے تو ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف ان کی شخصیت اتنی ہمہ گیر، پہلو دار، منفرد تھی جس کی وسعتیں مجھے نظر آ رہی ہیں، دوسری جانب میری کم فہمی کی حدود، کم علمی کی قیود اور میری قاصر زبان کی تنگنائیاں میرے آڑے آ رہی ہیں۔ بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ سوت کی انٹی لے کر یوسف کے خریداروں میں نام لکھوا رہا ہوں۔

مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و عملی رخِ روشن کی چمک اور فکر و فرہنگ کے اس گوہر درخشاں کی دمک نے تو ان کے ایسے ایسے معاصرین کی نگاہیں خیرہ کر رکھی تھیں جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک بے مثل ہستی تھی، اور مولانا علی میاں کے ان حامیوں اور قدر شناسوں میں ہر فرد اپنی اپنی جگہ ایک ممتاز و منفرد مقام کا حامل تھا۔ ان معاصرین میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، سید قطب شہید، مفتی اعظم

www.abulhasanalinadwi.org

فلسطین سید امین الحسینی، مولانا ظفر احمد انصاری جیسی نابغہ روزگار شخصیات شامل تھیں۔ ان کے چاہنے والے صرف اس برصغیر میں بسنے والے مسلمان ہی نہ تھے، بلکہ عالم اسلام کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں میں، اور دنیا کی ۵۵ اسلامی ریاستوں میں شاید ہی کوئی حصہ یا خطہ ایسا ہو جہاں اس یکتائے روزگار ادیب اور خطیب کی پرمغز تحریروں اور جاندار تقریروں کے اثرات بالواسطہ یا بلاواسطہ نہ پہنچے ہوں۔ مولانا علی میاں کی بھرپور اور عہد ساز زندگی کے ان وسیع وعریض اثرات کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے اور ان کے علمی سرمایے کے تنوع اور فکری تخلیقات کے تعمق کو ذہن میں رکھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔

مولانا علی میاں نے عربی اور اردو زبان میں تصنیفات وتحقیقات کا ایک قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے، انہیں عربی انشاء کا امام مانا گیا، ان کے عربی طرز تحریر کو اس معاصر دنیا کے علمی اور ادبی حلقوں میں جتنی پذیرائی ملی، شاید ہی کسی دوسرے قلمکار کے نصیب میں آئی ہو۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمارے عرب بھائی کم ہی کسی غیر عرب کا لوہا مانتے ہیں، لیکن علی میاں کی عربی تحریر وتقریر کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے عربی دانی کے بڑے بڑے دعوے داروں کا پندار ختم اور پتہ پانی ہو جاتا تھا، انہیں مانتے ہی بن پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ آپ کا مقام عربی انشاء اور خطابت میں اتنا اونچا تھا کہ اگر کوئی جھٹلانے کی جسارت کرتا بھی، تو اپنی جہالت کا ناقابل تردید ثبوت آپ ہی مہیا کرتا۔

مولانا علی میاں کا مقام اتنا بلند وبالا ہے کہ انہیں ہم جیسے مبتدیوں کی سند کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس مختصر تحریر میں ان کی تمام معرکہ آرا تصانیف کا جائزہ یا ان کے مجموعی افکار کا خلاصہ بیان کرنا تو ممکن نہیں، البتہ ان کی ایک تصنیف جس کو اہل علم نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جس کی بازگشت دنیائے اسلام کے ایک سرے سے دوسرے تک سنی گئی، اس کے بارے میں کچھ طالب علمانہ اور مختصر گزارشات پر اکتفاء کروں گا۔ مولانا علی میاں کی یہ کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' ہے۔ مولانا کی متعدد دیگر تصانیف کی طرح یہ کتاب بھی اردو میں منتقل کی گئی ہے اور ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کے عنوان سے اہل فکر کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کی دیگر

www.abulhasanalinadwi.org

خوبیوں کے علاوہ ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانے کے عظیم مجاہد اور مفکر اسلام سید قطب شہید نے اس کتاب کا مقدمہ لکھا ہے۔ اپنے اس مقدمے میں سید قطب فرماتے ہیں:

اس کتاب کا سب سے اہم پیغام یہ ہے کہ اسلام پر ایمان انسان کو ایسی بلندیوں تک لے جاتا ہے جن کی کوئی حد نہیں۔ عقیدہ توحید کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو تکبر کے شرور اور خود پسندی کے غرور سے محفوظ کر کے اس کو اپنے اصل مقصدِ وجود اور خودی کا احساس دلاتا ہے، اس کو خود اعتمادی اور امید کی نوید سناتا ہے اور آسودگی اور اطمینان کی ایسی کیفیت اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے جو تعطل اور بے عملی سے کوسوں دور ہوتی ہے۔ اس ایمان کی بدولت انسان کے اندر یہ اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کاندھوں پر ساری انسانیت کی ذمہ داری رکھی گئی ہے۔ یہ مشرق سے لے کر مغرب، شمال سے جنوب تک بسنے والے انسانوں کو راہ ہدایت دکھانے کی عظیم ذمہ داری ہے۔ توحید کی امانت اس کے سینے میں اتار کے اس سے دنیا کی امامت کا کام لیا جانا ہے، اس بھٹکتی ہوئی انسانیت کو گمراہیوں کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنیوں تک پہنچانے کا عظیم الشان اور تاریخ ساز فریضہ اس کے سپرد ہوا ہے۔

سید قطبؒ مزید فرماتے ہیں کہ اس کتاب کے مصنف نے محض گروہی جذبات کو ابھارنے یا مذہبی تعصب بیدار کرنے کا کام اس کتاب سے نہیں لیا، بلکہ تاریخ انسانی کے معروضی حقائق کا گہرا ادراک حاصل کر کے بیک وقت اپنے قاری کے فکر ونظر، عقل واحساس، ضمیر اور وجدان کو جھنجوڑا ہے۔ تاریخ کے ثابت شدہ عوامل اور نتائج کا عادلانہ جائزہ لے کر ان کو حق، حقیقت اور عقل سلیم کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور زندہ اور روشن انسانی ضمیر سے خطاب کیا ہے۔ سید قطب کی نظر میں اس کتاب کا سب سے نمایاں وصف یہی ہے۔

اپنی گفتگو کا اختتام سید قطب اس بات پر کرتے ہیں کہ اس کتاب میں اسلام کی روح کو اپنی

www.abulhasanalinadwi.org

پوری جامعیت کے ساتھ سمجھا اور سمجھایا گیا ہے، اور اس بناء پر یہ تصنیف صرف مذہبی اور عمرانی تحقیق کا بہترین نمونہ ہی نہیں، بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے تاریخ انسانی کے مطالعے کا بہترین منہج بھی ہے۔ یہی وہ منہج ہے جسے سید قطب کی نظر میں آج کے دور میں اختیار کیا جانا چاہیے، اور اسے اہل مغرب کے یک رخے، ادھورے اور سطحی نظریۂ تاریخ کی جگہ لینا چاہیے۔ اہل مغرب کی نگاہ ان کے فلسفہ مادیت، ان کی اپنی مخصوص عصبیتوں اور تنگ نظریوں کی اسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مؤرخین نے انسانیت کی تاریخ کا مکمل اور متوازن ادراک کرنے میں ٹھوکریں کھائیں اور زندگی کی بعض بنیادی اقدار کو نظر انداز کرنے کی بناء پر بہت سی غلط فہمیوں اور گمراہیوں کا شکار ہوتے گئے۔ اگر انسانیت کو ان غلط فہمیوں، تنگ نظریوں، تعصبات اور گمراہیوں سے نکالنا ہے تو پھر اس کتاب میں اختیار کردہ مکمل اور جامع نظریۂ تاریخ اور منہج مطالعہ تاریخ کو ہی قبول کرنا ہوگا۔

سید قطب کے مقدمے سے واضح ہوگیا ہے کہ کتاب کا علمی تناظر اور دائرہ بحث اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ اس مختصر تحریر میں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں، تاہم اس تصنیف کی چند اہم خصوصیات کی جانب اشارہ کر کے میں اپنی گزارشات ختم کروں گا۔

اس کتاب میں سب سے پہلے تو اسلام سے قبل کی دنیا کی تصویر ہمارے سامنے لائی گئی ہے۔ اس عہد کی کوئی قابلِ ذکر تہذیب، مذہب یا معاشرہ ایسا نہیں جس کی خصوصیات کا اجمالی، مگر جامع تذکرہ اس کتاب میں نہ کیا گیا ہو۔ ان تہذیبوں میں روم، ایران، ہندوستان اور چین کی تہذیبیں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے اہم مذاہب اس وقت دنیا میں قابل ذکر حیثیت رکھتے تھے، ان کے بارے میں مصنف نے ایک ماہر مورخ کی نظر سے کلام کیا ہے، ان مذاہب میں بدھ مت، ہندو مت، مجوسیت، یہودیت، عیسائیت اور بت پرستی کی مختلف رائج الوقت شکلیں شامل ہیں۔

جامع جائزے کے بعد مصنف عربوں کی قبل اسلام کی تاریخ اور تہذیب کی طرف آئے ہیں اور عربی ذہن اور اس کی نفسیات پر فاضلانہ گفتگو کی ہے۔ ان کے درمیان جو عقائد اور مذہبی رسوم رائج تھے، ان کا جائزہ لیا ہے۔ یوں جاہلیت کے عربی معاشرے، اس کی مخصوص قبائلی ساخت، اس

www.abulhasanalinadwi.org

کی اخلاقی، سماجی اور نفسیاتی صورت حال کی مکمل تصویر الفاظ میں کھینچ کر رکھ دی۔

اس بھرپور تجزیے سے اسلام سے پہلے کی دنیا کا مکمل تہذیبی نقشہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اس پس منظر میں مصنف نے ان انقلابی تبدیلیوں اور ہمہ گیر اصلاحات پر روشنی ڈالی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ معاشرے اور آپ کے لائے ہوئے دین کی تعمیر کردہ تہذیب کے ذریعے تاریخ انسانی میں وقوع پذیر ہوئیں۔

اس کے بعد تاریخ اسلام کے سب سے قابل فخر اور زریں دور یعنی عہد خلافت راشدہ کا تذکرہ آتا ہے جس میں اسلام کی تہذیب اور ثقافت اخلاقی و روحانی، علمی و فکری، سیاسی اور اجتماعی حیثیتوں سے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی۔

مولانا علی میاں نے ان ہمہ گیر اور دوررس تبدیلیوں کا جائزہ لیا ہے جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے ذریعے انسانی تاریخ اور تہذیب میں رونما ہوئیں۔ انسانی معاشرے میں جو غیر معمولی تبدیلی اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی اصلاحات نے پیدا کی، جس طرح انسان کے قلب و ذہن کو بدلا، فکر و نظر کے نئے پیمانے اور سانچے عطا کیے اور پوری تہذیبی زندگی کا رخ موڑ کر انسانیت کو اپنے خالق و مالک سے جوڑ دیا، اس کا انتہائی عالمانہ احاطہ اس کتاب کا مرکزی مضمون ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے "و بضدها تتبين الاشياء" اسلام کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے قدیم و جدید جاہلیت کی حقیقت کا ادراک ضروری ہے، اور یہی انہوں نے اس کتاب میں کیا ہے۔ صدر اسلام کے عہد زرّیں کے تذکرے کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ جب مسلمانوں کی نظر سے وہ اعلیٰ مقاصد واہداف اوجھل ہونے لگے اور رفتہ رفتہ زوال اور انحطاط کے اسباب غالب آنا شروع ہوئے تو اس کے کیا اثرات مسلم تہذیب اور معاشرے پر پڑے اور کیا نقصانات پوری انسانیت کو اس کی پاداش میں اٹھانے پڑے، یہ پوری داستان مولانا علی میاں نے بڑی دردمندی اور جذبات کی شدت، علمی دیانت اور فکری صداقت کے ساتھ صاف صاف بیان کردی ہے۔

ایسی وقیع کتاب کا جوہر چند سطروں میں منتقل کردینا آسان کام نہیں۔ اس کتاب کی اصل

www.abulhasanalinadwi.org

اہمیت یہ ہے کہ شاید بیسویں صدی میں دنیائے اسلام کے مسلمان اہل علم میں مولانا علی میاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلام کے تاریخی اور تہذیبی کردار کو اتنی جامعیت اور گہرائی سے سمجھا اور سمجھایا۔ آج کے دور میں بہت سے لوگ سامنے آگئے ہیں جو تہذیبوں کے تصادم اور ان کے آپس کے تعلقات کی حرکیت پر کلام کرتے لگے ہیں، لیکن یہ یادر ہے کہ مولانا علی میاں کی یہ عہد ساز تصنیف ۱۹۵۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آئی تھی۔ اس سے پہلے جتنی گفتگو ہوتی تھی، وہ مسلمانوں کے درمیان داخلی مباحثے کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس کتاب نے جو بساط بحث جمائی ہے، وہ واقعتاً تہذیبوں کے درمیان ایک مذاکرے کی علمی اور فکری بنیاد فراہم کر دیتی ہے۔ انہوں نے صرف مسلمانوں کو مخاطب نہیں بنایا، بلکہ انتہائی علمی دیانت کے ساتھ معروضی انداز اختیار کر کے ساری انسانیت کو ایک واضح پیغامِ نجات دیا ہے، اور ایک محکم علمی اور تاریخی بنیاد پر دیا ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا علی میاں نے اسلام کا تاریخی اور تہذیبی مقدمہ دنیا کے اہل علم و دانش کے سامنے بڑے جاندار طریقے سے پیش کیا ہے، جو حقائق اور شواہد وہ اپنی رائے کی تائید میں سامنے لائے ہیں، وہ اس قدر معروضی، منطقی اور مسکت ہیں کہ ان سے صرف نظر کرنا کسی بھی منصف مزاج تاریخ دان اور روشن ضمیر دانشور کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ان کی گہری نظر ان تمام اسباب و عوامل پر ٹھیک ٹھیک پڑی ہے جو واقعتاً اسلامی امت کے عروج کا نقطہ کمال اور علامت زوال ہیں۔

مثال کے طور پر جہاں انہوں نے اسلام کے عروج و زوال کے درمیان حدِ فاصل بیان کی ہے، وہاں انتہائی اختصار، مگر بڑی بصیرت کے ساتھ دو عوامل کو مسلمانوں کے عروج کا سبب بتایا ہے، اور انہی دو عوامل کو اقوام عالم کی قیادت کی شرائط قرار دیا ہے اور وہ دو عوامل —— جہاد اور اجتہاد ہیں۔ ان دونوں عوامل کا تعین کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے تہذیبی قلعے کی داخلی زندگی میں کارفرما عوامل اور اس کے خارجی وجود کی حقیقت کا انہوں نے کس قدر گہرائی اور تعمق کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ اسی طرح جہاں انہوں نے امت اسلامیہ کے اسبابِ زوال کی نشان دہی کی ہے، ان میں دو عوامل ایسے بیان کیے ہیں جو مرکزی حیثیت کے حامل ہیں، ایک تو دین اور سیاست کے

www.abulhasanalinadwi.org

درمیان تفریق جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ نااہل قیادت سامنے آئی، اور دوسرے، مفید وضروری علوم وفنون سے بے اعتنائی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ گمراہیوں اور بدعتوں کو فروغ ملنا شروع ہوا۔ باقی مشکلات جوامت مسلمہ کو پیش آئیں، وہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی عوامل کا نتیجہ تھیں۔

اگران ہی چار عواملِ عروج وزوال پر غور کیا جائے جن کی نشاندہی مولانا علی میاں نے اس کتاب میں کی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تہذیبی فکر اور تاریخی نظر کس قدر گہری، ہمہ گیر اور بصیرت افروز تھی۔

شاید میری ان گزارشات میں جذبات کا اظہار کچھ زیادہ ہو گیا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ مولانا کی بات ہو اور جذبات دبے رہیں، یہ ممکن نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس تو یہی جذباتِ عقیدت ہیں ایسی ہستیوں کے بارے میں جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور پھر صدیوں یاد کی جاتی ہیں۔ مولانا علی میاں ایک ایسی ہی ہستی تھے، وہ ایسے عالم تھے جن کے اندر علم وعرفان کا ایک عالم سمایا ہوا تھا، وہ ایسے مردِ قلندر تھے جن کے اندر ایقان واحساس کا ایک سمندر موجزن تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں انہی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کا ساتھی بنائے جنہیں انہوں نے ہمیشہ یاد کیا، خود بھی یاد رکھا اور دوسروں کو بھی ان کی یاد سے گرماتے رہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

زاہد منیر عامر

مولانا علی میاں اور پاکستان

تجزیہ وتوقعات

۱۹۷۸ء میں اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے ایک استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے دور حاضر میں عالم اسلام کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھوے اور خرگوش کی تلمیح استعمال کی تھی ــــ روایتی کہانی میں خرگوش بہت تیز رفتار تھا اور کچھوا سست رفتار، لیکن خرگوش سورہا اور کچھوا مسلسل محوِ سفر رہا جس کے نتیجے میں کچھوا اپنی اجباری سستی کے باوجود معرکہ جیت گیا تھا، مقابلہ آج بھی کچھوے اور خرگوش کا سا ہے، لیکن معاملہ یہ ہے کہ کچھوا اپنی سست رفتاری کے ساتھ سو بھی رہا ہے اور خرگوش اپنی تیز رفتاری کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔

اس کچھوے کو گراں خوابی سے کون بیدار کرے گا؟ ــــ مولانا علی میاں کے خیال میں یہ فریضہ ملتِ اسلامیہ پاکستان کو انجام دینا ہے ــــ مولانا علی میاں نے پاکستان کو تمام اسلامی دنیا کی روح قرار دیا اور کہا کہ عالم عرب اور اسلامی ممالک میں زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پر ہے ــــ اسلام کے عقائد پر ایک نیا یقین، ایک نیا اعتماد، ایک نیا ولولۂ عمل، نئی جراتِ اندیشہ، نئی لذّتِ کردار اور ایک نیا جذب دروں پیدا کرنے کی ذمہ داری جسے ادا کرنے سے ''اونگھتی، سوتی، آمادۂ زوال اور ڈگمگاتی قوموں کو نئی زندگی اور نیا جوش وخروش ملے، پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔''

پاکستان عالم اسلام کی فکری راہ نمائی کا ذمہ دار ہے۔ پاکستان جس نظریے کا داعی اور علم بردار ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ ملک دنیا بھر میں اس نظریہ حیات کے ماننے والوں کے

www.abulhasanalinadwi.org

لیے ایک فصیل اور مثال کا کام دے ـــــ دنیا کے جس گوشے میں بھی اسلام اور مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچے، ان کی نگاہیں پاکستان کی طرف اٹھیں اور کبھی نامراد نہ لوٹیں، ماضی میں جو مقام سلطنت عثمانیہ کو حاصل تھا، مولانا علی میاں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اب وہی مقام پاکستان کو حاصل ہونا چاہیے۔ آج دنیا میں ایک بھی ایسا اسلامی ملک موجود نہیں جو مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے اپنا وزن ڈالے تو دنیا اس کا وزن محسوس کرے اور مسئلے کے حل پر مجبور ہو جائے ـــــ مولانا علی میاں کے خیال میں یہ کردار پاکستان کو ادا کرنا چاہیے اور یہ مقام پاکستان کو حاصل ہونا چاہیے، لیکن پاکستان جن چند در چند مسائل اور مشکلات کا شکار رہا ہے، مولانا علی میاں ان سے بے خبر نہیں تھے، انہوں نے مختلف اوقات میں پاکستان کے مسائل کا جو تجزیہ پیش کیا، اس سے ان کی نگاہ میں پاکستان کے تین بڑے مسائل نمایاں ہوتے ہیں۔

تہذیبی تفاوت کا مسئلہ

مختلف علاقوں کی تہذیبی اور لسانی ساخت کے پیدا کردہ مسائل جنہیں علاقائیت اور لسانیت کی خردبینوں سے دیکھا جائے تو بہت بڑے ہیں اور ہر خطہ ان کی بناء پر اپنی الگ قومیت کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن یہ دعویٰ پاکستان کے اساسی نظریے سے روگردانی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کی اساس تہذیب و تمدن اور زبان کے ایک بالکل مختلف نظریے کی بناء پر استوار ہے، مختلف لسانی گروہوں، تمدنوں اور علاقوں میں یگانگت پیدا کر دینے کا جو وصف یہ نظریہ رکھتا ہے اس میں دنیا کا کوئی دوسرا نظریہ اس کا ہم سر نہیں۔

مولانا علی میاں نے اس حوالے سے مکہ اور مدینہ کی خوب صورت مثال پیش کی ہے۔ مکہ اور مدینہ جن کا نام عام سیرت نگاروں کی طرح ایک ہی سانس میں لیتے ہوئے انہیں ہم ایک ہی یونٹ تصور کرتے ہیں ـــــ ایک یونٹ کا نام نہیں ہے، بلکہ دو مختلف تمدنوں کے حامل علاقوں کے نام ہیں جن کی بنیاد تہذیب یا معاشرت کی وحدت پر نہیں تھی۔ زبان کی وحدت تھی، مگر اس میں بھی

www.abulhasanalinadwi.org

لہجوں کا اتنا فرق تھا جو ایک کو دوسرے سے دور رکھنے کے لیے کافی ہوتا ہے ـــــ اور پھر مدینہ والوں کے مقابلے میں اہل مکہ کا احساسِ برتری اور خود مدینہ میں اوس وخزرج قبائل کا دو الگ قوموں کی طرح معرکہ آرا ہونا، یہ تمام اختلافات اسلام کے اس تصور وحدت نے مٹا دیے جو بقول مولانا علی میاں اپنے اندر مقناطیسیت رکھتا ہے ـــــ اسلام ارباب دنیا کے چھوٹے چھوٹے مقاصد سے جنم لینے والی چھوٹی وحدتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، اس کی دلچسپی صرف دو حقیقی وحدتوں سے ہے اور یہ دونوں دنیا کی بے ضرر ترین وحدتیں، ''وحدتِ انسانیت'' اور ''وحدتِ ایمان'' ہیں جن کے بعد تمام چھوٹی وحدتیں بے معنی قرار پاتی ہیں۔

فروعی اختلافات کا مسئلہ

مولانا علی میاں کا کہنا ہے کہ فروعی بحثیں علم اور ذہانت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں اور یہ ہمیشہ سے رہی ہیں، کیونکہ زندہ انسانوں میں ہمیشہ ہی اختلافات پیدا ہوا کرتے ہیں، لیکن جب یہ فروعی بحثیں عوام میں آجائیں اور سیاسی رنگ اختیار کرلیں تو علم ونظر کو کشادہ کرنے والی یہی بحثیں مضر اور نقصان رساں بن جایا کرتی ہیں۔ علمی، فقہی اور کلامی مسئلے علماء تک محدود رکھے جانے کی چیز ہیں، متاع کوچہ وبازار بنانے کی نہیں۔

گروہ بندیوں میں غلو کا مسئلہ

جب فروعی مباحث کو پنپنے اور عوام میں رسوخ پانے کا موقع ملتا ہے تو ان کی بنیاد پر بھی ویسے ہی گروہ وجود میں آجاتے ہیں جیسے علاقوں اور زبانوں کی بناء پر وجود میں آیا کرتے ہیں ـــــ یہی گروہ جدید عمرانیات کی زبان میں جماعتیں اور پارٹیاں بن گئے ہیں ـــــ جماعتیں اور پارٹیاں جو رفتہ رفتہ اپنا مقصد آپ بن جایا کرتی ہیں اور ملت کا اجتماعی مفاد پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ مولانا علی میاں نے اہل پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

www.abulhasanalinadwi.org

میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملت کے مفاد کا تقاضا ہے کہ حرفِ غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہو گا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کروں۔ یہ وہ قربانی ہے جس کا سبق حضرت خالدؓ بن ولید کی قربانی ہمیں دیتی ہے۔

چنانچہ اس وقت علمائے امت کے کرنے کا کام امت کی صلاحیتوں کو متحد و مرتکز کر کے اشاعت اور احیاء کی سرگرمیوں کی طرف لانا ہے، موجودہ نازک اور عبوری دور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا یہی طریقہ ہے۔

مسلمان اپنی تاریخ کے تناظر میں ایک بڑی قوم ہیں۔ عقیدے اور نظریے کی بڑائی بھی رکھتے ہیں، لیکن محض ماضی کا منور ہونا مستقبل کے فروزاں ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتا، تاریخ ہر گزرتے لمحے پر اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔ دستِ قضا میں وہی قومیں صورت شمشیر رہا کرتی ہیں جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب کرتی ہوں ـــــ مولانا علی میاں نے بڑی دردمندی کے ساتھ کہا تھا کہ ''اب اسلام کی تاریخ اور مسلمانوں کے صبر و تحمل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں کہ کوئی دوسرا ملک اسپین بنے۔''

اس خطرناک اندیشے سے بچنے کے لیے اہل پاکستان کو خیر کثیر ـــــ یعنی حکمت کی طرف رجوع کرنا ہوگا ـــــ حکمت سے مراد قرآن حکیم ہے، حدیث رسولؐ ہے، اچھی سمجھ بوجھ ہے ـــــ سب کچھ ہے، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی تحقیق کے مطابق حکمت سے مراد اخلاق ہے ـــــ اخلاق فاضلہ۔

معاشروں کے اخلاق بگڑتے ہیں تو ان کے مزاج بگڑ جاتے ہیں، ''فاسد الاخلاق'' معاشروں کے مقابلے میں ''فاسد المزاج'' معاشروں کا علاج زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

خرابیٔ مزاج کی ایک شکل اپنی جنت کو دوسروں کے ہاتھوں کی لکیروں میں تلاش کرنا بھی

www.abulhasanalinadwi.org

ہے ــــ جب قومیں اپنی جنت اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں تلاش کرنا سیکھ لیتی ہیں، اپنے فکر کی صلاحیت اور صداقت کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں تو پھر ان پر کامیابیوں کے دریچے ہی نہیں، دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن قوموں میں یہ شعور کون پیدا کرتا ہے ــــ ؟

تعلیمی، تربیتی اور تحقیقی ادارے ہی وہ مراکز ہیں جہاں کی کارگاہوں میں نئی نسل کے افکار کی صورت پذیری ہوا کرتی ہے، لیکن یہ ادارے تو بے معنی ہیں، اگر انہیں نیا اور تازہ خون میسر نہ ہو ــــ وہ لوگ جو سچی علمی تحقیق کے جذبے سے سرشار ہوں، وہی ان اداروں کا نیا اور تازہ خون ہیں، لیکن وہ دور جب جذبہ، خیال، فکر ہر شے فروختنی ہو، اس میں علم بھی جنسِ بازار بن جایا کرتا ہے، پھر تحقیق کا وہی حال رہ جاتا ہے، جس کا نقشہ حضرت علامہ اقبال نے یوں کھینچا تھا۔

شیر مردوں سے ہوا بیشہ تحقیق تہی
رہ گئے صوفی و ملاّ کے غلام اے ساقی

دراصل علم و تحقیق کسی رسم کا نہیں، ایک رویے کا نام ہے، یہ رویہ بے لوثی اور بلندی چاہتا ہے۔ ریت کے کچے گھروندوں کو اپنے مسکن سمجھتے رہنے سے یہ رویہ پیدا نہیں ہوتا، اس کے لیے تو سورہ کہف میں مذکور نوجوانوں جیسے جذبے، جرأت اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔ اس کے لیے زندگی کی نئی جہات کی تسخیر کے سفر پر روانہ ہونا ہوگا ــــ اس مقصد کے لیے مولانا علی میاں نے نوجوانوں کو اپنے اندر تین صفات پیدا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے:

۱۔ ان کا وجود دوسروں کے لیے نافع ہو۔

۲۔ طبیعت میں استغناء پیدا کیا جائے۔

۳۔ اپنے شعبۂ علم میں صاحبِ کمال بنا جائے۔

ان سب پر مستزاد تزکیۂ باطن ہے جو اگر میسر نہ ہو تو بقول علی میاں کتاب و حکمت بھی ناقص رہ جاتے ہیں۔

اگر نوجوانانِ ملت اس لائحہ عمل کو اختیار کرلیں تو اپنی شخصیت پر خارج کے مسلسل حملوں کے

www.abulhasanalinadwi.org

باوجود اپنے باطنی جوہر کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ اس لائحہ عمل کو اختیار کر لینے سے ہم علم کا رشتہ رب سے جوڑ سکتے ہیں۔ جب علم کا رشتہ خالق کے ساتھ استوار ہو جائے گا تو پھر ہم ایک واقعی اسلامی معاشرے کی تشکیل کر سکیں گے اور اسلامی عقیدے کی مظہر مملکت ـــــ پاکستان کو، اسلامی تمدن کا مظہر ملک بھی بنا سکیں گے۔

پاکستان کے حوالے سے یہی مولانا علی میاں کا خواب ہے:

ملالِ عالمیان دم بدم دگرگوں است
منم کہ مدت عمرم بہ یک ملال گزشت

www.abulhasanalinadwi.org

٥

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

مولانا فضل محمد

[مولانا فضل محمد (م ۱۹۸۱ء)، مہتمم مدرسہ قاسم العلوم فقیر والی، ضلع بہاول نگر دینی تعلیم کے مروجہ نصاب میں ترمیم کرتے ہوئے اپنے مدرسے کے لیے ایک نیا نصاب مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تقسیم ہند سے کچھ پہلے مشاہیرِ وقت کو ایک سوالنامہ ارسال کرکے ان کی رائے طلب کی تھی۔ مولانا علی میاں نے مختصراً اپنی رائے کا اظہار خط کی صورت میں کیا۔ خط سے پہلے مُرسلہ سوالنامے پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مرتب]

سوال نامہ

۱- ''علوم مقصودہ'' ـــ تفسیر، حدیث، فقہ ـــ میں کون کون سی کتابیں رکھی جائیں جن سے کم از کم وقت میں اچھا، اور زیادہ کام لیا جاسکے؟

۲- ترجمۂ قرآن شریف کے بعد تفسیر میں ''جلالین'' کے علاوہ کوئی دوسری معتدل تفسیر بھی تجویز کی جائے۔ ''تفسیر مظہری'' یا ''تفسیر جوہری طنطاوی'' کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟
''دورۂ حدیث'' سے پہلے حدیث میں ''مشکوٰۃ شریف'' کے علاوہ ایسی اور کیا کتاب رکھی جائے جو حذفِ مکررات کے بعد صحاح ستہ کو حاوی ہو۔ ''جمع الفوائد'' اور ''تیسیر الوصول'' کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے۔
فقہ کی مجوزہ کتب میں فتویٰ نویسی کی رعایت سے بھی کوئی کتاب ضرور رکھی جائے۔

۳- اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث میں ''الفوز الکبیر''، ''نخبۃ الفکر'' کے علاوہ اور کیا کتاب رکھی جائے؟ ''خیر الاصول'' اور مولانا عبدالحق دہلوی کے رسالہ کے بارہ میں کیا رائے ہے؟

۴- ''علوم آلیہ'' ـــ ادب، کلام، معانی، مناظرہ، منطق، فلسفہ، ہیئت، میراث، صرف، نحو ـــ میں کیا کیا کتابیں رکھی جائیں جو بقدرِ ضرورت استعداد کو حاوی ہوں، نیز وقت بھی بحیثیت انفرادی ''علوم مقصودہ'' سے زائد صرف نہ ہو۔ طریقِ مطالعہ و تعلیم کی وضاحت کی جائے۔ درستگی اخلاق و اصلاح باطنی و ظاہری کا لحاظ بھی ضرور رکھا جائے۔

۵- فلسفۂ جدید، منطق جدید، سائنس، جدید علم کلام، تاریخ، اخلاقیات، معاشیات، سیاسیات، علم النفسیات

www.abulhasanalinadwi.org

وغیرہ علوم عصریہ بھی آپ کے نزدیک قابل اضافہ ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کون کون سے؟ اور کس حد تک؟ کتابیں کیا کیا رکھی جائیں؟ طریقِ تعلیم ومطالعہ کیا ہو؟ حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ اکابر کی کتابوں کے بارہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ مناظرہ کے بارہ میں موجودہ ضروریات مثلاً مرزائیت، خاکساریت، بدعات و رسومات کی تردید ومعلومات کے لیے مناسب کتب کی تجویز کی ضرورت ہے؟

۶- فرضی مناظروں اور تقریروں کے بجائے اگر طلبہ کو عملی طور پر تبلیغ میں شرکت کا موقع دیا جائے، جس سے قوم کے صحیح امراض، احساسات ورجحانات کے اندازہ کا موقع بھی ملتا رہے گا، اور دکھتی ہوئی رگوں پر صحیح نشتر زنی کی مشق بھی تدریجاً بہم پہنچتی رہے گی، گویا طلبہ کے لیے یہ عملی قسم کی ٹریننگ ہوگی، اس میں آپ کی کیا رائے ہے؟

۷- ابتدائی تعلیم کے لیے بھی نمبروار ہدایات کی ضرورت ہے۔

● داخلہ کے لیے معیارِ عمر اوسطاً کیا رکھا جائے اور مدتِ تعلیم کل کتنی ہو؟

● اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کو بھی معیار قرار دیا جائے، یا بلا تخصیص سب کو ایک طرف سے داخل کر لیا جائے۔

● دینیات کی تعلیم کا قدیم مروجہ طریقہ زیادہ مفید ہے کہ مثلاً اول قرآن مجید کی تعلیم مکمل کر لی جائے۔ بعد ازاں اردو، فارسی وغیرہ شروع کرائی جائے، یا جدید مخلوط طریقہ تعلیم زیادہ بہتر ہے، مثلاً دینیات، اردو، فارسی، قرآن شریف سب کے الگ الگ گھنٹے مقرر کر دیے جائیں۔ سب مضامین ایک ہی معلم سے متعلق ہوں، یا مختلف اساتذہ کے پاس ہونے چاہییں؟ پہلی قدیم صورت میں وقت زیادہ صرف ہوتا ہے، اور ثانی جدید صورت میں متعلقہ مضامین ناقص اور نامکمل رہ جاتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟

● قرآن شریف ناظرہ، حفظ، اردو، حساب، جغرافیہ وغیرہ مضامین کی مدتِ تعلیم کیا رکھی جائے؟

● اور ان کا نصاب کیا مقرر کیا جائے۔

● معلم کے اوصافِ ضروریہ کی تشریح فرمائی جائے۔

● جسمانی تربیت کے لیے کیا طریقہ تجویز کیا جائے؟ اور ورزش کے لیے کون سے کھیل رکھے جائیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

—— ۱ ——

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ نقشبندی

رائے بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ شرف صدور لایا۔ آپ کے مدرسہ اور آپ کی مساعی سے اجمالاً واقفیت تھی۔ جن مقاصد و خصوصیات کے ساتھ آپ مدرسہ کو چلانا چاہتے ہیں، وہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، مگر افسوس ہے کہ حضرات علماء ہی اس سے سب سے زیادہ بے اعتنائی برت رہے ہیں جس کی وجہ سے مجھے شدید خطرہ ہے کہ مستقبل میں ہندوستان میں دینی تعلیم باقی بھی رہ سکے گی یا نہیں۔

میں نے رسالہ ''الفرقان'' اور ''الندوہ'' مرحوم میں ''اسلام کے قلعے'' کے عنوان کے ماتحت اپنے خیالات کا تفصیل کے ساتھ اظہار کیا ہے۔ اگر کہیں سے آپ کو یہ پرچے مل سکیں تو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

آپ نے جو سوالات قائم کیے ہیں، ان کے جواب کچھ تفصیل اور وقت چاہتے ہیں۔ اگر اس کا انتظار کیا جائے تو معلوم نہیں، کب اس کی نوبت آئے، اس لیے مختصراً عرض کر دیتا ہوں۔ نیز بلا تکلف ہر سوال کے جواب کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ جو میرا موضوع نہیں اور اس سلسلے میں میری کوئی نظر اور علمی تجربہ نہیں، اس کو اصحابِ نظر پر محول کردوں گا۔

۱۔ علوم مقصودہ تفسیر و حدیث و فقہ میں کتابوں میں اتنی تبدیلی اور اضافے کی ضرورت نہیں، جتنی طرزِ تعلیم، مطالعہ اور استعداد آفرینی کے لحاظ کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں ان فنون میں جو مستند قدیم کتابیں داخل ہیں، ان سے استغناء مشکل ہے اور ان کا بدل بھی آسان نہیں، لیکن طرزِ تعلیم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

اصل انحصار معلمین، ان کی تربیت، زمانہ کے فہم اور روحِ دعوت، جدید علم سے واقفیت پر ہے۔ اس میں سے ہر جزو مستقل تفصیل طلب ہے، خط اس کا متحمل نہیں۔ مختصر یہ ہے اگر معلمین ان علوم کے مقاصد و کلیات کو گرفت میں لے آتے ہیں، زمانے کے رجحانات اور ذہن کے نئے راستوں سے واقف ہیں، مسائل دینیہ کو ذہن نشین کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں، اور دعوت کا جذبہ ہے تو ان کے لیے موجودہ کتب بھی کافی اور مفید ہیں، اور اگر ایسا نہیں تو کتابوں کی تبدیلی بے کار ہو گی۔ میرے نزدیک ان کتابوں کو ابھی بحالہ قائم رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔

۲- ترجمہ قرآن شریف کے بعد "جلالین" کے علاوہ "مدارک" مناسب ہوسکتی ہے، مگر اصل یہ ہے کہ کوئی ایک تفسیر ہی کافی نہیں، طالب علم کو اس کا عادی بنانا چاہیے کہ وہ چند تفسیروں کو سامنے رکھ کر مطالب حل کرے۔ اگر تھوڑے سے حصہ میں بھی اس کی عادت پڑ گئی تو بہت مفید ہوگی۔ "تفسیر مظہری" بھی کچھ طویل ہے، "تفسیر طنطاوی" کسی طرح موزوں نہیں۔

دورۂ حدیث سے پہلے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ کوئی کتاب ایسی پڑھائی جائے جس سے طالب علم کو روحانی اور اخلاقی فائدہ ہو اور مسائل اور احکام کے بجائے فضائلِ اعمال و اخلاق معلوم ہوں۔ اخلاص، ایمان و احتساب اور جذبہ عمل بیدار ہو، اس کے لیے سب سے زیادہ موثر بابرکت کتاب امام نووی کی "ریاض الصالحین" ہے، اس کو ضرور رواج دینا چاہیے کہ حدیث کا اصل موضوع یہی ہے، اس کی طرف سب سے کم توجہ ہے۔ فتویٰ نویسی کے سلسلہ میں مولانا اعزاز علی صاحب اور جناب مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا خیر محمد جالندھری سے استصواب کیا جائے۔

۳- اصول تفسیر میں "الفوز الکبیر" نہایت ضروری ہے، لیکن کوئی ایسے صاحب پڑھائیں جو قرآن کریم سے مناسبت اور قرآن مجید کا طبعی ذوق رکھتے ہوں اور شاہ صاحب کے طرز سے آشنا ہوں۔ اصول حدیث کے سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (مظاہر العلوم)، مولانا ادریس صاحب (دار العلوم) سے مشورہ کیا جائے۔

www.abulhasanalinadwi.org

۴-صرف ونحو میں طرز تعلیم بدلنے کی فوری وشدید ضرورت ہے۔ سب سے ابتدائی کتابیں اپنی زبان میں مشق واستقرائی اصول پر ہوں۔ مصر کا سلسلہ ''النحو الواضح'' اور اس کا اردو چربہ ''تمرین النحو'' ملاحظہ ہو۔ مدرسین صاحب استعداد واجتہاد ہوں جو اپنے فن کو دلچسپ اور سہل کر سکیں۔

ادب سے پہلے زبان کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ ابتدائی درجوں کے لیے ''الطریقۃ الجدیدہ'' (مولانا محمد ناظم صاحب ندوی، استاذ دارالعلوم ندوہ)، ''قصص النبیین للاطفال ۱-۲-۳'' از کاتب الحروف، ''القراءۃ الراشدہ'' (۱-۲-۳) زیر طبع، اختیار کرنی چاہییں۔ عربی زبان کی تعلیم دراصل ہمارے مدارس میں نہیں ہورہی، اس کے لیے خود عربی ممالک میں بھی شاید اس سے بہتر نصاب تیار نہ ہوا ہو۔

ادب کے لیے ''مختارات من ادب العرب'' (مطبوعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء) موزوں کتاب ہے۔ مکتبہ التعاون، دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ سے یہ کتابیں مل سکتی ہیں۔ ''الترجمۃ العربیۃ'' (مولفہ مولانا مسعود عالم ندوی ومولانا محمد ناظم) بھی قابلِ اضافہ ہیں۔

کلام کی تعلیم کے لیے قدیم کتابیں مثلاً ''شرح عقائد نسفی'' وغیرہ نہ صرف ناکافی، بلکہ مضر ہیں۔ دراصل اس کی از سرِ نو تدوین وترتیب کی ضرورت ہے۔ جب تک کوئی شایانِ شان کتاب نہ ہو، ''مضامین قرآن'' از راقم سطور، ''رسالہ اہل سنت'' از مولانا سید سلیمان ندوی سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مطالعہ کے لیے ''مذہب وعقلیات'' از مولانا عبدالباری ندوی، ''مذہب وتمدن'' از راقم سطور، ''تنقیحات'' و ''تفہیمات'' از سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ یہ سب علم کلام سے متعلق ایک نظریہ پر مبنی ہیں جس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ کبھی ملاقات ہوتو عرض کیا سکتا ہے۔ نمبر ۵ کا مجمل جواب بھی اوپر آ گیا۔ ان تمام عناوین کے لیے نئی کتابوں کی ترتیب کی ضرورت ہے، اور اس کا سامان نہیں۔ اگر ان میں عجلت سے کام نہ لیا جائے تو ایک متوسط مدرسہ کے لیے اس کی گنجائش ہے۔

شاہ صاحب کی کتابوں میں سے رسالہ ''انصاف'' اگر داخلِ درس ہوتو طلبہ حدیث کے لیے چشم کشا، بصیرت افروز واعتدال آفرین ہوگا۔ باقی ''ازالۃ الخفاء'' کے مطالعہ کی تشویق وترغیب ہو،

www.abulhasanalinadwi.org

''حجۃ اللہ'' بلند [پایہ] کتاب ہے، اگر استعداد ہو تو اس کے منتخب ابواب پڑھانے چاہییں۔

نمبر ۶ - مناظروں کے بارہ میں مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا الیاس صاحب کے طریقہ کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔ مولانا کی سوانح اور ''ایک اہم دینی دعوت'' ضرور ملاحظہ ہو۔

۷ نمبر کے استفسارات تجارب و انتظامی امور سے متعلق ہیں۔ مدارس کے مہتمم حضرات سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا جاسکتا ہے۔ کبھی ملنا ہو تو شاید کوئی مفید بات ہو سکے۔

امید ہے کہ فی الحال اسی قدر پر اکتفاء کی اجازت دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب و بامراد فرمائے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خاکسار

ابوالحسن علی

مکتبہ اسلام، نمبر ۳۷، گوئن روڈ - لکھنؤ

مولانا سید سلیمان ندوی

—— ۲ ——

حضرۃ الاستاذ المحترم متعنا اللہ بطول بقاہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ نے شرف بخشا۔ ''تبصرۃ للناس'' میں نے خود مولانا منظور صاحب کو ان کے ہاتھ میں دہلی میں دیا، انہوں نے فرمایا کہ میں تقاضے کا خط لکھ چکا ہوں، اور وعدہ فرمایا کہ اس کی وصولیابی کی اطلاع کر دیں گے۔ سفر و مشاغل میں غالباً بھول گئے، اب خط آتا ہوگا، جناب اطمینان رکھیں۔ میں نے لکھنؤ سے اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ مولانا آج کل بریلی میں نہیں ہیں، آخر شوال میں سہارن پور اور دہلی آئیں گے اور وہیں مجھ سے ملاقات ہوگی۔

www.abulhasanalinadwi.org

جناب نے اس گرامی نامہ میں جو کچھ فرمایا ہے، اس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے، اس سے پہلے بھی جناب اس مضمون کی طرف وقتاً فوقتاً متوجہ فرماتے رہے ہیں اور یہ ارشادات بے اثر نہیں رہے۔ میں نے بھی اپنی تمام حقیر کوششوں اور دلچسپیوں کو دارالعلوم میں مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے۔

شہری تبلیغ کا بھی اسی کو مرکز بنا رہا ہوں جس کی تفصیل ان شاء اللہ آپ اپنی آئندہ آمد میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ مجھے جناب کے ان ارشادات وتنبیہات کی بہت ضرورت ہے، تاکہ بے راہ روی اور بے اعتدالی نہ پیدا ہونے پائے، اور وقت وقوت ناتجربہ کاری سے بے عمل ضائع نہ ہوں۔

ایک چھوٹی کتاب اس لیے بھیجوں گا کہ جناب اس کو اوّل سے آخر تک ملاحظہ فرمالیں، اور اس کی اصلاح وتصحیح فرمادیں تاکہ کسی غلط چیز سے نقصان نہ پہونچے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

خاکسار

ابوالحسن علی

۳۱ اکتوبر ۴۴ء

مولانا مسعود عالم ندوی

[مولانا مسعود عالم ندوی (م ۱۹۵۴ء) نے، جو مولانا علی میاں کے نہایت گہرے اور ہم ذوق دوست تھے، اپنے نام زیرِ نظر مکاتیب اشاعت کے لیے مرتب کیے تو ان کے تعارف میں مکتوب نگار کے ساتھ اپنے تعلقِ خاطر اور اشتراکِ ذوق کے بارے میں لکھا:

ان میں سے تین خط مکہ مکرمہ اور قاہرہ سے لکھے گئے تھے اور ایک راقم کے نام بغداد بھیجا گیا تھا، بہر حال سب کا تعلق "دیارِ عرب" ہی سے ہے۔ ان میں عربی کے ادیبوں اور لکھنے والوں کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا ادبی ذوق ہے۔ ہم دونوں رہتے تو ہیں ہندوستان اور پاکستان میں، مگر علمی اور ادبی طور پر ہمارا طائرِ فکر قاہرہ اور دمشق میں پرواز کرتا رہتا ہے۔ ہم اردو ادب اور ادیبوں کی نسبت، عربی ادب اور ادیبوں سے زیادہ واقفیت اور دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ چیز اچھی ہے یا بری، یہاں اس سے بحث نہیں۔ ان خطوط کے پس منظر کے سمجھنے

www.abulhasanalinadwi.org

کے لیے اس حقیقت کا جاننا ضروری ہے۔

جی چاہتا تھا کہ مکتوب نگار کے ادبی کمالات اور مجاہدانہ خصوصیتوں کی طرف کچھ اشارے کروں، مگر غور کرنے پر اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ موصوف کے کمالات سے کون واقف نہیں؟ ان کا ذکر کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے، البتہ کہیں کہیں حاشیے میں بعض ضروری امور کی تشریح کر دی گئی ہے۔

مکتوب نگار نے اپنے اس حقیر اور گنہ گار دوست کے متعلق جن الفاظ میں بار بار اظہار خیال کیا ہے، اسے ان کی نگاہِ محبت پر محمول کرنا چاہیے۔ محبت کی نظر خوبیاں ہی خوبیاں دیکھتی ہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی نے مکاتیب میں مذکور بعض واقعات اور اشخاص کے بارے مین حواشی بھی لکھے ہیں، وقت گزرنے پر ان میں کہیں کہیں اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے، یا کچھ حصہ حذف کرنا پڑا ہے۔ ہر اضافہ حوضین''[ ]'' میں درج کیا گیا ہے، اور محذوف فقرے کی جگہ نقطے (---) لگا دیے گئے ہیں۔ نئے حواشی کے آخر میں ''مرتب'' کا لفظ لکھ دیا گیا ہے، تا کہ مولانا مسعود عالم ندوی کے حواشی کے ساتھ کوئی التباس پیدا نہ ہو۔ مرتب]

—— ۳ ——

۳۷- گوئن روڈ، لکھنؤ

۶ شوال المکرم ۶۸ھ

میرے نہایت مخلص و مشفق بھائی، گُلِ سر سبدِ احباب و سرمایۂ افتخارِ دوستاں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی جعلہ اللہ مبارکاً و مسعوداً اینما حلّ ونزل

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا محبت نامہ الٰہ آباد ۲ سے وسط رمضان مبارک میں پہونچا، پڑھا اور بار بار پڑھا۔ ہر بار لطف تازہ و سرور بے اندازہ ع

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

رائے بریلی سے نامہ بر کی ہوا میں پرواز مشکل تھی، لکھنؤ آمد کا انتظار تھا، لکھنؤ آیا تو بخار کی

www.abulhasanalinadwi.org

حالت میں، اب بھی نقاہت ہے۔ کل دو خط دوسرے سے لکھوائے، مگر نامۂ مسعودی (نامہ دوست) میں اغیار کا دخل گوارا نہ ہوا۔

اول تو ترقی صحت پر مبارکباد، اللہ تعالیٰ دوستوں اور نیازمندوں کے لیے اور اس سے بڑھ کر سیدنا محمد روحی فداہ کے "دین مظلوم" اور "امت مرحوم" کے لیے مبارک فرمائے۔ اللھم آمین۔ آپ کا عراق میں ہونا، گویا اس ناچیز کا ہونا ہے۔ آپ کے فضائل و کمالات مستزاد۔ دین کی تخم ریزی کے لیے اس کشتِ ویراں میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیے، حجت تمام کر دیجیے، دن رات ایک کر دیجیے، دل کو جلایے اور بدن کو گھلایے، خونِ دیدہ اور خونِ جگر بہایے، اور اس طرح بہایے کہ دجلہ وفرات اپنی تنگ ظرفی اور کم مائیگی پر ماتم کریں۔ ایک ایک کا گریبان تھام کر کہیے کہ صحرائے عرب کے بھٹکے ہوئے آہو، اے عالم کی آبرو، اے ابراہیمؑ و محمدؐ کی آرزو، تو کہاں گم ہے؟ کیا سیدنا عمرؓ کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی، مثنیٰؓ بن حارثہ کے خونِ شہادت، ابو عبید ثقفیؓ کی پامالی اور استخوان شکنی، سعدؓ بن ابی وقاص کی علمبرداری، علیؓ بن ابی طالب کی جگر سوزی، اشک ریزی اور خطابت و تاثیر کی طوفاں خیزی، آبروئے شہیداں، جگر گوشہ رسول کی تشنگی اور خاندانِ رسالت کے خون کی ارزانی، ابوحنیفہ کی دماغ سوزی، احمد بن حنبل کی تعزیر جرمِ عشق، ابن جوزی کی حمایتِ سنت، عبدالقادر جیلانی کی دردمندی کا حاصل صرف یہ ہے کہ تو ائمہ ضلالت کا ادنیٰ غاشیہ بردار اور اس کی راہ کا غبار ہے۔ عراق کے اس مقبرہ میں صور پھونک دیجیے اور شورِ قیامت برپا کیجیے کہ

گرفتہ چینیاں احرام ومکی خفتہ در بطحا

شاید چلتی پھرتی لاشیں پھر زندہ ہو جائیں۔ آپ کو معلم ابراہیمؑ نے عربی زبان کا ادیب بے بدل اسی دن کے لیے بنایا تھا، ندوہ نے اسی دن کے لیے گود میں پالا تھا۔ ہلالی صاحب کو عراق سے اسی لیے بھیجا تھا کہ آپ اس کام کے لیے تیار ہوں۔ راتوں کو رویے اور دن کو دل کا درد کاغذ پر اتاریے۔ میدانِ بدر کی طرح ایک طرف اپنی قوت کی پونجی اور عمر کی کمائی قدموں پر رکھ دیجیے، دوسری طرف سر خاک پر رکھ کر، پیشانی رگڑ کر، فتح و نصرت کی دعا کیجیے کہ وما النصر الا من عند الله۔ کیا

www.abulhasanalinadwi.org

لکھنے کے لیے قلم اٹھایا تھا، کیا لکھ گیا:

بک گیا ہو جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

گستاخی اور حد احترام سے تجاوز، معاف کیجیے کہ

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہلالی صاحب[۳] سے آپ نے اس تاخیر کے متعلق جو کلمہ خیر فرمایا، وہ عین توقع کے مطابق ہے۔ شنشنة اعرفها من أخزم[۴] اور الشیئ من معدنه لا یستغرب[۵]، اتنا اور فرما دیجیے کہ مشکل سے کوئی رات گزرتی ہوگی کہ آپ کے لیے دعا نہ کرتا ہوں۔ آپ کے یاد کرنے کی تقریبیں بھی بڑی مبارک ہیں۔ فرض نمازوں کے بعد تسبیح فاطمہ اور اذکارِ ماثورہ جو آپ نے تعلیم کیے تھے، آپ کو یاد دلاتے ہیں۔ نماز کو طمانیت و طول کے ساتھ ادا کرنا جو صرف آپ سے سیکھا تھا، آپ کی یادگار ہے۔ صبح جمعہ کو الم سجدہ اور سورہ انسان کا پڑھنا جو آپ کو دیکھ کر شروع کیا تھا، آپ کی یاد تازہ کرتا ہے، اور عربی لکھتے وقت آپ کا یاد آنا طبعی و قدرتی ہے۔ مکہ معظّمہ حاضری ہوئی تو شیخ محمود شویل[۶] کے مکان پر والدہ صاحبہ اور اہلیہ و ہمشیرہ کو سیدہ صفیہ بنت الشیخ تقی الدین کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے خاص طور پر بھیجا تھا۔ میں شیخ کی خدمت میں عریضہ لکھتا، لیکن ایک تو مرض کی نقاہت ہے، دوسرے استاذ کو خط لکھتے ہوئے ہچکچاہٹ اور اپنی غلطیوں کا ڈر لگتا ہے۔ پھر بھی ان شاء اللہ کسی موقع پر لکھوں گا۔ اتنا مضمون ان کو عربی میں سنا دیجیے۔

سیرت شہید[۷] کے لیے آپ کے شوقیہ کلمات برادرم مظفر[۸] نے لکھ کر بھیجے ہیں۔ کل ڈاک کے محاصل معلوم کیے ہیں۔ ان شاء اللہ سیرت کا ایک نسخہ، ''الفرقان'' کا حج نمبر، جو خاص چیز ہے، ''من الجاهلیه الی الاسلام'' اور ''الی ممثلی البلاد الاسلامیہ'' کے دو دو نسخے، ایک آپ کے لیے اور ایک شیخ کے لیے بھیجوں گا۔ اگر بیک دفعہ جانا مشکل ہوا تو شاید دو مرتبہ کر کے بھیجوں گا۔ انتظار فرمایے۔

www.abulhasanalinadwi.org

ان دونوں عربی رسالوں کے جو بغرض اشاعت ہیں، یعنی ''من الجاہلیہ---'' اور ایک نیا رسالہ ''معقل الانسانیہ'' جو جلد ان شاء اللہ چھپ کر آنے والا ہے اور جس میں خطاب عربوں ہی کو ہے، آپ کو معتد بہ تعداد میں بھیجوں گا تاکہ عراق کے اعیان اور اہل فکر کو آپ پیش کر دیں۔ امید ہے کہ ان رسالوں میں آپ کی ترجمانی ہوگی اور آپ ان سے اپنا کام لے سکیں گے۔

شرف الدین صاحب[9] سے متعلق جو خدمت آپ نے سپرد کی ہے، وہ بڑی مشکل ہے۔ اس لیے کہ بمبئی گئے بغیر اس کی سربراہی مشکل ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب[10] سے بھی تذکرہ آیا تھا، وہ بھی ناامید سے ہیں، پھر بھی ان شاء اللہ کوشش ہوگی اور اس کے نتیجے سے مطلع کیا جائے گا۔ ان کا کاروبار تقسیم ہوگیا ہے۔ شیخ عبدالحکیم بن شرف الدین بڑے سنجیدہ اور معقول آدمی ہیں، ان کو شیخ خود لکھیں، تو شاید موثر ہو۔

مولوی عبدالسلام صاحب اس وقت درمیان خط میں آ گئے، خط سنا اور شرف الدین والے معاملہ میں حصہ لیا، سلام کہتے ہیں۔ بھائی صاحب[11] اور مولانا منظور صاحب[12] کا بھی سلام قبول فرمایے۔ اچھا اب رخصت۔ خط کا جواب ضرور اور جلد دیجیے۔ عزیزی عاصم الکوثری[13] کو محبت بھرا سلام۔ وہ خط لکھنے میں اسی طرح مدد کریں۔ والسلام

آپ کا

علی

—— ۴ ——

مکہ معظمہ- رباط بھوپال

۱۹ ربیع الاول ۷۰ھ

برادر محترم ومحبّ اکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ سے اپنی اس تقصیر کی مخلصانہ معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو اس وقت تک ایک خط بھی نہ لکھ

www.abulhasanalinadwi.org

سکا، حالانکہ اس وقت تک متعدد خطوط لکھنے چاہیے تھے، پھر جب کہ آپ نے ازراہِ محبت یاد بھی فرمایا تھا، لیکن کچھ اس قدر انتشار اور کاموں کا عجب ہجوم اور تنوع ہے کہ رائے بریلی[۱۴] صرف خیریت کا خط بھیجا، بعض اوقات مہینہ مہینہ بھر لکھنے کی نوبت نہیں آتی، حالانکہ والدہ صاحبہ سخت پریشان ہوتی ہیں۔ آپ کو تو اطمینان وتفصیل کا خط لکھنا چاہتا تھا، لیکن مجمل بھی میسر نہ آیا۔ اس وقت بھی اتنا وقت ملا ہے کہ چائے آنے والی ہے، ایک مہمان کا انتظار ہے، میں یہ خط لے کر بیٹھ گیا۔ ضروری حالات تو معلوم ہو ہی گئے ہوں گے، اور ان میں کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں، البتہ اس مرتبہ یہاں کے ادبی حلقوں میں بہت گھسنے کا موقع ملا اور ان کو بہت قریب سے دیکھا۔ ان حضرات نے بھی استحقاق واہلیت سے بڑھ کر پذیرائی کی اور توقعات قائم کیں، بلکہ بعض احباب نے وکالت واشاعت وتعارف اس حد تک شروع کر دیا کہ بعض اوقات شرمندگی بھی ہوئی اور کوفت بھی، اور بعض مرتبہ براءت بھی ظاہر کرنی پڑی۔ الاذاعۃ العربیۃ السعودیۃ پر تین بار تقریر کرنے کی نوبت آئی۔ پہلی مرتبہ ''من العالم الی جزیرۃ العرب''، گویا عالم انسانیت کا استغاثہ جزیرۃ العرب کے نام، دوسری مرتبہ اس کا جواب ''من الجزیرۃ الی العالم''، گویا جوابِ دعویٰ۔ پہلے کا ایک نسخہ جو ''الحج'' میں چھپا ہے، آپ کی دلچسپی ومسرت کے لیے بھیج رہا ہوں، اس لیے کہ حقیقتاً یہ ہم سب کے جذبات وخیالات کی ترجمانی ہے اور آپ ہم ایک دوسرے کے کاموں میں شریک ہیں۔ رات تقریباً ۱۹ منٹ کی ایک تقریر ہفتہ سیرت کے سلسلے میں نشر ہوئی۔ جس کا عنوان ہے ''حلول محمد صلی اللہ علیہ وسلم للمشاکل الفردیہ والاجتماعیہ''۔ ایک تقریر اور ان کے پاس ہے جو شاید عنقریب مسجل ہو، ''النبویات فی الشعر الدکتور محمد اقبال''۔ یہاں کے کلیات ومعاہد میں بھی جانا ہوا اور تعلیمی حلقوں سے اچھا ربط پیدا ہوا، کوشش یہ رہی کہ دین کی وقعت ان نئے حلقوں میں پیدا ہو اور اس کی طرف سے بلند تصور قائم ہو، اور حقیقت ان پر منکشف ہو کہ

محمد عربی کابروئے ہر دوسرا است
کسے کہ خاکِ درش نیست، خاک برسرِ او

www.abulhasanalinadwi.org

اس ابتدائی کام کی ابھی یہاں اچھی خاصی ضرورت ہے۔ الحمدللہ کہ یہ کوشش لا حاصل نہیں رہی اور خاصے ممتاز تعلیم یافتہ نوجوان یہ سمجھنے لگے کہ دین ایک قصہ ماضی نہیں ہے، بلکہ ایک ابدی پیغام اور زندگی کا نظام ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا[15] کی کتابوں کے تراجم خصوصاً ''تنقیحات'' کے ترجمہ کی سخت ضرورت ہے۔ طبعی طور پر مختلف موقعوں پر مولانا کی کتابوں، جماعت اسلامی اور آپ کا نام آتا رہا۔ تعلیم پر مقالات کا ایک سلسلہ ''البلاد السعودیہ'' میں شائع ہونے والا ہے جس میں ایک اسلامی ملک میں تعلیم کا تخیل اور خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں جماعت اسلامی کی کوششوں کا صراحتہً ذکر ہے۔

آپ کو بہت سے احباب پوچھتے ہیں۔ ایک نوجوان ماجد السعد مدنی کا خط بھی اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ''الحج'' کے تازہ نمبر میں مدرسۃ الامراء کے ایک استاد احمد علی[16] نے ''دیار عرب میں'' کی تلخیص کی ہے اور شخصیات کے متعلق آپ کے تاثرات اور کچھ مختصر سی روداد آپ کے سفر کی پیش کی ہے۔ یہ پرچہ بھی آپ کو پہونچے گا۔ افسوس ہے کہ یہاں کے حالات کے پیش نظر انہوں نے سفرنامہ کے تمام جاندار حصے حذف کر دیے ہیں۔ شیخ عبداللہ المزروع[17] آپ کو خاص طور پر پوچھتے ہیں۔ ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین؟''[18] کا ایک نسخہ آپ کو لکھنؤ سے پہونچا ہوگا۔ میں نے تاکید لکھ دی تھی۔ اگر نہ پہونچا ہو تو بلا تکلف اپنے شاگرد عزیز محمد ثانی[19] کو مکتبۃ السلام نمبر ۳۷، گوئن روڈ۔ لکھنؤ کے پتہ پر [لکھ کر] تاکیداً منگوا لیجیے۔ ''مقدمہ'' سے بڑی مایوسی ہوئی، خواہ مخواہ ایک مصری ادیب و عالم[20] کو اس کی زحمت دی کہ ایسی کتاب پر مقدمہ لکھیں جس کے موضوع سے شاید ان کو زیادہ ہمدردی نہیں۔ کاش کہ اپنے کسی ہندوستانی بزرگ یا دوست سے لکھوایا ہوتا یا بغیر مقدمہ کے کتاب شائع ہوتی، البتہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض ادباء کتاب کی طرف سے انتصار کر رہے ہیں۔ ''الثقافہ'' کے ایک تازہ پرچہ میں الاستاذ شکری فیصل کا بڑا مبسوط اور منصفانہ مضمون شائع ہوا ہے[21] جس میں کتاب اور اس کے موضوع کی طرف سے مدافعت کا حق ادا کیا ہے، اور

www.abulhasanalinadwi.org

اس سے اختلاف کیا ہے کہ کتاب کی عبارت میں کہیں غموض ہے۔ جس غموض کی طرف احمد امین صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ مطبعی اغلاط کی وجہ سے ہے۔ مطبعی اغلاط بڑے فاحش ہیں اور واقعی ان کے ساتھ کتاب کا سمجھنا کہیں کہیں مشکل ہے۔

آج کل ہمارے مظفر شاہ کہاں ہیں؟ جہاں کہیں ہوں، ان کو یہ خط دکھا دیجیے کہ وہ یہاں فراموش نہیں رہے۔ ان کی طرف سے طواف کی بھی سعادت حاصل ہوئی، ان کا خط ان شاء اللہ ساتھ رہے گا۔ اگر ان کی مطلوبہ کتابیں مصر میں مل گئیں تو لے لوں گا۔ ان کو بہت بہت محبت بھرا اسلام۔

پرسوں ترسوں غالباً (ان شاء اللہ) مصر کو روانگی ہوگی۔ رات جہاز کی اطلاع ملی، اگر فوراً تیاری ہوسکی تو ان شاء اللہ اسی سے روانگی ہوجائے گی۔ مصر مہینہ بھر سے زیادہ قیام کا ارادہ ہے۔ اگر موقع ملا تو ان شاء اللہ وہاں سے بھی ایک خط لکھیں گے۔ اس خط کا جواب ذیل کے پتہ پر عنایت فرمایے:

ابوالحسن علی الحسنی الندوی، بواسطۃ الدکتور احمد امین بک، الادارۃ الثقافیۃ للجامعۃ العربیۃ-الجیزۃ- مصر

اس وقت اسی قدر پر اکتفاء کرتا ہوں۔ جواب کے وجوب کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ عاصم صاحب سلام قبول کریں۔

ابوالحسن علی

رباط بھوپال- مکہ معظمہ

—— ۵ ——

از قاہرہ —— ۱۳ جمادی الاولیٰ ۷۰ھ

برادر گرامی قدر زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ امید ہے کہ مزاج بعافیت ہوگا، ۱۲ ربیع الثانی کو قاہرہ پہونچنا

www.abulhasanalinadwi.org

ہوا، مکہ معظمہ سے روانگی میں برابر تاخیر ہوتی گئی، یہاں تک کہ اندازہ اور ارادہ سے ایک مہینہ سفر مؤخر ہوگیا، لیکن اس تاخیر میں بھی حکمت تھی۔ یہ آخیر دن بڑے مفید اور کارآمد ثابت ہوئے۔ ۱۵ کو سویس [سویز] پہونچے اور اسی وقت وہاں سے کار پر قاہرہ آئے۔ قاہرہ سویس سے ۱۳۰ کیلومیٹر ہے۔ تین گھنٹے میں پہونچنا ہوا، مجلس الشیوخ کے ایک رکن (جو مصر کے بڑے تاجر اور سربرآوردہ شخص ہیں) شیخ جلال بے حسین کو اطلاع کردی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ سب مراحل بآسانی طے ہو گئے جو مسافروں کو درپیش آتے ہیں۔ تین چار دن ان کے اصرار سے ایک ہوٹل میں ٹھہرنا ہوا۔ اس کے بعد ان کے توسط سے شارع موسیٰ میں ایک کمرہ لے لیا ہے، جہاں اس وقت تک قیام ہے۔

اگلے دن سے ان ممتاز شخصیتوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوگیا، جن کا نام ہندوستان سے سنتے تھے۔ حسب ذیل حضرات سے ابتدائی دنوں میں ملنا ہوا:

ڈاکٹر احمد امین بے، شیخ عبدالمجید سلیم شیخ الازہر، احمد محمد شاکر، محمد احمد الغمراوی، محمد علی الطاہر صاحب ''الشوریٰ''، محب الدین الخطیب، محمد زاہد الکوثری، صالح حرب باشا رئیس جمعیات الشبان المسلمین، محمد علی علوبہ باشا، صالح عشماوی، حسین یوسف، اسعد حسنی رئیس تحریر ''العالم العربی''، علی غایاتی صاحب ''منبر الشرق''، شیخ احمد عبدالرحمٰن البنا والد شیخ حسن البنا، شیخ عبدالرحمان البنا شقیق[۲۲] الشیخ حسن، احمد شقیری مساعد امین عام الجامعۃ العربیہ، عبداللہ العمری وزیر یمن، سید خضر حسین[۲۳] رئیس ''الہدایۃ الاسلامیہ''، استاذ فرید وجدی[۲۴] منشی ''مجلۃ الازہر''، شیخ محمد الغزالی صاحب ''من ھنا نعلم'' و ''الاسلام والمناھج الاشتراکیہ''[۲۵] وغیرہ۔

یہ بے جوڑ فہرست اس لیے لکھ دی تا کہ ملاقاتوں کا تنوع اور روداد کا خلاصہ آجائے، اکثر ناموں سے آپ کو دلچسپی ہوگی۔

اس عرصہ میں زیادہ تر اخوان سے ملنا ہوا، اور وہی دراصل یہاں کی صالح وفعال جماعت ہے جس سے کچھ امید ہوتی ہے۔ سعید رمضان[۲۶] سے بھی ملاقات ہوئی۔ آپ کا تذکرہ رہا، لیکن وہ کچھ اجنبیت اور کچھ ہماری ہندوستانی نسبت کی وجہ سے (جو اکثر حجاب بن جاتی ہے) زیادہ کھلے

www.abulhasanalinadwi.org

نہیں، پھر بھی ہم ان کی صلاحیتوں اور شخصیت سے متاثر ہوئے۔ الاخوان میں چند اونچی شخصیتیں بھی ہیں، ان میں سے بعض سے ملنا ہوا اور بعض سے باقی ہے۔ یہاں کے اخوان پر استاذ البہی الخولی ۲۷ اور استاذ عبدالعزیز کامل کا ذہنی واخلاقی اثر زیادہ ہے۔ عبدالحکیم عابدین صاحب سے بھی ابھی ملنا نہیں ہوا۔ بعض بڑے ذہین اور محبوب صفات آدمیوں سے ملنا ہوا اور اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ شیخ حسن البنا مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی دل آویز اور ہمہ گیر شخصیت عطا فرمائی تھی اور ان کے مقناطیس نے بہت سے آہن پاروں کو کھینچ لیا تھا۔ اخوان صلاحیتوں اور اشخاص کا ایک اچھا ذخیرہ ہے، لیکن اس وقت وہ عالم تحیر میں ہیں ۲۸۔ غالباً شیخ بنا مرحوم کے بعد کوئی طاقت ور قائد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قیمتی ذخیرہ کو تلف اور ضائع ہونے سے بچائے۔ عالم عربی اور شرقِ اوسط کو اس اخلاقی ابتری اور روحی افلاس کی حالت میں اسی جماعت سے آس لگی ہوئی ہے۔

محبّ الدین الخطیب سے خوب ملنا ہوا، ملتے ہی آپ کا تذکرہ کیا اور پوچھتے رہے، پھر خود ہی کہا کہ ان کی کتاب ۲۹ ایسے مرحلہ پر ہے کہ اگر وہ اس کو مناسب طریقہ پر ختم کر دیں تو اس کی اشاعت ہو سکتی ہے، پھر ان مجبوریوں کا تذکرہ کیا جن میں اس کتاب کو چھوڑنا پڑا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر [آپ] اس کا خاتمہ لکھ دیں تو ایک کام کی چیز باہر نکل آئے گی۔ اگرچہ حالات بدل چکے ہیں اور کتاب ناقص رہے گی، مگر بجائے خود وہ ایک تاریخ ہوگی۔ محبّ الدین الخطیب سے مل کر طبیعت خوش ہوئی۔ مصر کی اس مادی دنیا میں وہ بہت غنیمت ہیں۔ اخوان کے ہمدرد ہیں۔ مادیت اور ضمیر فروشی سے بیزار، الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں، بڑا سفر کر کے جانا پڑا، جزیرہ الروضہ میں قیام ہے، رہبر نے جو ایک عالم ہیں، کہا کہ **الاستاذ محب الدین یسکن فی آخر الدنیا فمن یاتیہ** ؟ ہم نے کہا کہ **لایاتیہ الامحب**۔ یہاں کے ادباء کا ذکر آیا، سخت تنقید کی۔ کہنے لگے کہ وہ صرف ایکٹر ہیں۔ ایکٹر کا کمال یہ ہے کہ ہر طرح کا پارٹ انجام دے سکے، اگر بادشاہ کا پارٹ انجام دینا ہو تو پورا بادشاہ معلوم ہو اور اگر فقیر کا، تو اچھا خاصا فقیر نظر آئے۔ اسی طرح یہ ادباء اگر فلسفۂ قرآن پر لکھنا پڑے، تو قرآن کے رمز شناس نظر آئیں، اور اگر سیرت رسولؐ پر، تو

www.abulhasanalinadwi.org

مقامِ رسالت کے مرتبہ شناس، لیکن اسی روانی اور قابلیت کے ساتھ ایک دنیا دار بادشاہ یا لیڈر کی سوانح بھی لکھ دیں گے۔ پھر ایک بڑے ادیب کا ذکر کیا جن کے قلم سے بعض اسلامی موضوعات پر کتابیں نکل کر مقبول ہو چکی ہیں، کہ ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ اگر (معاذ اللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصر میں ''اسلامی نظام'' کی تنفیذ کے لیے تشریف لے آئیں تو سب سے پہلے میں مقابلہ کے لیے نکلوں گا۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

محمد علی الطاہر[30] بھی آپ کو بہت پوچھتے تھے۔ کہتے تھے کہ شرقِ اوسط کی سیاحت کے لیے نہیں آئے؟ آج کل ان کے یہاں اہل سیاست اور اہل وجاہت کا دربار لگا رہتا ہے۔ جب سے انہوں نے گزشتہ وزارت (سعدی) اور بالخصوص ابراہیم عبدالہادی باشا کے مظالم کے خلاف اپنی جیل کی داستان ''معتقل ھیکستیب''[31] لکھی ہے، اس وقت سے وہ مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے بہت کم لوگوں کو معاف کیا ہے۔ عبدالرحمٰن عزام پاشا، مفتی امین الحسینی سب کی خبر لے ڈالی ہے اور سب کے نامۂ اعمال چھاپ دیے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ اب رجالِ حدیث کے نقد و جرح کا دور تو ختم ہوا، یہ سیاست کا دور ہے، اس لیے آپ نے اسماء الرجال کی نئی کتاب لکھی ہے، اور اس میں پوری طرح رجالِ سیاست کی جرح و تنقید کا فرض انجام دیا ہے۔ اپنی کتاب ''ذکری الامیر شکیب ارسلان''[32] جو بڑی ضخیم کتاب ہے، نیز بعض اور تالیفات ہدیہ کیں۔

آپ کا خط آنے کے تیسرے روز احمد امین صاحب سے ۷ اربیع الثانی کو ملا، لکھا ہوا تو عرصہ کا ہو گا، لیکن ہم کو مصر آنے پر ملا۔ جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ اکثر صبح ناشتہ کر کے نکلنا ہوتا ہے اور عموماً دیر رات کو یا عشاء کے بعد واپسی ہوتی ہے، اس لیے خطوط کا سلسلہ یہاں ٹوٹ سا گیا۔

احمد امین صاحب نے اپنے ''مقدمہ'' سے بڑھ کر اکرام کیا۔ شاندار دعوت ''حدیقۃ الحیوانات'' کے ''جزیرۃ الشای'' میں کی جو مصر کے شوقینوں کی تفریح گاہ ہے۔ ''العقد الفرید'' کی سب جلدیں، جو ان کی تصحیح سے شائع ہوئی ہے، نیز ''حیاتی'' کا ایک نسخہ اور ایک قیمتی فاؤنٹن پن یادگار کے طور پر ہدیہ کیا جس سے یہ خط لکھا جا رہا ہے۔ صاحبِ اخلاق اور شریف آدمی ہیں، باقی جوش

www.abulhasanalinadwi.org

سے خالی اور زندگی کے آخری دور میں ہیں، اس لیے پرجوش ''مقدمہ'' لکھنے کی توقع فضول تھی۔

آج احمد حسن الزیات سے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ان شاء اللہ طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد اور دوسرے ادباء سے بھی ملنا ہے۔ جامعہ فواد، دار العلوم بھی دیکھنا ہے۔

''اسمعی یا مصر'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جو تحیہ، عتاب، نقد اور توجیہ سب کچھ ہے، ان شاء اللہ آپ کی نظر سے گزرے گا[۳۳]۔ ''ماذا خسر العالم'' امید ہے کہ آپ کو پہونچ گئی ہوگی۔ عبد اللہ العقیل عراقی[۳۴] سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ اخوان سے ملنے میں اکثر وہی واسطہ ہوئے، سلجھے ہوئے متین و ذہین نوجوان ہیں۔ انہیں سے معلوم ہوا تھا کہ آپ ''المؤتمر الاسلامی'' میں شرکت کے لیے کراچی گئے تھے۔ امید ہے کہ اب واپسی ہوگئی ہوگی، جواب کا انتظار رہے گا۔

عاصم صاحب ہماری طرف سے اور مولوی معین اللہ صاحب و مولوی عبد الرشید صاحب کی طرف سے سلام قبول فرمائیں۔

تازہ رقم: اس خط کے لکھنے کے بعد احمد حسن الزیات سے ملاقات ہوئی، آپ کو پوچھتے تھے۔ ابھی تک جو لوگ ادباء میں سے ملے ہیں، ان سب سے زیادہ خوش اخلاق اور کریم ثابت ہوئے، بہت ہی بشاشت سے ملے اور ہم چاروں ساتھیوں کو ایک ایک نسخہ ''تاریخ الادب العربی'' کا اور تین تین حصے ''وحی الرسالۃ''[۳۵] کے ہدیہ کیے۔

آپ کا

علی

— ۶ —

از قاہرہ — ۱۰ شعبان المعظم ۷۰ھ

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۷ رجب اس وقت سامنے ہے۔ تقریباً ایک مہینہ کے بعد جواب دینے

www.abulhasanalinadwi.org

کی توفیق ہورہی ہے۔ کچھ مشغولیت، نقل وحرکت کی کثرت اور زیادہ ترکسل مندی اس تاخیر کی ذمہ دار ہے اور ہر حال میں عفو کی امید ہے۔

تقریباً ایک مہینہ ہی ہوتا ہوگا کہ ''دارالفتح'' سے آپ کے سلسلہ مضامین (انتشار الاسلام فی الہند ۳۶) کے چھپے ہوئے اجزاء لے کر ہوائی ڈاک سے آپ کو بھیج چکا ہوں۔ خیال تھا کہ اس کے ساتھ ہی آپ کو خط لکھوں گا کہ یہاں تک آپ کی کتاب چھپی ہوئی موجود ہے۔ اگر آپ اس کو مکمل کر کے بھیج دیں تو خطیب صاحب تکمیل کے لیے تیار ہیں۔ اس کی رسید نہیں آئی، خدا کرے آپ کو وہ اوراق مل گئے ہوں۔ بھیجنے سے پہلے میں نے اس کو پڑھ لیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ابھی بہت بڑا حصہ باقی ہے، اس لیے کہ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے تمام اسلامی تحریکات اور اداروں پر تبصرہ کیا تھا اور اخیر دور تک پہونچ گئے تھے۔ معلوم نہیں آپ نے وہ مسودہ ۳۷ بھیجا نہیں یا یہاں گاؤ خورد ہو گیا، بہر حال ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے اور آپ سے زیادہ کسی کے لیے یہ موضوع آسان نہیں، اس لیے اس کو مکمل کر ہی دیجیے۔

ابھی شاید ایک ہفتہ ہوا، آپ کے نام تازہ رسالہ ''الدعوۃ الاسلامیہ وتطوراتھا فی الھند'' ۳۸ کے دو تین نسخے بحری ڈاک سے بھیجے گئے ہیں۔ یہ درحقیقت وہ مضمون ہے جو میں نے جمعیۃ الشبان المسلمین کے حفلہ تکریم ۳۹ میں پڑھا تھا۔ اس میں ہندوستان کی تجدید واحیائے دین کی مختلف کوششوں کا مختصر تعارف آ گیا ہے۔ ایک نسخہ سید صاحب ۴۰ مدظلہ اور ایک مولوی ناظم صاحب ۴۱ کے لیے بھی آپ ہی کی ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ چند رسائل علیحدہ سے مودودی صاحب کے نام بھیج دیے ہیں۔

آج ان شاء اللہ ایک نئی کتاب جو آپ کی دلچسپی کی ہوگی، ارسال خدمت کی جائے گی۔ یہ ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو یہاں کلیۃ دار العلوم اور کلیۃ الادب میں علامہ اقبال مرحوم اور ان کے پیغام کے متعلق کی گئیں ۴۲۔ ۸۶ صفحہ کی چھوٹی سی کتاب ہے، مگر بعض اہم اور مفید معلومات آ گئے

www.abulhasanalinadwi.org

ہیں، شاید یہ اقبال کا کچھ مؤثر تعارف ہو، اور اس ارادہ کی تکمیل جوان کے انتقال پر ہم نے اور آپ نے کی تھی [کیا تھا] لیکن آپ زیادہ اہم کاموں میں مشغول ہوگئے اور الحمدللہ اصل دین کی خدمت میں مشغول ہیں۔ زاد کم اللہ توفیقاو قوّاکم۔ ہمارے ذہن کے انتشار اور ذوق کے تنوع کا حال وہی ہے۔

مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

مفتی امین الحسینی صاحب سے خاصی طویل و مفصل ملاقاتیں رہیں، آپ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔ ان کو دارالعلوم کی زیارت یاد ہے[۴۳]۔ بڑے حاضر دماغ اور بیدار مغز اور وسیع الاخلاق آدمی ہیں۔ پرسوں محمد علی علوبہ باشا[۴۴] کو بھی انہوں نے لکھنؤ کا سفر اور دارالعلوم کی حاضری یاد دلائی اور ان کو یاد آئی۔ مفتی صاحب سے عالم عربی اور فلسطین کے سلسلہ کے بعض بڑے تلخ حقائق و واقعات معلوم ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شرق اوسط کا برا حال ہے، بظاہر اخوان کے سوا کوئی امید کی شعاع نظر نہیں آتی۔

سعید رمضان اس مرتبہ بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے خصوصی تعارف کرا دیا، پہلا سا حجاب نہیں تھا۔ آج کل تو وہ مغربِ اقصیٰ کی سیر کر رہے ہیں، واپسی پر ملاقات ہوگی۔

اس عرصہ میں اخوان کے ذمہ داروں سے بڑی ملاقاتیں اور ارتباط رہا، اور ان کا اور ان کی تحریک کا مطالعہ کرنے کا بڑا موقع ملا، انہوں نے بھی پورے اعتماد اور خلوص کا اظہار کیا اور تفصیلات سنائیں۔ شیخ حسن البنا کی عقیدت میں بڑا اضافہ ہوا ــــ حقیقتاً وہ ایک موہوب آدمی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس گرتے ہوئے عالم عربی کو تھامنے کے لیے تیار کیا تھا، اور بڑی جامعیت عطا فرمائی تھی۔ ہر شخص کو ان کی محبت میں سرشار پایا۔ غیر متعلق، بلکہ ناقد اشخاص کو بھی ان کی عبقریت و اخلاص کا معترف پایا۔ ڈاکٹر احمد امین اختلافِ ذوق کے باوجود بڑے مداح ہیں۔ ہر طبقہ کا حال یہی ہے، سوائے شدید سعدیوں[۴۵] کے۔ ہندوستان کی دینی جماعتوں کو ضرور ان کے حالات اور

www.abulhasanalinadwi.org

اس تحریک کا مطالعہ کرنا چاہیے، جیسا کہ اس حصہ کے دینی کام کرنے والوں کو ہندوستان کی دینی تحریکات کا مطالعہ ضروری ہے۔

آپ کی تقلید میں روزنامچہ لکھتا رہا ہوں، صرف اس ترمیم کے ساتھ کہ عربی میں، تاکہ مشق ہو اور شاید ان ملکوں میں کام آئے۔ ایک ضخیم کتاب تیار ہوگئی ہے، ہر طبقہ کے لوگوں سے ملنا ہوا اور بے لاگ تبصرہ آ گیا۔ ادباء مشہورین میں سے صرف عقاد[۴۶] اور طٰہٰ حسین سے ملنا نہیں ہوسکا۔ عقاد کی تقریر یوم اقبال میں سنی، انہوں نے گھر پر بلایا بھی، مگر طبیعت منشرح نہ ہوئی۔ طٰہٰ حسین[۴۷] بڑے آدمی ہیں، ان سے وقت لینا بڑا مشکل کام ہے۔

ہمارے مولانا ناظم کہاں اور کس حال میں ہیں، انہوں نے تو بالکل قطع تعلق ہی کردیا۔ ہمیں بھی ان کا پتہ یاد نہیں رہا، کبھی آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔ مولوی مظفر حسین صاحب کیا کررہے ہیں، ان کے لیے دل میں وہی جگہ ہے جو پہلے تھی، وہ تو شاید ہم سے مایوس ہوچکے ہوں، لیکن ہم ان سے مایوس نہیں۔ افسوس ہے کہ تقسیم نے جیتے جی جدا کردیا، کاش کہ آپ لوگوں سے حجاز ہی میں ملاقات ہوجائے۔ معلوم نہیں ''سیرت سید احمد شہید'' کے جو نسخے ''چراغ راہ'' کو بھیجے گئے تھے، وہ کچھ نکل رہے ہیں یا نہیں۔ خرید کی گنجائش ہے یا نہیں۔

امید ہے کہ اس خط کو سامنے رکھ کر جواب دیں گے، اور حتی الامکان مفصل اور جاندار جیسا کہ آپ کا معمول ہے۔ ہاں، آپ کی دلچسپی کے لیے روزنامچہ سے ایک عبارت نقل کردوں جو آپ کے خط ملنے پر ۷ اربیع الثانی (۲۵ جنوری) کو لکھی تھی:

> وقد نا ولنى الدكتور احمد امين رسائل لى جاء ت من الهند و باكستان على عنوانه وفيها رسالة رقيقة بليغة للاستاذ مسعود الندوى فى اسلوبه الادبى و اخلاصه الاخوى، ومن عادته اذا كتب الى أسل النفس على سجيتها، فتصبح رسالة تجمع بين الانشاء البليغ والحب الصادق العميق، واذاجمعت رسائلناتكونت سلسلة

www.abulhasanalinadwi.org

جدیدة من رسائل اخوان الصفاء من غیر فلسفة وبحث فی حقائق الاشیاء --- الخ[48]

کیا اس تأثر کے اعادہ کا آپ پھر موقع دیں گے، آپ کے ایسے ہی خط کا انتظار رہے گا، اپنے رفیق عزیز عاصم میاں کو سلام اور ہمارے رفیقوں کی طرف سے سلام قبول ہو۔ والسلام

آپ کا

علی

حواشی

۱- مولانا مسعود عالم ندوی نے ۱۹۴۹ء میں عراق کا سفر کیا تھا، جس کا روزنامچہ ''دیار عرب میں چند ماہ'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اسی سفر کے دوران میں اُنہیں یہ خط موصول ہوا تھا۔ (مرتب)

۲- غالباً الہ آباد کے کسی دوست کے ملفوف خط میں مکتوب الیہ کے نام کا خط بھی بھیجا گیا تھا۔ اس وقت اچھی طرح یاد نہیں۔ بہرحال یہ مکتوب جس عریضہ کے جواب میں ہے، وہ بغداد سے لکھا گیا تھا۔

۳- مکتوب الیہ اور کاتب دونوں کے استاذ ڈاکٹر شیخ محمد تقی الدین ہلالی مراکشی---، استاذ محترم نے علی میاں کے خط نہ لکھنے کی شکایت کی تھی۔

۴- عربی کی ایک کہاوت ہے، مطلب یہ ہے کہ ''تم سے یہی توقع تھی۔''

۵- یہ بھی عربی محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حسن سلوک خلاف توقع نہیں۔

۶- حجاز کے مشہور عالم، ہندوستان بارہا آچکے ہیں، ہلالی صاحب سے رشتہ مُصاہرت ہے۔

۷- ''سیرت سید احمد شہید''، جس کے تیسرے ایڈیشن کی پہلی جلد ان دنوں تازہ تازہ چھپی تھی۔

۸- سید مظفر حسین شاہ ندوی کشمیری [سابق] ناظم دینیات، حکومت آزاد کشمیر

۹- شرف الدین واولادہ- تاجران کتب عربیہ بمبئی، ان کے ہاں ہلالی صاحب کی کتابیں امانت تھیں۔

۱۰- مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی [م ۲۴ اگست ۱۹۷۹ء]

۱۱- [مکتوب نگار مولانا سید علی میاں کے برادر بزرگ] جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء

۱۲- غالباً مولانا محمد منظور نعمانی (م ۱۹۹۷ء)، مدیر ماہنامہ ''الفرقان'' (لکھنؤ) مراد ہیں۔ (مرتب)

www.abulhasanalinadwi.org

۱۳- (م۱۹۸۹ء) مولانا مسعود عالم ندوی کے شاگرد اور دیارِ عرب کے سفر میں رفیق (مرتب)

۱۴- مکتوب نگار کا وطن مالوف

۱۵- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (م۱۹۷۹ء) مراد ہیں۔ (مرتب)

۱۶- یہ اصل میں حیدر آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ غالباً ان کے والد ماجد ہی نے حجاز کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے اچھے ادیبوں میں ان کا شمار ہے۔ اردو اور انگریزی سے اچھی طرح واقف ہیں۔

۱۷- ایک روشناس نجدی ادیب،---

۱۸- مکتوب نگار کی عربی تصنیف [جس کا اردو ترجمہ "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" متداول ہے]۔

۱۹- [م۱۹۸۲ء]، خواہر زادہ مکتوب نگار۔ [محمد ثانی ندوی کے بارے میں مولانا علی میاں نے لکھا ہے: "مکتبی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ ۱۹۳۴ء میں میرے ساتھ جب اُن کی عمر نو سال تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء میں اسی کمرہ میں اپنے بڑے بھائی سید محمود حسن مرحوم کے ساتھ رہنے لگے جس میں میرا اور مولانا مسعود عالم ندوی کا قیام تھا، اور اِس طرح وہ معنیً عربی رسالہ "ایضاء" کا دفتر اور عربی زبان و ادب کا ذوق رکھنے والے اساتذہ اور ہونہار طلبہ کا مرکز بن گیا [تھا]، جہاں ہر وقت علمی و ادبی گفتگو ہوتی تھی، کتابوں اور شخصیتوں پر تبصرے اور عالم اسلام کے حالات پر اظہارِ خیال اور اظہارِ تاثر ہوتا تھا۔ مولانا مسعود عالم صاحب مرحوم اُن کی سنجیدگی اور شائستگی اور میرے اور برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کے تعلق کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں کا بہت پاس و لحاظ رکھتے تھے۔" پرانے چراغ، کراچی: مجلس نشریات اسلام، س۔ن، حصہ سوم، صفحات ۲۷۷-۲۷۸]

۲۰- احمد امین [م۱۹۵۴ء] مصر جدید کے مشہور مصنف ہیں، لیکن ان کے ذہن و دماغ میں کجی شروع سے موجود ہے اور بڑھاپے میں بھی باقی ہے۔ مکتوب نگار سے راقم کو ان کے باب میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ اس کتاب کے مقدمہ میں وہ کھل گئے، لیکن مصر کی جدید دینی بیداری کی وجہ سے ان کی یہ "زیادتی" پسند نہیں کی گئی اور مصنف کی طرف سے کئی روشناس ادیبوں نے احمد امین کی خبر لی۔

۲۱- زیرِ نظر مجموعے میں استاذ شکری فیصل کے تبصرے کا ترجمہ شامل ہے۔ (مرتب)

۲۲- شقیق- عربی میں سگے بھائی کو کہتے ہیں۔

۲۳- شیخ خضر حسین تونسی، [جو بعد میں شیخ الازہر ہوئے]۔

www.abulhasanalinadwi.org

۲۴- مصر کے پرانے اور بوڑھے مصنف اور اہل قلم [اُن کی معروف کتاب ''المرأۃ المسلمہ'' کا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''مسلمان عورت'' کے نام سے کیا تھا]۔

۲۵- محمد الغزالی کی ان کتابوں پر مکتوب الیہ کے قلم سے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' بابت ذوالقعدہ و ذوالحجہ ۱۳۷۰ھ میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔(مرتب)

۲۶- (م۱۹۹۶ء)، شیخ حسن البنا (م۱۹۴۹ء) کے داماد، کچھ عرصہ کراچی میں بھی مقیم رہے۔(مرتب)

۲۷- استاذ البہی الخولی کی کتاب ''تذکرۃ الدعاۃ'' پر مولانا مسعود عالم کے قلم سے ''ترجمان القرآن'' بابت رمضان و شوال ۱۳۷۱ھ میں تبصرہ شائع ہوا ہے۔(مرتب)

۲۸- یہ اخوان کے مرشد عام اور ہوش مند قائد حسن اسماعیل الہضیبی [م ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ء] کے انتخاب سے پہلے کا ذکر ہے۔

۲۹- محب الدین الخطیب [م۱۹۶۹ء]، مشہور عالم، مفکر اور صاحب قلم ہیں۔کوئی بیس برس مشہور ہفتہ وار اخبار ''الفتح'' نکالتے رہے اور اس کے حلقے میں نوجوانوں کی بڑی تعداد تربیت پا کر نکلی۔ مصطفیٰ حسنی السباعی (دمشق)، عمر بہاء الامیری (حلب)، عبدالقہار مدکر (انڈونیسیا)، محمد یکین (چین)، محمد الغنجی مرحوم (مصر) نے ''الفتح'' ہی کے صفحات میں قلم پکڑنا سیکھا۔خود حسن البنا مرحوم بھی ''الفتح'' اور اس کے ایڈیٹر کے خوشہ چیں رہے ہیں۔یہ حقیر بھی ''الفتح'' ہی کی حوصلہ افزائی کی بدولت ٹوٹی پھوٹی عربی لکھنے لگا اور مسلسل اس میں لکھتا رہا۔انہیں دنوں میں عاجز نے ایڈیٹر ''الفتح'' کی فرمائش پر اسلامی ہند کی تاریخ (حاضر مسلمی الہند و غابرھم) کے نام سے لکھی تھی جس کی طباعت مکمل نہ ہوسکی، اور اس باب میں عاجز کو الخطیب سے دوستانہ شکایت بھی تھی، اور الحمدللہ کہ وہ شکایت اب دور ہو رہی ہے، اور یہ طے پا گیا ہے کہ مناسب اضافہ اور تکمیل کے بعد کتاب شائع کر دی جائے۔---

۳۰- محمد علی الطاہر اور ان کی بعض کتابوں کا سیر حاصل تذکرہ ''ترجمان القرآن'' میں آ چکا ہے (رمضان و شوال ۱۳۷۱ھ)۔راقم سے ان کے غائبانہ مراسم تھے۔امیر شکیب ارسلان مرحوم کی محبت و عقیدت نے ہم دونوں کو قریب کر دیا تھا۔

۳۱-۳۲- ملاحظہ ہو: [ماہنامہ] ''ترجمان القرآن''، بابت رمضان و شوال ۱۳۷۱ھ

۳۳- ''اسمعی یا مصر'' اور مولانا علی میاں کے چار دوسرے رسائل پر مکتوب الیہ کے تبصرے کے لیے دیکھیے: ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' (لاہور) بابت محرم ۱۳۷۱ھ (مرتب)

www.abulhasanalinadwi.org

۳۴- ہمارے بصری نوجوان، جن کے ذکر سے ''دیارِ عرب میں'' کے صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

۳۵- وحی الرسالۃ، الزیات [م ۱۹۶۸ء] کے ان مقالات وتأثرات کا مجموعہ ہے جو وہ ہفتہ وار ''الرسالۃ'' کے افتتاحیہ کے طور پر لکھتے ہیں۔ اس وقت مصر کے سب سے بڑے انشاپرداز ہیں اور اسلام کی طرف مائل۔

۳۶- یہ اسی کتاب (حاضر المسلمین الہند وغابرھم) کے ابتدائی ابواب کا ذکر ہے۔

۳۷- مسودہ بھیجا تھا، غالباً وہاں ''گاؤ خورد'' ہوگیا۔ حسن اتفاق سے نقل محفوظ تھی، جسے دوبارہ بھیجا جارہا ہے۔

۳۸- دیکھیے: حاشیہ ۳۳ (مرتب)

۳۹- الشبان المسلمون والوں نے مکتوب نگار کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا تھا۔

۴۰- [م ۱۹۵۳ء، مکتوب نگار اور مکتوب الیہ دونوں کے] استاذ محترم جناب مولانا سید سلیمان ندوی [مرحوم]

۴۱- [م ۲۰۰۰ء]، مولانا محمد ناظم ندوی، [سابق] شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ - بہاولپور

۴۲- رسالہ ''شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال'' مراد ہے۔ مکتوب الیہ کے تبصرے کے لیے دیکھیے: حاشیہ ۳۳ (مرتب)

۴۳- [م ۱۹۷۴ء]، مفتی صاحب ۱۹۳۳ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے تو لکھنؤ (ندوہ) میں ہم غریبوں نے ان کا خیر مقدم کیا تھا اور خوب ملاقاتیں رہی تھیں۔ یہ ان کی شرافت ہے کہ اسے بھولے نہیں۔ مکہ مکرمہ میں حقیر کا نام سنتے ہی یاد کیا۔ شرافت اور حسن اخلاق کا پیکر، ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔۔۔

۴۴- محمد علی علوبہ بھی اُس سفر میں مفتی صاحب کے ہم رکاب تھے۔

۴۵- ابراہیم عبد الہادی اور محمود فہمی نقراشی مرحوم کی پارٹی کے لوگ، جنہوں نے اس مرد مجاہد کو قتل کرا کر اپنا نامۂ اعمال سیاہ کیا اور جن کی حکومت نے اخوان پر ظلم کے پہاڑ ڈھا کر دنیا اور آخرت کی رسوائی مول لی۔

۴۶- مصر کا سب سے بڑا ایکٹر ادیب ــــ علی میاں اس سے ملنا چاہتے تھے۔ یہ گنہگار تو اس طوائف صفت ادیب کی شکل دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔ عقاد کی بخیہ دری کے لیے مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

۴۷- طٰہٰ حسین جیسے زندیق سے بھی ملنے کا اشتیاق حیرت انگیز ہے۔ ان دنوں وہ وزارتِ تعلیم پر فائز تھے، اس لیے شاید ملنا دشوار ہو۔

۴۸- [اس عربی اقتباس کا ترجمہ مولانا مسعود عالم ندوی نے حواشی لکھتے ہوئے خود کیا تھا]۔ ڈاکٹر احمد امین نے کچھ خطوط مجھے دیے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان سے ان کے پتے پر میرے نام آئے ہیں، ان میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی صاحب کا ایک نفیس وبلیغ خط ہے جو انہوں نے اپنے مخصوص ادبی اسلوب اور برادرانہ اخلاص کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ جب بھی کوئی خط لکھتے ہیں تو ہر طرح کے تکلفات اٹھا رکھتے ہیں اور

www.abulhasanalinadwi.org

عنان قلم چھوڑ دیتے ہیں، چنانچہ ان کا خط ایک طرف فصیح و بلیغ انشاء اور دوسری طرف خالص اور گہری محبت کا مرقع بن جاتا ہے۔ اگر ہمارے خطوط اکٹھے کیے جائیں تو رسائل اخوان الصفاء کا ایک نیا سلسلہ بن جائے گا جس میں صرف فلسفہ اور حقائق اشیا کی بحثیں نہیں ہوں گی۔

سید رئیس احمد جعفری

—— ۷ ——

لکھنؤ، ۵ فروری ۱۹۵۴ء

برادر مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میرے دوران سفر میں آپ کی طرف سے دو خط آئے، کل ۲۸ جنوری کو واپس ہوا تو دونوں ملے، آپ کو جواب کا انتظار ہوگا، چوں کہ ایک جگہ قیام نہ تھا، اس لیے ڈاک بھیجی نہ جا سکی۔

''ریاض'' کا سلیمان نمبر نکالنا ضروری تھا، اور بالکل برمحل۔ آپ کی یہ دعوت بھی بجا ہے کہ یہ ناچیز بھی اس بزم میں شریک ہو، لیکن فروری کے وسط تک بے حد مشغول ہوں، ۹ فروری تک لکھنؤ سے باہر رہوں گا، پھر بھی شاید جلد کچھ لکھنے کے قابل نہ ہوسکوں، اس لیے مضمون پیش کرنے سے تو بالکل قاصر ہوں، البتہ سید صاحب کے خطوط جو اس ناچیز کے نام ہیں۲، آپ کی طلبی پر بھیجے جا سکتے ہیں۔ جلسہ۳ کی روداد البتہ بھیج دی جائے گی، میں نے مولوی عبد اللہ صاحب ندوی کو تاکید کی ہے کہ وہ مفصل لکھ کر آپ کو بھیج دیں۔ امید ہے کہ آپ کو پہنچ جائے گی۔

''ریاض'' کی سیر کبھی کبھی ہو جاتی ہے، اللہ اس کو سدا بہار رکھے۔ آپ کی یاد آوری سے مسرت و عزت حاصل ہوئی۔

آپ کا

علی

www.abulhasanalinadwi.org

حواشی

۱- مکتوب نگار نے اس نام سے کراچی سے ایک دینی وعلمی ماہنامہ جاری کیا تھا، سید سلیمان ندوی کی رحلت پر اُن کی یاد میں اِس کا خصوصی نمبر مارچ ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ مولانا علی میاں اِس نمبر کے لیے تو کچھ نہ لکھ سکے، البتہ ایک دوسرے موقع پر اپنے استاد کو اُنھوں نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ دیکھیے: پرانے چراغ، لکھنؤ: مکتبہ فردوس، ۱۹۷۵ء، صفحات ۱۹-۶۲

۲- مولانا علی میاں نے سید صاحب کے بارے میں اپنے مضمون (دیکھیے: حاشیہ ۱) میں ان کے چند خطوط شامل کیے ہیں، تاہم پورا ذخیرہ غالباً تا حال شائع نہیں ہو سکا۔

۳- سید صاحب مرحوم کی یاد میں دار العلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اسی کی جانب اشارہ ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی

—— ۸ ——

کلیۃ الشریعہ، الجامعۃ السوریہ
(دمشق)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محبّ مخدوم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا، شرمندگی ہے کہ ابھی تک آپ کی خدمت میں کوئی عریضہ نہ لکھ سکا۔ ماہ مبارک کی آمد نے اور زیادہ مشغول کر دیا، یوں تو آپ کو خیریت اور مختصر حالات معلوم ہو گئے ہوں گے، مگر ضروری تھا کہ خود بھی آپ کو مطلع کروں، مگر ابھی تک اس کی نوبت نہ آئی۔

دمشق اترتے ہی شیخ مصطفےٰ السباعی ۱ نے ایک ہوٹل میں ٹھہرا دیا تھا۔ ہوٹل دینی حیثیت سے اور ہمارے قیام کے لیے برا نہ تھا، بلکہ منتخب ہوٹل تھا، لوگوں کو ملنے کی بڑی سہولت تھی، لیکن خواہش

www.abulhasanalinadwi.org

یہ تھی کہ مسجد بالکل قریب ہو، اور بے تکلف جگہ ہو، اللہ تعالیٰ نے بڑی اچھی جگہ دلا دی جو بالکل اپنے مرکز ۲ کی طرح ہے، یعنی مسجد سے متصل ایک صاف ستھرا آراستہ مکان، صاحب مکان جو مسجد کے امام بھی ہیں (علی نمیر فیاس)، ایک صوفی شخص ہیں، اور ہمارے سابق میزبان۔ ضرورت کی تمام چیزیں مہیا، شہر کے مرکز میں، ہوٹل کا سارا کرایہ اور مصارف باصرار سعید رمضان نے ادا کیے۔ اب یہ طے ہے کہ سنیچر، منگل، جمعرات کو افطار اور کھانا انھیں کے ساتھ ہوگا، اصرار تو پورے رمضان کے لیے تھا اور اپنے ساتھ قیام کے لیے، مگر آخر میں اس پر سمجھوتا ہوا، بہت ہی مخلصانہ طریقہ پر پیش آتے ہیں، ہر مرتبہ شہر کے ممتاز علماء و شخصیات کو مدعو کرتے رہتے ہیں تا کہ ملاقات و اجتماع ہوتا رہے۔

نظام الاوقات اس طرح ہے کہ ہر چہار شنبہ کو یونیورسٹی ہال میں اس موضوع پر سلسلہ وار تقریر ہوتی ہے جس کے لیے یہاں آنا ہوا ہے۔ ہر ہفتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے چھپے ہوئے کارڈ کے ذریعہ اہل علم کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ علمی ذوق کا یہ حال ہے کہ یونیورسٹی کے ممتاز اساتذہ و پروفیسر، مختلف کالجوں اور شعبوں کے طلبہ، پارلیمنٹ کے ممبر اور بعض وزراء تک شریک ہوتے ہیں۔ پچھلی دو تقریروں میں وزیر تعلیم بھی تھے، اور ایک میں چیف جسٹس بھی۔ طالبات گیلری پر ہوتی ہیں، اول سے آخر تک بڑے سکون کے ساتھ مضمون سنا جاتا ہے جو تقریباً ایک گھنٹہ لیتا ہے۔ اس اثنا میں شاید ایک شخص بھی اٹھ کر نہیں جاتا۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ رمضان المبارک کے آغاز کے بعد سے محاضرات کا وقت نماز عشاء اور تراویح کے بعد ہو گیا ہے، اس کے باوجود حاضرین کی خاصی تعداد ہوتی ہے، اور ممتاز اصحاب شریک ہوتے ہیں، اخوان تو ان چیزوں میں پیش پیش رہتے ہی ہیں، ان کے علاوہ اور عناصر بھی، بعض مسیحی بھی، کل حضرت حسن بصری پر محاضرہ تھا، اور الحمدللہ موثر، اس سے پہلے سیدنا عمر بن عبدالعزیز پر۔

دوسرا جزیہ ہے کہ ہر منگل کو مرکز الاخوان میں ایک تقریر طے پائی ہے جس میں ہمیں اپنے دینی خیالات پیش کرنے کا موقع ملتا ہے، اس کے علاوہ دوشنبہ کو اخوان کی مختلف شاخوں کے ذمہ

www.abulhasanalinadwi.org

داروں سے بات کرنے اوران کومشورہ دینے کے لیے مستقل پروگرام ہے، ملاقاتیں اورآمدورفت اس کے علاوہ ہے، صبح سے ظہر تک عموماً محاضرات کی تیاری میں وقت صرف ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں صرف چھ محاضرات تیار ہوئے تھے، کم سے کم چار محاضرات یہاں تیار کرنے ہیں۔

عربوں کی فراخ دلی، حسنِ اعتراف، حوصلہ مندی، علوِ اخلاق تعریف وتحسین سے مستغنی ہیں۔ اخوان کی مستعدی، نشاط دینی، محبت، گرم جوشی اور عصبیت اسلامیہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، مگر یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوا کہ مغربی تہذیب من حیث القوم تسلیم کرلی گئی ہے۔ ۹۵ فی صدی ٹوپیاں اتر گئیں، داڑھی شاید ایک فی صدی ہو، علماء نے بالخصوص ہتھیار ڈال دیے، مغربی لباس عورتوں میں (شہروں میں) ۹۹ فی صدی، مردوں میں شاید ۹۸ فیصدی، البتہ اس سب کے ساتھ نماز روزے کا تناسب بھی ۹۸ فی صدی معلوم ہوتا ہے اور ہندوستان سے بہرحال بہت بڑھا ہوا ہے۔

رمضان مبارک کے بعد شمالی شام، حمص، حماۃ، حلب کے سفر کا قصد ہے، ان شاء اللہ امید ہے کہ حلب ہماری تبلیغی تحریک کا ایک مرکز بن جائے گا، اوراجتماعات وتبلیغی سفروں کی داغ بیل پڑ جائے گی، دعا فرمایے، قبول کرنے کی بڑی صلاحیت ہے، البتہ طویل قیام شرط ہے، بعض دوست کہتے تھے کہ دوسال ٹھہر جایے۔

اسی مغربی ماحول و معاشرت میں بعض ایسے لوگوں سے بھی ملاقات ہوئی جن کے متعلق وجدان کہتا ہے کہ اہل اللہ اور عارفین میں سے ہیں۔ یہ تو پہلے بھی پڑھا تھا کہ شام اس صنف کا خاص مرکز ہے، اب کچھ اندازہ بھی ہوا۔

اہل مرکز، اہل جماعت کی خدمت میں عمومی وخصوصی سلام، خاص طور پر ان دوستوں کی خدمت میں جن کی محبت کا خاص حق ہے، اور جن کے احسانات ہیں، فہرست طویل ہو جائے گی، ورنہ نام بنام لکھتا،

بآں گروہ کہ از بادۂ وفا مستند
ز ما سلام رسانید ہر کجا ہستند[3]

www.abulhasanalinadwi.org

دعا کی درخواست ہے، لیالی رمضان میں نہ فراموش فرمایا جائے گا، آپ کے گرامی نامہ، ہدایات اور مشوروں کا انتظار رہے گا۔

آپ کا

علی

۱۰ ارمضان المبارک [۱۳۷۵ھ]، جمعہ

—— ۹ ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پھر پرسشِ جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اس وقت آپ کو اسی طرح خطاب کرنے کو جی چاہا، اس سے زائد تکلف معلوم ہوا، کل مغرب ہوتے ہوئے مولوی رضوان صاحب نے آپ کا خط لا کر دیا، ایک عزیز خط اور بھی تھا، ہمارے بھائی احمد الحسنی کا کراچی سے، دونوں خط پڑھ کر بیکار ہوگیا، آپ نے کچھ ایسی کیفیت میں خط لکھا ہے کہ اس سے وہ کیفیت طاری ہوئی، جو آپ پر کبھی کبھی کسی تقریر کے سننے سے طاری ہوتی ہے، اور جس کے بعد آپ تقریر کرنے کے لائق نہیں رہتے۔ آپ کا خط پڑھنے کے بعد میں خط لکھنے کے لائق نہ رہا، آج صبح لکھنے کے لیے بیٹھا ہوں۔

آپ نے رمضان سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکنے کا قلق ظاہر کیا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ جس الجھن میں آپ گرفتار ہو گئے تھے اور جس نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا، اس نے ضرور قلب میں شکستگی پیدا کی ہوگی، اور احساسِ تقصیر، اور آپ جانتے ہیں کہ میرا ذوق و مشرب یہ ہے کہ یہ دل کی شکستگی، اور احساسِ تہی دستی و بے مائگی ہزار نفلوں سے (جو پندار و زعم پیدا کریں) افضل ہے، اور قرب وقبولیت میں عجب تاثیر رکھتا ہے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جائے کہ زاہداں بہزار اربعیں رسند
مستِ مے الست بیک آہ می رسد

میرے ماہِ مبارک کا بھی بڑا حصہ محاضرات کی تیاری اور ملاقاتوں کی نذر رہوا۔ درمیان میں ایک ہفتہ علیل بھی رہا، اور پانچ روزے بھی چھوڑنے پڑے، اس کا تصور برابر رہا کہ ہندوستان میں کچھ شفیق بزرگ اور سرپرست اور کچھ مخلص دوست ضرور دعا میں یاد رکھیں گے، آپ کے خط سے اس کی تصدیق ہوئی، اور یہاں اللہ تعالیٰ نے جو معاملہ فرمایا ہے، اس میں اس کے آثار نظر آئے۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مرکز کی آبادی و رونق سے بڑی ہی مسرت ہوئی، جن صاحبوں نے اللہ کے ان مہمانوں کی خدمت کی، اللہ تعالیٰ ان کو بہت بہت جزاء عطا فرمائے، آپ نے ایک عزیز [کے] حوالہ سے ماہِ مبارک اور عید کے حالات لکھنے کی فرمائش کی ہے، بعض عزیزوں اور دوستوں کے خطوط میں بعض پہلوؤں کا تذکرہ کر چکا ہوں، مگر اب خصوصیت سے اور ذرا تفصیل سے لکھتا ہوں۔

رمضانِ مبارک کا نقشہ یہ تھا کہ اذانِ مغرب سے شاید ایک گھنٹہ پہلے شام کا ریڈیو اسٹیشن قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دیتا، لوگ عموماً اپنے اپنے مکانوں میں ریڈیو کھول کر بیٹھ جاتے، عین غروب کے وقت توپ چلتی اور اذان نشر ہوتی، لوگ تقریباً ۹۹ فی صدی گھروں پر روزہ افطار کرنے کے عادی ہیں، ہمارے یہاں جس چیز کا نام افطاری ہے، یہاں غیر معروف ہے۔ جو لوگ مسجد میں ہوتے، وہ پانی یا کھجور سے افطار کرتے یا بغیر افطار کے نماز میں کھڑے ہو جاتے، اس لیے کہ موسم کی وجہ سے افطار کا کوئی تقاضا نہ ہوتا، جو لوگ گھروں میں ہوتے، وہ اطمینان سے کھانا کھاتے، پھر آخر وقت میں اطمینان سے نماز پڑھتے۔ اذان سارے شہر میں ہر وقت کی ایک وقت ہوتی ہے، جامع اموی کے میناروں سے اذان ہوئی کہ ساری مسجدوں میں اذان ہو گئی، اگر کوئی تیار

www.abulhasanalinadwi.org

نہ ہوتو جماعت فوت ہوجائے گی، اور اگر ایک مسجد میں نماز نہ ملے تو پھر کہیں نہ ملے گی۔ عشاء کی اذان عشاء کا وقت ہوتے ہی ہوئی اور فوراً جماعت کھڑی ہوگئی، فرض وسنت کے بعد تراویح ہوئی، مگر افسوس ہے کہ ایک ایک آیت کی ایک ایک رکعت، یا الم ترکیف سے۔ معلوم ہوا کہ جامع اموی میں ایک ختم ہوتا ہے، شاید شہر میں ایک یا دو جگہ اور۔

رات کو طلوع فجر سے تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے توپ چلتی ہے اور کچھ نعتیں اور مناجاتیں وغیرہ نشر ہوتی رہتی ہیں۔ صبح صادق سے ۱۵-۲۰ منٹ پہلے اذان ہوتی ہے جس کو یہاں ''اذان امساک'' کہتے ہیں، یعنی سحری ختم کرنے کی اذان۔ اذان ہوتے ہی قرآن مجید کی تلاوت شروع ہوجاتی ہے، طلوع ہوتے ہی صبح کی اذان ہوتی ہے۔ ستائیسویں شب کو طلوع صبح صادق سے تقریباً آدھ گھنٹے چالیس منٹ پہلے کسی صاحب نے جو مخلص اور دردمند معلوم ہوتے تھے، ریڈیو پر دعا کی، مؤثر دعا تھی اور معلوم ہوتا تھا کوئی تبلیغی جماعت کے عرب بزرگ ہیں۔

اپنا نظام یہ رہا کہ عموماً روزانہ کسی نہ کسی دوست کے یہاں افطار اور کھانا ہوتا تھا، ہفتہ کے تین روز تو سعید رمضان نے بک کرا لیے تھے اور انہیں کے یہاں کھانا ہوتا تھا، عشاء کی نماز پڑھ کر ہم اپنی قیام گاہ پر اپنی علیحدہ تراویح پڑھتے تھے۔ امام ہمارے حجازی دوست حافظ سید محمود صاحب ہوتے تھے، جو حجاز کے پڑھنے والوں میں بھی ممتاز ہیں، نہایت سادہ اور رواں پڑھنے والے، شروع میں پارہ یا سوا پارہ پڑھتے تھے، درمیان میں ناغہ ہوجانے کی وجہ سے دو دو ڈھائی ڈھائی پڑھے، اور الحمد للہ گرانی نہیں معلوم ہوئی۔ ۲۸ کو ختم ہوا، ہم نے ان کی غیر موجودگی میں مولوی رضوان صاحب سے کہا کہ مٹھائی نہیں ہوگی؟ انہوں نے کہا، اچھا ہے اس بدعت کا خاتمہ ہو۔ تراویح سے فراغت ہوئی تو پرتکلف مٹھائی موجود، استفسار پر معلوم ہوا کہ حافظ صاحب نے درمیان میں چند منٹ کے لیے باہر جا کر مٹھائی والے کو ٹیلیفون کیا، اور مٹھائی اور پھل حاضر ہوگئے (یہاں گوشت والے کے یہاں بھی ٹیلیفون ہے اور ہوٹلوں میں بھی، صرف ٹیلیفون کرنے کی دیر ہوتی ہے، ضرورت کی چیز گھر پر حاضر ہوجاتی ہے)۔

www.abulhasanalinadwi.org

رمضان مبارک ختم ہوا، اب عید کی روداد سنیے:

معلوم ہوا کہ عید کی نماز طلوعِ آفتاب سے آدھ گھنٹہ بعد ہو جاتی ہے، ہم لوگوں نے فیصلہ کیا تھا کہ جامع اموی ہی میں نماز پڑھی جائے۔ ایسا موقع بار بار کہاں آتا ہے، میں گھر سے ذرا تاخیر سے چلا، اندیشہ ہوا کہ کہیں نماز نہ جاتی رہے، باہر نکلا تو جامع اموی جانے والی سڑک پر دورویہ فوج اور پولیس کا پہرہ دیکھا، بات سمجھ میں آ گئی، صدر جمہوریہ جامع بنی امیہ میں نماز پڑھانے والے ہیں، اتنے میں جلوس آ گیا، میں نے تیز قدم بڑھائے، وہ موٹر پر، میں پیدل، نماز کے فوت ہونے کا اور اندیشہ ہوا، سوقِ حمیدیہ پہنچا تو دیکھا کہ صدر موٹر سے اتر آئے ہیں اور پیدل چل رہے ہیں، فاصلہ اتنا ہوگا جتنا ہمارے مرکز سے چیف کورٹ یا چھتر منزل، ان کو پیدل دیکھ کر فوجیوں اور شہریوں نے جوشِ مسرت و محبت میں سلام کرنا شروع کیا، وہ سر جھکائے سلام کا جواب دیتے ہوئے چلتے رہے، مسجد میں داخل ہوئے تو مفتی جمہوریہ سوریہ جو مشہور عالم شام علامہ ابن عابدین کے خاندان کے ہیں، آگے آگے تھے۔ جامع اموی عالم اسلام کی شاید تیسرے درجے کی شاندار مسجد ہو، اس وقت اس کا شکوہ و وقار دوبالا تھا۔ لاوڈ اسپیکر سے یا شاید ریڈیو سے برابر یہ الفاظ نشر ہو رہے تھے، **الحمد لله وحده، نصر عبده، وانجز وعده، وهزم الاحزاب وحده، لاشي قبله ولاشي بعده**۔ اس مسلسل ترنم اور بیچ بیچ میں تکبیراتِ تشریق سے عجب لطف آ رہا تھا، نماز خلافِ توقع حنفی قاعدے سے ہوئی (یہاں ۹۰ فی صد لوگ شافعی ہیں، مگر احکام حنفی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں)۔ خطیب صاحب نے جو "کلیۃ الشریعہ" کے ایک طالب علم ہیں اور خاندانی خطیب (ہمارے یہاں کی عیدگاہ کی طرح) ایک موزوں خطبہ دیا جس میں فلسطین اور الجزائر کا (جو آج کل یہاں کا بڑا اہم موضوع بنا ہوا ہے) مناسب انداز میں تذکرہ کیا اور خطبہ میں "یافخامۃ الرئیس الجلیل" کہہ کہہ کے ان کو اپنی ذمہ داریاں یاد دلائیں "**وکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ**" کا مضمون بیان کیا، خطبہ کا نقص یہ تھا کہ کافی طویل تھا، مگر صدر جمہوریہ اپنے اسٹاف کے ساتھ بیٹھے رہے اور خطیب صاحب کو خلعت دی جو انہوں نے منبر ہی پر اپنے جسم پر ڈال لی۔

www.abulhasanalinadwi.org

نماز کے بعد یہاں معانقہ کو کوئی نہیں جانتا (اور اچھا ہے کہ نہ جانیں)، اس سے اس حقیقت کی تصدیق ہوئی کہ بدعات عموماً لوکل (مقامی) ہوتی ہیں اور سنتیں عالمگیر۔ بھلا یہاں رجب کے کونڈے، شب برات کا حلوہ اور گیارہویں کی مٹھائی کہاں مل سکتی ہے، مگر الحمدللہ تمام سنن عبادات موجود ہیں، مگر ہماری عید معانقہ سے کہاں خالی جا سکتی تھی؟ کہیں سے کچھ پاکستانی پنجابی بھائی نمودار ہو گئے، اور انہوں نے یہ خانہ بھر دیا۔ آپ ہوتے تو صاف انکار کر دیتے، مگر ہم نہ کر سکے۔

رگوں میں ہاشمی خون ہے، مگر اس روز بنی امیہ بہت یاد آئے۔ آخر جن کی مسجد میں نماز پڑھی اور اسلام کی عبادت و اخوت کا مظاہرہ دیکھا، وہ کیسے یاد نہ آئیں۔ اللہ معاف کرے، اپنے دوسرے محاضرہ میں جو سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی سیرت و کارنامہ پر تھا، بنی امیہ اور ان کے نظام حکومت و نتائج پر سخت تنقید کر چکے تھے، مگر وہ علم و تاریخ کا منبر تھا، یہ مسجد کی محراب، جہاں سے "ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولاتجعل فی قلوبنا غلاً للذین امنوا ربنا انک رؤف رحیم" کی مسلسل صدا آرہی تھی۔ اب بھی اس منبر پر چڑھیں گے اور تاریخ کی طرف سے شہادت دیں گے تو وہی کہیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت پر کوئی حکم نہیں جاری کر سکتے، دوسرا احساس یہ تھا کہ ایک چیز ہے جس کی خواہ کوئی تعبیر ہو اور خواہ اس کا وقت جب آئے، بہرحال وہ فطرتِ انسانی کا مطالبہ ہے اور مسلمان کا حق، وہ کیا ہے، شاید اقبال کے اس شعر سے وہ ادا ہو سکے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہ ہو شوکت و قوت کا پیام

عید کی تکبیریں "اللہ اکبر اللہ اکبر لاالہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد" کیا اس حقیقت کو نہیں یاد دلاتیں؟ پھر آخر اس پر کیوں اصرار ہے کہ دل سے اس کی تمنا بھی نکال دو، دین کو اس سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔

www.abulhasanalinadwi.org

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

یہ تھے مشاہدات وتأثرات جو بےتکلف زبانِ قلم پر آ گئے، اور شاید ایک عزیز کی فرمائش اور ایک محبِ مکرم کی سفارش کی تعمیل بھی ہوگئی۔

اہل مرکز، اہل جماعت، اور سب دوستوں اور بزرگوں کی خدمت میں سلام۔

آپ کا
علی

جمعہ، ۸شوال ۷۵ھ

—— ۱۰ ——

محبّ گرامی قدر زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گا، گرامی نامہ جو رائے پور سے ارسال کیا تھا، مجھے ایک مہینہ کی تاخیر سے ملا، کچھ تاخیر تو میرے سفرِ ترکی کی وجہ سے ہوئی، کچھ خط ہی کسی غلطی کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر سے پہونچا، خط پڑھ کر اور حالات معلوم کر کے بڑی مسرت حاصل ہوئی، اور بار بار پڑھا۔

ترکی کا سفر ایک دیرینہ آرزو تھی، اللہ تعالیٰ نے اس سفر میں یہ آرزو پوری کی، اگرچہ وقت کم رہ گیا تھا اور دو ہفتہ سے زیادہ کی گنجائش نہ تھی، پھر بھی دل نہ مانا اور اس عزیز سرزمین کی زیارت ہوگئی۔ جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا اور جو حالات معلوم ہوئے، وہ میرے لیے خلافِ توقع تھے۔ اگرچہ یہ سن چکا تھا کہ ترکی کی لادینیت اور اسلام سے بےتعلقی کی جو روایات بیان کی جاتی ہیں، ان میں بڑا مبالغہ ہے، لیکن ترکوں کی دینداری کے جو مناظر آنکھوں سے دیکھے اور اسلام سے ان کا جو

www.abulhasanalinadwi.org

شغف اور گہرا تعلق دیکھنے میں آیا، اس سے ایک طرف اس کا اندازہ ہوا کہ اسلام کی اس قوم کے دلوں میں کیسی مضبوط اور گہری جڑیں تھیں جو اتاترک کی کوہ کنی اور تیشہ زنی کے باوجود قائم ہیں، دوسری طرف اسلام کی اندرونی قوت اور حیات پر ایمان بڑھ گیا جو ان تمام صدموں کو برداشت کر لے گیا، اور ترکی میں ایک زندہ مذہب کی طرح موجود ہے اور اپنے سابق اقتدار کی طرف واپس آنے کے لیے بے چین کہا جا سکتا ہے کہ کسی اسلامی ملک کے مسلمانوں کو اسلام سے شاید اتنا دلی لگاؤ اور اس کا اتنا ادب واحترام نہ ہو جتنا ترکوں کو ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ میں اس سفر میں بالالتزام روزنامچہ لکھتا رہا ہوں۔ اس میں یہ سب مشاہدات وتاثرات آ گئے ہیں۔ آپ کے لیے شاید اس سے زیادہ موزوں کوئی تحفہ نہ ہوگا۔

ترکی سے دمشق واپسی ہوئی، میں آخر شوال تک اپنے کام سے فارغ ہو گیا تھا اور طبیعت پر جلد واپسی کا تقاضا تھا، لیکن سعید رمضان نے سخت اصرار کیا کہ مؤتمر اسلامی[۴] میں جو ذیقعدہ میں ہونے والی ہے، شرکت کرتا جاؤں، دمشق میں ہو کر اس مؤتمر میں شرکت کیے بغیر چلا جانا جب کہ وہ ہندوستان سے بلا رہے تھے، ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ اگر ہندوستان جانا اس وقت ضروری ہی ہو تو آپ کو مؤتمر میں شرکت کے لیے مستقل آنا پڑے گا، میرے ملیے اس سے یہ آسان تھا کہ میں شرکت کرتا جاؤں۔ آپ سعید رمضان کے تعلقات اور خصوصیات سے واقف ہیں، ان کے سوا کوئی ہوتا تو میں صاف معذرت کر دیتا، لیکن سعید رمضان سے انکار کرنا میرے لیے مشکل تھا، چنانچہ وعدہ کر لیا اور اس درمیانی وقفہ میں ترکی چلا گیا، وہاں سے واپسی عین وقت پر ہوئی، آدھی رات کو میں پہنچا اور صبح سے مؤتمر شروع ہو رہی تھی، سعید رمضان کو بے چینی سے انتظار تھا، انہوں نے اسی دن کے پروگرام میں میرا نام اور تقریر رکھی تھی اور اس پروگرام کا اعلان ہو چکا تھا، میرے پہنچنے سے ان کو بڑی مسرت ہوئی، اور میں شریک ہو گیا۔

مؤتمر اپنے موضوع ومقصد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہی، بیشتر ممالک اسلامیہ کے وفود شریک ہوئے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک کے نمائندے موجود تھے، اہل ملک اور حکومت کی

www.abulhasanalinadwi.org

طرف سے بھی اچھا استقبال اور تعاون رہا۔ صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، صدر پارلیمنٹ نے مؤتمر کے مندوبین کے اعزاز میں دعوتیں دیں، تقریریں بڑی مؤثر اور پرجوش ہوئیں، تجاویز بھی اچھی منظور ہوئیں، اور بعض مفید تجویزیں پاس ہوئیں۔ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے اور تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا، اور اسلامی محبت واخوت کا مؤثر مظاہرہ ہوا۔ یہ پہلو قابلِ تحسین ومسرت بخش تھا، اور اس لحاظ سے مؤتمر کامیاب تھی۔ لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ کسی جماعت یا ادارہ کی دعوت پر اتنا نمائندہ اور وسیع اجتماع کم دیکھنے میں آیا ہے۔

دو چیزیں میرے لیے اس مؤتمر میں کوفت اور انقباض کا باعث ہوئیں اور آپ سے اس کا اظہار کر دینے میں حرج نہیں۔ ایک تو یہ کہ مؤتمر پر اول سے آخر تک سیاسی ومجلسی ذہن اور فضا غالب تھی، وہی دستوری موشگافیاں، وہی خطابت کے مظاہرے، وہی پرجوش تقریریں، مندوبین میں سے بعض کا بے ضرورت بولنے پر اصرار، ہم ہندوستان میں اس مرحلہ سے بہت کچھ گزر چکے ہیں، اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ طریقہ فرسودہ ہو گیا، اب عمل اور جدوجہد وقربانی کا دور ہے، مگر ابھی بہت سے عرب ممالک میں مجلسی زندگی کا وہ دور چل رہا ہے، اس کے ساتھ اب تبلیغی اجتماعات میں شرکت وتعلق نے ہم کو ان مؤتمرات وکانفرنسوں کے لیے اور بھی غیر موزوں بنا دیا ہے۔ اب طبیعت اس کی عادی ہو گئی ہے کہ اسلامی اجتماعات میں نمازوں اور جماعتوں کا اہتمام ہو، سکینت اور وقار اور توجہ الی اللہ کی فضا ہو، لایعنی سے اجتناب ہو، شرکائے مجلس ورفقائے کار کا اکرام اور ان کے حقوق کا لحاظ ہو۔ اس لحاظ سے اگرچہ یہ مؤتمر عام کانفرنسوں سے ممتاز تھی، لیکن پھر بھی ایک سیاسی مؤتمر تھی اور طبیعت جن چیزوں کی جویا ہے، ان کی کمی اس سیاسی فضا میں محسوس ہوتی تھی۔

دوسری چیز جو میرے انقباض کا باعث ہوئی وہ یہ کہ مودودی صاحب جب پہلے عمومی اجتماع میں جو یونیورسٹی ہال میں ہو رہا تھا، اسٹیج پر آئے تاکہ کانفرنس کے متعلق اور مسئلہ فلسطین کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں تو انہوں نے منتظمین جلسہ سے خواہش ظاہر کی کہ ان کی اردو تقریر کا ترجمہ میں کروں۔ میں بعض وجوہ سے اس کو اچھا نہیں سمجھتا تھا، لیکن انہوں نے کئی بار اس کا تقاضا

www.abulhasanalinadwi.org

کیا اور منتظمینِ جلسہ نے جو ہم لوگوں کے ذہنی اختلاف سے بخوبی واقف نہیں، اصرار کے ساتھ مجھ سے اس کی خواہش کی کہ میں ترجمہ کردوں، مجبوراً طبیعت کے انقباض کے ساتھ یہ خدمت انجام دینی پڑی، اگرچہ تقریر کا تعلق صرف مسئلہ فلسطین سے تھا اور اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو میرے لیے موجبِ انقباض ہوتی، لیکن صرف اس بناء پر کہ کہیں لوگ اس ترجمانی کو نظریات کے اتحاد پر محمول نہ کریں، مجھے اس میں تردد تھا، اس لیے میں یہی مناسب سمجھتا تھا کہ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔ آپ میری افتادِ طبع سے واقف ہیں، مجھ سے انکار پر اصرار نہ ہو سکا، بس طبیعت پر ایک انقباض جو خلافِ طبع کام کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے، طاری ہو گیا اور کئی روز اس کا اثر رہا۔

مؤتمر کے اختتام پر اور مندوبین و مدعوین عمان و بیت المقدس چلے گئے، تا کہ وہاں پناہ گزینوں کی حالت بچشم خود دیکھیں اور حالات معلوم کریں۔ میں نے سعید رمضان سے اس سفر کی شرکت سے معذرت کر دی تھی، واپسی کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا، بغداد و کراچی، دہلی اور رائے پور ہو کر آپ کے پاس پہنچنے کا نظام ہے۔ اللہ تعالیٰ خیریت سے ملائے۔

والسلام

ابوالحسن علی

حواشی

۱- (م۱۹۶۴ء)، اخوان المسلمون کے رہنما اور شام کے معروف عالم دین۔ اُن دنوں کلیۃ الشریعہ- جامعہ سوریہ کے پرنسپل تھے، اور اُن ہی کی دعوت پر مولانا علی میاں نے بطور وزٹنگ پروفیسر دمشق کا یہ سفر و قیام اختیار کیا تھا۔ شیخ السباعی کی تالیف ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' اپنے موضوع پر بڑی محققانہ اور منفرد تصنیف ہے۔

۲- مرکز دعوت واصلاح وتبلیغ۔ لکھنؤ

۳- یہ شعر اس طرح بھی نقل کیا گیا ہے:

www.abulhasanalinadwi.org

بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند

سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند

۴- اس مؤتمر کے محرک مولانا علی میاں کے عزیز دوست ڈاکٹر سعید رمضان تھے، اور منتظم و موید ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی تھے۔

پروفیسر خورشید احمد

—— ۱۱ ——

۲۷ ربیع الاول ۱۳۷۶ھ

محبِّ مکرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ مورخہ ۱۳ اکتوبر ملا، اس سے پہلے کا مکتوب بھی مل گیا تھا، اور مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے اس کا جواب دیا تھا۔ یہ بھی یاد ہے کہ میں نے اس میں اس حیرت کا اظہار کیا تھا کہ آپ نے میرے مکتوب مطبوعہ ''الفرقان'' کے بعد مجھے یاد فرمایا۔ یہ آپ کی سلامت فہم و شرافتِ نفس کی دلیل ہے۔ افسوس ہے کہ وہ خط آپ کو نہیں ملا۔

آپ نے جو احساسات لکھے ہیں وہ کارکنانِ دعوت کو اکثر پیش آتے ہیں، ان سے بد دل نہیں ہونا چاہیے، البتہ دونوں کا علاج میرے نزدیک یقین اور قوتِ ارادہ ہے اور اس کا ذریعہ حصول عام حالات میں اہلِ یقین کی صحبت یا محبت کی طاقت ہے۔ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔ اس وقت اس سے زیادہ تفصیل میرے لیے آسان نہیں۔ کاش کچھ وقت آپ کے ساتھ گزر سکتا، اور آپ کی خدمت کی کوئی توفیق ہوتی۔

''وائس آف اسلام'' کی ادارت ایک بہت بڑی سعادت اور میرے عقیدہ میں عبادت ہے۔ میں نے زبانی بھی عرض کیا تھا، مکرر کہتا ہوں، اس سے سبکدوش ہونے کی کوشش نہ کیجیے، اس زمانہ کا ایک جہاد ہے، اس کی توفیق پر شکر ادا کیجیے۔ دل سے آپ کی کامیابی اور قوت کے لیے دعا

www.abulhasanalinadwi.org

ہے۔

''دو ہفتے ترکی میں'' ان شاء اللہ حتی الامکان آج ہی آپ کی خدمت میں روانہ ہوگی۔ اس کو جس طرح چاہیں، آپ شائع کریں۔ مستقل مضمون میرے لیے اس وقت بہت دشوار ہے۔

''الفرقان'' کے لیے ان شاء اللہ آج ہی تاکید کردوں گا اور آپ کا پتہ دے دوں گا۔ خدا کرے آپ بالکل اچھے ہوں۔ مصر کے تازہ حالات اور برطانیہ کے حملہ نے دل ودماغ کو متاثر کر رکھا ہے۔

آپ کا

علی

ڈاکٹر محمود فیضانی

—— ۱۲ ——

رائے بریلی

محبی ومکرمی ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، آپ کا ۹ مئی کا لکھا ہوا خط مجھے ایک طویل [سفر] سے واپسی پر ملا۔ اپنے بزرگ وکرم فرما مولانا ظفر اقبال صاحب کے انتقال کی خبر سے صدمہ ہوا۔ اللھم اغفرلہ وارفع درجاتہ۔ ۲۹ء سے لے کر ۷۸ء تک کی باتیں یاد آ گئیں، ان کی ہستی مغتنمات میں سے تھی۔ ان شاء اللہ ماہ مبارک کی دعا ختم میں روزانہ ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ ان کے صاحبزادوں اور صاحبزادی سے میری طرف سے تعزیت کا پیغام پہونچا دیجیے۔ میرے پاس کسی کا پتہ نہیں۔ مولانا سے عزیزانہ اور خاندانی قسم کا تعلق تھا، اور وہ بڑی عنایت فرماتے تھے۔ ''سیرت سید احمد شہیدؒ (۱-۲)'' کی طباعت واشاعت بھی ان کی مبارک یادگار ہے

www.abulhasanalinadwi.org

جس سے انہوں نے بڑی دلچسپی اور اہتمام وانہماک کا معاملہ فرمایا تھا۔ تقبل اللہ۔ آپ کی عنایت کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے مولانا کی وفات کی خبر دی، ورنہ معلوم نہیں کب اس کا علم ہوتا۔ جزاکم اللہ

والسلام

مخلص

ابوالحسن علی

۲۱ مئی ۸۵ء

حاشیہ

۱۔ متنوع دینی اور دعوتی سرگرمیوں کے ساتھ مولانا ظفر اقبال کی شہرت کا باعث ممکنہ صحتِ کتابت کے ساتھ قرآن مجید کے ایک نسخے کی اشاعت ہے۔

جناب محمد موسیٰ بھٹو

—— ۱۳ ——

۱۸ شعبان ۱۴۱۱ھ

گرامی منزلت جناب محمد موسیٰ بھٹو زادہ اللہ توفیقاً

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، گرامی نامہ مورخہ ۱۵ فروری اور آپ کی فکر انگیز اور دعوتی تصنیف ''اسلام اور ہمارے کچھ فکری و اخلاقی مسائل'' پہونچی۔ میری ڈاک زیادہ تر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پتہ پر آتی ہے اور محفوظ رہتی ہے۔ میں بعض اوقات سفروں پر رہتا ہوں یا اپنے وطن رائے بریلی میں، اس لیے اس پر مطلع ہونے میں بعض اوقات تاخیر ہو جاتی ہے! یہی صورتِ حال آپ کے گرامی نامہ اور قابلِ قدر کتاب کے بارے میں پیش آئی۔

www.abulhasanalinadwi.org

میری طرف سے آپ اس قیمتی فکری و دعوتی پیش کش پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ معاف کیا جائے، پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں میں بہت کم اتنی فکری مماثلت اور خیالی توارد محسوس ہوا جتنا آپ کی اس تصنیف میں، غالباً یہ (توفیق الٰہی کے بعد) آپ کے ذہنی توازن، عمیق مطالعہ اور تحریکوں، تنظیموں کے حقیقت پسندانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی قبول فرمائے، اور اہلِ پاکستان کو اس سے نفع اٹھانے کی توفیق دے۔

آپ نے اپنے خطوط کے جواب کے نہ ملنے کا دوستانہ و محبانہ شکوہ کیا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مجھے یاد نہیں کہ اس سے پہلے مجھے آپ کی کوئی کتاب یا خط ملا ہو۔ میں خطوط کے جواب کا بحمداللہ بڑا اہتمام کرتا ہوں، لیکن اکثر بیرونِ ملک کے طویل طویل سفروں پر بھی رہتا ہوں، اس لیے ممکن ہے کہ مجھے آپ کا کوئی خط یا کتاب نہ ملی ہو، بہر حال اس کی معافی چاہتا ہوں۔

میں آپ کی خدمت میں اپنے چند رسائل بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کی نظر سے گزریں گے۔

امید ہے کہ مزاج ہر طرح بعافیت ہوں گے۔ والسلام مع الاکرام

مخلص

ابوالحسن علی ندوی

۶ / مارچ ۹۱ء

www.abulhasanalinadwi.org

٦

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org

اشاریے

رجال

آتش ۲۷

آدم ۱۲۱

آدم بنوری، سید ۷۴

آدمِ ثانی سلسلہ چشتیہ ۱۱۹

آزاد دیکھیے: ابوالکلام آزاد، محمد حسین آزاد

آں حضرتؐ ۲۵–۲۶، ۱۹۸، ۲۳۲–۲۳۳، ۲۳۷، نیز دیکھیے: حضورؐ، رسولؐ، سرورِ کائنات

ابراہیم ۱۸۱–۱۸۲، ۲۲۲، ۲۶۹

ابراہیم عبدالہادی پاشا ۲۷۷، ۲۸۵

ابن الترکمانی ۳۱

ابن المقفع ۲۹–۳۰، ۳۳

ابن تیمیہ ۱۵، ۳۵، ۳۷، ۴۳، ۵۸، ۸۲، ۸۹، ۱۰۵، ۱۰۷–۱۱۳، ۱۱۵–۱۱۷

ابن جوزی ۳۷، ۲۶۹

ابن حجر، حافظ ۳۱

ابن خلدون ۸۱

ابن رجب ۳۷، ۱۰۸

ابن عابدین ۲۹۳

ابن عبدالہادی ۳۷، ۱۰۸

ابن عربی ۱۱۳

ابن قتیبہ دینوری ۳۳، ۲۲۹

ابن قدامہ ۱۱۵

ابن قیم ۳۵، ۸۲، ۱۰۸

ابن کثیر ۴۷، ۱۰۸

ابواسحاق شاطبی ۱۰۸

ابوالاعلیٰ مودودی، سید دیکھیے: مودودی، سید

ابوالحسن علی الضریر ۲۹، ۲۲۸

ابوالحسن علی ندوی، سید ۱۱–۱۸، ۷۱، ۷۴، ۱۰۳، ۱۰۷، ۱۱۶–۱۱۷، ۱۳۱، ۱۳۵–۱۴۵، ۱۴۷–۱۵۴، ۱۵۵–۱۵۶، ۱۵۸–۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۷، ۱۷۰–۱۷۴، ۱۷۵–۱۷۶، ۱۷۸–۱۸۰، ۱۸۴–۱۸۵، ۱۹۵، ۲۰۹–۲۱۰،

www.abulhasanalinadwi.org

۲۱۳، ۲۱۷-۲۱۸، ۲۲۳-۲۲۷، ۲۳۵-
۲۳۷، ۲۴۲، ۲۵۳، ۲۶۶، ۲۷۴، ۲۹۸،
۳۰۱-۳۰۲، نیز دیکھیے: علی میاں، سید
ابوالخیر برق، سید ۲۷
ابوالفرج الاصفہانی ۳۳، ۲۲۹
ابوالکلام آزاد ۴۰، ۵۴، ۶۴، ۶۸،
۱۴۴، ۱۷۰، ۲۸۴
ابواللیث ندوی ۸۳
ابوبکر [صدیقؓ] ۱۰۵، ۲۰۴
ابوبکر غزنوی، سید ۱۷۹
ابوجعفر منصور ۷۳
ابوجہل ۱۱۸
ابوحنیفہ ۲۶۹
ابوداؤد ۳۱
ابوعبید الثقفی ۲۶۹
اتاترک ۲۹۶
احمد بن حنبل ۴۰، ۲۶۹
احمد الحسنی ۲۹۰
احمد الشرباصی ۲۲۲، ۲۲۴
احمد امین ۳۹-۴۰، ۵۳، ۹۸،
۱۰۲-۱۰۳، ۲۲۴، ۲۳۵، ۲۷۴-۲۷۵،
۲۷۷، ۲۸۰-۲۸۱، ۲۸۳، ۲۸۵
احمد تقی الدین ۱۰۸، نیز دیکھیے:
ابن تیمیہ
احمد حسن الزیات ۵۳، ۲۷۸، ۲۸۵
احمد حسن کانپوری ۳۰
احمد خان، سرسید ۱۳۴
احمد شقیری ۲۷۵
احمد شہید، سید ۱۴، ۱۶-۱۷، ۳۴، ۳۶،
۴۶-۴۷، ۵۱، ۵۴-۵۶، ۷۰، ۷۴-
۷۶، ۸۹، ۱۳۱-۱۳۳، ۱۷۵، ۱۸۸،
۲۱۵-۲۱۶، ۲۳۰
احمد عبدالرحمٰن البنا ۲۷۵
احمد علی، استاذ ۲۷۳
احمد علی لاہوری ۴۵، ۴۷، ۸۲-۸۳، ۲۳۱
احمد عبدالمجید الغزالی ۲۲۵
احمد محمد شاکر ۲۷۵
اخطل ۱۹۸
ادریس [کاندھلوی] ۲۶۴
اسعد حسنی ۲۷۵
اسماعیل شہید، شاہ ۴۵-۴۶، ۱۳۲، ۱۳۴-
۱۳۵، ۱۴۳-۱۴۴
اسماعیل میرٹھی ۲۴
اشرف علی تھانوی ۱۶، ۷۵، ۱۷۰، ۲۴۲
اعزاز علی ۱۶۳، ۲۶۴
اقبال ۱۵، ۴۲، ۵۳-۵۴،

www.abulhasanalinadwi.org

۵۶، ۶۷، ۸۰، ۸۳-۸۴، ۸۹-۹۰،
۱۴۷-۱۵۳، ۱۵۹، ۱۶۹-۱۷۱، ۱۷۴-
۱۷۵، ۱۸۸، ۱۹۴، ۲۱۵-۲۱۸، ۲۲۳،
۲۲۵-۲۲۶، ۲۳۱، ۲۳۴، ۲۵۷، ۲۷۲،
۲۷۹-۲۸۱، ۲۹۴
اکبرالہ آبادی ۵۲-۵۳
امداداللہ مہاجر مکی ۳۰
امیر حسن ۵۴
امیر مینائی ۲۷
امین احسن اصلاحی ۱۵
امین الحسینی، مفتی ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۴۶-
۲۴۷، ۲۷۷، ۲۸۰
اندرا گاندھی ۹۳
انور الجندی ۵۷
اورنگ زیب عالمگیر ۷۵، ۱۸۸
باقی باللہ، خواجہ ۴۳
بحتری ۲۹
برق، ڈاکٹر دیکھیے: غلام جیلانی برق
برنی دیکھیے: محمد الیاس برنی
بہجۃ الاثری ۲۳۵
بہجۃ البیطار ۲۳۵
بہرام شاہ ۷۴
البہی الخولی ۲۷۶، ۲۸۴
پطرس ۶۴
پیر محمد سلونی چشتی نظامی ۷۰
ترمذی ۳۱
تقی الدین ہلالی دیکھیے: محمد تقی الدین ہلالی
ٹیگور ۴۲، ۱۴۸
ثاقب قزلباش لکھنوی، آغا ۲۷
ثناء اللہ امرتسری ۱۶۹
جاحظ ۲۹، ۳۲-۳۳
جرجانی ۲۹-۳۰
جعفر علی بستوی، سید ۵۵
جعفر علی نقوی گورکھ پوری، سید ۱۳۲
جگر مرادآبادی ۷۱
جگر گوشۂ رسولؐ ۲۶۹، نیز دیکھیے: حسین
بن علی
جلال بے حسین ۲۷۵
جلیل احسن ندوی ۱۶۱
جمال الدین افغانی ۵۵
جمال عبدالناصر ۹۲
جواہر لال نہرو ۸۸، ۱۵۹
حالی، مولانا ۲۴، ۶۸
حبیب الرحمٰن، حافظ سید ۲۷
حبیب الرحمٰن خان شروانی ۲۸، ۳۵، ۳۸
حبیب الرحمٰن عاصم ۱۹۷

www.abulhasanalinadwi.org

حریری ۳۲

حسنؓ [بن علیؓ] ۷۳

حسن بن سہل ۱۹۹

حسن اسماعیل الہضیبی ۲۸۴

حسن الاعظمی ۸۹

حسن البنا ۷۲، ۲۱۷، ۲۷۵-۲۷۶، ۲۸۰، ۲۸۴

حسن بصری ۲۸۸

حسینؓ [بن علیؓ] ۷۳، ۱۰۵، نیز دیکھیے: جگر گوشۂ رسولؐ

حسین بن محسن یمنی ۳۰، ۸۰، ۲۲۸

حسین احمد مدنی ۷۵، ۸۳، ۱۷۷

حسین یوسف ۲۷۵

حضور=حضور اکرم= ۸۴، ۱۶۸-۱۷۰،

حضور رسالت مآب ۱۸۳، ۲۴۴-۲۴۵، نیز دیکھیے: آں حضرتؐ، رسولؐ، سرور کائنات

حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۹۳

حلیم عطا، شاہ ۳۷، ۸۴

حلیمہ سعدیہ ۲۳۳

حمید الدین، منشی سید ۲۲

حیدر حسن خان ٹونکی ۳۰، ۸۱-۸۲

حیرت دہلوی ۱۳۴، ۱۴۳

خالدؓ [بن ولید] ۲۲-۲۳، ۲۵۶

خالد علوی ۱۶۷

خرم مراد ۱۵، ۸۵

خضر حسین تونسی، سید ۲۷۵، ۲۸۳

خطیب دیکھیے: محب الدین الخطیب

خلیق احمد نظامی ۱۱۵

خلیل، مفتی ۵۴

خلیل الدین، سید ۱۳۵

خلیل عرب بن محمد عرب ۲۸-۳۱، ۳۸، ۷۹، ۸۱، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۵

خلیل مردم بک ۲۳۵

خورشید احمد، [پروفیسر] ۱۳، ۸۵، ۱۰۵، ۲۹۹

خورشید رضوی ۲۱۳

خولہؓ بنت الازور ۲۳

خیالی دیکھیے: فخر الدین خالی، سید

خیر النساء، سیدہ ۷۷، ۲۱۴

خیر محمد جالندھری ۲۶۴

داؤدؑ ۱۰۹

داؤد غزنوی ۳۴، ۵۴، ۱۳۶

ڈریپر ۳۸، ۵۷

ذاکر حسین خان ۵۰، ۸۸

ذوق ۲۷

رابع ندوی دیکھیے: محمد رابع ندوی

www.abulhasanalinadwi.org

راجیو گاندھی ۹۳
رازی ۴۷
راشد الخیری ۲۴
رتن ناتھ سرشار ۲۸
رحمت اللہ کیرانوی ۱۶۹
رسولؐ = رسول اکرم = ۱۶-۱۷، ۲۴، ۴۸، ۹۹،
رسول اللہؐ ۱۲۲، ۱۴۹، ۱۸۳، ۲۱۶،
۲۳۳، ۲۵۰، ۲۷۶-۲۷۷، نیز
دیکھیے: آں حضرتؐ، حضورؐ،
سرورِ کائنات
رشید احمد صدیقی ۶۴
رشید رضا، سید ۴۴، ۵۵، ۷۵، ۱۳۶،
۲۱۶، ۲۲۹-۲۳۰
رضوان، مولوی ۲۹۰، ۲۹۲
رضوان علی ندوی، سید ۷۱
رئیس احمد جعفری، سید ۱۱۶، ۲۸۶
روم = رومی، مولانا ۵۶، ۱۵۱
زاہد منیر عامر ۲۵۳
زمخشری ۴۷
الزیات دیکھیے: احمد حسن الزیات
زید بن علی ۱۰۵
زیلعی، امام ۳۱
السباعی، شیخ دیکھیے: مصطفیٰ حسن السباعی
سجاد حیدر یلدرم، سید ۲۵
سرورِ کائنات ۲۶، نیز دیکھیے: آں
حضرتؐ، حضورؐ، رسولؐ
سعدؓ بن ابی وقاص ۲۶۹
سعدی ۲۷۷
سعود بن عبدالعزیز، ملک ۲۳۴
سعید الدین ۱۳۵
سعید رمضان ۲۳۵، ۲۷۵، ۲۸۰،
۲۸۸، ۲۹۲، ۲۹۶، ۲۹۸-۲۹۹
سفیر اختر ۱۲، ۱۳۱
سلمان طاہر ۱۲
سلیمان منصور پوری، قاضی ۲۵-۲۶، ۱۶۹
سلیمان ندوی، سید ۱۶، ۴۰، ۵۶، ۶۸، ۷۵،
۸۷، ۱۱۵، ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۶۹، ۲۲۹،
۲۳۸، ۲۴۶، ۲۵۶، ۲۶۵-۲۶۶،
۲۷۹، ۲۸۵-۲۸۷
سنگھ، وی-پی ۹۳
سہیل حسن ۱۲، ۲۲۷
سید قطب ۴۹، ۵۳، ۱۰۳، ۲۱۷،
۲۲۴، ۲۳۴-۲۳۵، ۲۴۶، ۲۴۸-۲۴۹
شافعی، امام ۲۱۵
شاہ بانو ۱۷
شاہ ولی اللہ دیکھیے: ولی اللہ، شاہ

www.abulhasanalinadwi.org

شبلی جیراج پوری ۸۱
شبلی [نعمانی] ۱۶، ۲۶، ۶۴، ۶۸،
۷۷، ۱۰۷، ۱۶۷، ۱۶۹-۱۷۰، ۱۹۲
شبیر احمد عثمانی ۴۰
شرر ۲۸
شرف الدین ۲۷۱
شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ ۴۴، ۱۱۷، ۱۲۱-۱۲۲
شفیق احمد ۱۲
شکری فیصل ۹۷، ۲۷۳، ۲۸۳
شکیب ارسلان، امیر ۳۴، ۵۵، ۲۱۷، ۲۲۹،
۲۳۱، ۲۸۴
شمس الدین ابوعبداللہ... ۱۱۵
شمس تبریز خان ۷۰
شمس لکھنوی ۲۷
شوکانی ۳۱
صادق حسین، ڈاکٹر ۱۴۳
صالح حرب پاشا ۲۷۵
صالح عشماوی ۲۷۵
صالحہ، سیدہ ۲۳
صاوی شعلان ۸۹
صدر یار جنگ، نواب
دیکھیے: حبیب الرحمٰن خان شروانی
صدیق حسن خان، نواب سید ۷۹

صفیہ، سیدہ ۲۷۰
ضرارؓ ۲۳
ضیاء الدین برنی ۷۴
ضیاء النبی ۷۸
طارق ۱۴۸
طاہر عباسی ۱۲
طفیل احمد، سید ۴۱
طلحہ حسنی، سید ۲۷، ۶۶، ۸۰، ۲۳۱
طٰہٰ حسین ۲۳۵، ۲۷۸، ۲۸۱، ۲۸۵
ظفر احمد انصاری ۲۴۷
ظفر اسحاق انصاری ۱۲-۱۳
ظفر اقبال ۳۰۰-۳۰۱
ظفر علی خان ۲۵، ۳۸، ۵۳
عابد حسین، سید ۶۸، ۸۸
عاصم الکوثری ۲۷۱، ۲۷۴، ۲۷۸، ۲۸۲
عالمگیر دیکھیے: اورنگ زیب عالمگیر
عائشہؓ ۲۲۳
عباس محمود عقاد ۵۳، ۲۷۸، ۲۸۱، ۲۸۵
عبدالباری ندوی ۴۳، ۲۶۵
عبدالحق دہلوی ۲۶۱
عبدالحکیم بن شرف الدین، شیخ ۲۷۱
عبدالحکیم عابدین ۲۷۶
عبدالحی، حکیم سید ۲۲، ۳۶، ۴۱، ۴۹، ۶۴،

www.abulhasanalinadwi.org

۷۳، ۷۵-۸۰، ۱۳۶، ۲۱۴، ۲۲۶-
۲۲۸، ۲۳۱
عبدالحی [بڈھانوی] ۴۶، ۱۳۱
عبدالحی فاروقی، خواجہ ۸۳
عبدالرحمٰن، سید ۲۲
عبدالرحمٰن البنا ۲۷۵
عبدالرحمٰن عزام پاشا ۲۷۷
عبدالرحمٰن الکواکبی ۳۴، ۱۶۲
عبدالرزاق کلامی، سید ۲۲، ۵۱
عبدالرشید ۲۷۸
عبدالسلام قدوائی ندوی ۸۳، ۲۷۱، ۲۸۲
عبدالعزیز بن باز ۲۲۷، ۲۳۵
عبدالعزیز کامل، استاد ۲۷۶
عبدالعلی، سید ۲۱۳
عبدالعلی، ڈاکٹر سید ۲۲، ۳۱، ۳۴، ۳۸، ۴۳،
۵۴، ۶۳، ۷۸-۸۱، ۸۷، ۲۱۹-۲۲۰،
۲۲۹، ۲۸۲-۲۸۳
عبدالقادر جیلانی، شیخ ۲۰۶، ۲۱۰، ۲۶۹
عبدالقادر رائے پوری ۱۶، ۸۵، ۹۰، ۱۵۵،
۱۷۵، ۲۴۲
عبدالقادر عودہ ۲۱۷
عبدالقادر مغربی ۲۳۵
عبدالقاہر جرجانی ۲۹
عبدالقہار مدکر ۲۸۴
عبداللطیف ۲۰۲
عبدالماجد دریابادی ۳۸-۴۰، ۵۳، ۶۴،
۶۸، ۱۵۸، ۱۶۰، ۲۴۳، ۲۴۶
عبدالملک بن مروان ۱۹۸
عبدالمجید سلیم، شیخ ۲۷۵
عبداللہ [شاہ اردن] ۸۶، ۲۳۴
عبداللہ الاشتر ۷۳
عبداللہ العقیل عراقی ۲۷۸
عبداللہ العمری ۲۷۵
عبداللہ المحض ۷۳
عبداللہ المزروع ۲۷۳
عبداللہ عباس ندوی ۸۵، ۱۸۱، ۲۸۶
عبداللہ غازی ۷۴
عبداللہ بن محمد النفس الزکیہ ۷۳
عبدالوہاب عزام ۸۹
عبدہ بن الطیب ۲۱۳
عبیداللہ سندھی ۴۵، ۸۳
عرب صاحب دیکھیے: خلیل عرب
عزیز الرحمٰن، سید ۲۲۹
عقاد دیکھیے: عباس محمود عقاد
علاء الدین صابر کلیری، شیخ ۱۱۹
علم اللہ رائے بریلوی، شاہ ۷۰، ۷۴-۷۶

www.abulhasanalinadwi.org

علیؓ [بن ابی طالب] ۲۲۰، ۲۶۹

علی بخش ۸۴

علی طنطاوی ۱۴۸، ۲۱۷

علی غایاتی ۲۷۵

علی میاں، سید=علی ۲۱، ۴۸، ۵۹، ۷۱–۷۹، ۸۱–۸۲، ۸۴–۸۵، ۱۰۷–۱۰۸، ۱۱۳، –۱۱۵، ۱۱۷–۱۱۹، ۱۲۱، ۱۲۶–۱۲۸، ۱۵۳، ۱۶۴، ۱۶۷، ۱۷۲–۱۷۴، ۱۷۶–۱۸۳، ۱۸۷–۱۹۱، ۱۹۳–۱۹۴، ۱۹۷–۲۰۹، ۲۱۳، –۲۱۴، ۲۱۶–۲۲۰، ۲۲۴–۲۲۵، ۲۲۷–۲۳۵، ۲۳۷–۲۳۹، ۲۴۱، ۲۴۳–۲۴۷، ۲۵۰–۲۵۷، ۲۶۱، ۲۶۷، ۲۸۲، ۲۸۴–۲۸۷، ۲۹۰، ۲۹۵، ۲۹۸، ۳۰۰، نیز دیکھیے: ابوالحسن علی ندوی، سید

علی نمیر فیاس ۲۸۸

عمرؓ [بن خطاب] ۲۰۷، ۲۶۹

عمر بن عبدالعزیز ۱۰۵، ۱۸۹، ۲۸۸، ۲۹۴

عمر بہاء الامیری ۲۸۴

عمر فروخ ۲۱۷

غالب ۲۷، ۷۲، ۲۹۱

غلام احمد لاہوری ۳۰

غلام احمد قادیانی، مرزا ۱۳۴، ۱۴۳، ۱۵۵

غلام جیلانی برق ۱۰۷، ۱۱۵–۱۱۶

غلام علی، شاہ ۳۶

غلام رسول مہر، چودھری ۵۶، ۶۸، ۷۵، ۱۳۴، ۱۳۸–۱۴۱، ۱۴۳–۱۴۴

فخر الدین خیالی، سید ۲۴، ۶۳، ۷۶، ۲۱۴

فرحت اللہ بیگ دہلوی، مرزا ۶۴

فردوسی ۲۶

فرعون ۱۲۴

فرید الدین گنج شکر، خواجہ ۱۱۷، ۱۱۹

فرید وجدی ۲۷۵

فضل الرحیم ۲۳۷

فضل رحمٰن گنج مرادآبادی ۳۶، ۹۰

فضل محمد ۲۶۱

فیصل، شاہ ۲۳۴–۲۳۵

قازان ۱۱۱–۱۱۲

قطب، سید دیکھیے: سید قطب

قطب الدین، سید ۷۴

قطب الدین بختیار کاکی ۱۱۷، ۱۱۹

قیام الدین احمد ۱۴۳

قیس ۲۱۳

کرد علی ۲۳۵

کعب بن مالک ۲۳۳

کفایت اللہ، مفتی ۲۶۴

کلامی دیکھیے: عبدالرزاق کلامی، سید

www.abulhasanalinadwi.org

کمال الدین ابن زملکانی ۱۰۹
کواکبی دیکھیے: عبدالرحمٰن الکواکبی
گبن ۵۸
لات [ومنات] ۱۹۳
لبید ۲۱۵
لطف اللہ کوکلی ۳۰
لیاقت بیگ، مرزا ۱۲
لیکی ۳۸
لیلیٰ ۱۹۰
ماجد السعد مدنی ۲۷۳
متنبی ۲۹، ۳۲
مثنیٰ بن حارثہ ۲۶۹
مجدد الف ثانی [شیخ احمد سرہندی] ۴۳-۴۴، ۴۷، ۸۹، ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۸۸، ۲۰۲
مجنوں ۱۹۰
محب الدین الخطیب ۲۱۷، ۲۳۱، ۲۷۵-۲۷۶، ۲۷۹، ۲۸۴
محمدؐ، سیدنا = محمد عربی ۱۵۲، ۲۶۹، ۲۷۲، نیز دیکھیے: آں حضرتؐ، حضورؐ، رسولؐ، سرور کائناتؐ، نبی اکرمؐ
محمد ابوزہرہ ۱۱۶
محمد احمد الغمراوی ۲۷۵
محمد اسد ۳۹
محمد اسماعیل شہید، شاہ دیکھیے: اسماعیل شہید، شاہ
محمد البشیر الابراہیمی ۲۱۷
محمد الحسنی ندوی، سید ۷۶، ۸۱، ۹۷، ۱۴۱، ۱۷۹
محمد العربی ۸۳
محمد الغزالی ۲۳۵، ۲۴۳، ۲۷۵، ۲۸۴
محمد النجمی ۲۸۴
محمد النفس الزکیہ ۷۳، ۱۰۵
محمد الیاس کاندھلوی ۱۶، ۴۶، ۸۴، ۸۸، ۹۰، ۱۷۱، ۱۷۵-۱۷۸، ۱۸۸، ۲۰۲-۲۰۳، ۲۰۸، ۲۶۶
محمد الیاس برنی ۱۵۶، ۱۵۹-۱۶۰
محمد ایوب قادری ۱۴۳
محمد بشیر شہید ۱۳۸
محمد بن ابراہیم الوزیر ۳۱
محمد بن اسماعیل الامیر ۳۱
محمد بن عبدالوہاب ۱۳۴
محمد بن قاسم ۱۱۸
محمد بن نصر المروزی ۳۵
محمد ابوزہرہ ۱۱۶
محمد تقی الدین ہلالی مراکشی ۳۲-۳۴، ۳۸، ۵۴-۵۵، ۲۲۹-۲۳۱، ۲۶۹-۲۷۱، ۲۸۲
محمد ثانی ندوی ۲۷۳، ۲۸۳
محمد جعفر تھانیسری ۱۳۳، ۱۴۳

www.abulhasanalinadwi.org

محمد حسین آزاد ۲۸، ۶۸، ۷۷، ۲۱۵
محمد رابع [ندوی] ۸۵، ۱۸۴، ۲۳۲
محمد زاہد الکوثری ۲۷۵
محمد زکریا کاندھلوی ۱۶، ۲۴۶، ۲۶۴
محمد صدیق شبلی ۱۴۷
محمد طفیل ہاشمی ۱۸۷
محمد طیب، قاری ۱۸۷
محمد ظاہر حسنی، سید ۱۳۵
محمد عطاء اللہ حنیف ۱۱۶
محمد عبدالحلیم چشتی ۱۴۳
محمد عبدہٗ ۵۵
محمد عزہ دروزہ ۲۱۷
محمد عفیف الزعبی ۲۲۶
محمد علی [مونگیری] ۳۶
محمد علی، سید ۱۳۳
محمد علی الطاہر ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۸۴
محمد علی خان، نواب ۱۳۲-۱۳۳
محمد علی علوبہ پاشا ۲۷۵، ۲۸۰، ۲۸۵
محمد عمران خان ۲۱
محمد غوری، سلطان ۱۱۸-۱۱۹
محمد قاسم نانوتوی ۱۶۹
محمد مجیب ۸۸
محمد معروف الدوالیبی ۲۹۹
محمد مکین ۲۸۴
محمد منظور نعمانی ۴۴، ۲۶۶، ۲۷۱، ۲۸۲، ۲۸۷
محمد موسیٰ بھٹو ۳۰۱
محمد ناظم ندوی ۸۳، ۱۴۴، ۲۶۵، ۲۷۹، ۲۸۱، ۲۸۵
محمد نصیف، شیخ ۲۳۵
محمد واضح حسنی ندوی، سید ۵۴
محمد یعقوب مجددی بھوپالی ۳۷، ۹۰
محمد یوسف کوکن عمری ۱۱۶
محمد یوسف موسیٰ ۲۳۴
محمود، حافظ سید ۲۹۲
محمود حسن، شیخ الہند ۱۷۰
محمود حسن، سید ۲۸۳
محمود شلتوت ۲۱۷
محمود شویل ۲۷۰
محمود غزنوی، سلطان ۱۱۸
محمود فہمی نقراشی ۲۸۵
محمود قیضانی، ڈاکٹر ۳۰۰
محمود محمد شاکر ۲۱۷
محی الدین احمد قصوری ۳۴، ۵۴، ۷۵، ۱۳۶، ۲۱۶
مخدوم الملک = مخدوم بہاری ۴۴، ۱۲۲-۱۲۴، نیز دیکھیے: شرف الدین

www.abulhasanalinadwi.org

یحییٰ منیری ۲۴۶، ۲۶۵، ۲۷۳، ۲۷۹، ۲۸۳، ۲۹۷

مرزا صاحب ۱۵۶–۱۵۸، ۱۶۰، نیز
دیکھیے: غلام احمد قادیانی، مرزا
مسعود عالم ندوی ۱۴، ۳۳، ۸۳، ۱۳۵–
۱۳۶، ۱۴۲–۱۴۵، ۲۶۵، ۲۶۷–
۲۶۸، ۲۸۱–۲۸۵
مصطفیٰ الزرقا ۲۱۷
مصطفیٰ السباعی = مصطفیٰ ۴۰، ۲۱۷، ۲۳۵، ۲۸۴،
حسن السباعی ۲۸۷، ۲۹۸
مصطفیٰ لطفی المنفلوطی ۳۰
مصعبؓ بن عمیر ۲۵
مظفر حسین شاہ ندوی، سید ۲۷۰، ۲۷۴، ۲۸۱–۲۸۲
معاویہؓ، امیر ۱۰۵
معرّی ۲۹
معین الدین چشتی، خواجہ ۱۱۷–۱۱۹
معین الدین ندوی، شاہ ۶۸
معین اللہ ۲۷۸
مقبلی ۳۱
مناظر احسن، ڈاکٹر ۱۵
مناظر احسن گیلانی، سید ۴۱، ۱۸۷
منصور دیکھیے: ابوجعفر منصور
مودودی، سید ابوالاعلیٰ ۱۵، ۳۹، ۶۸، ۸۴–
۸۵، ۱۴۴، ۱۵۹، ۱۷۰–۱۷۳، ۱۷۵،

موسیٰؑ ۱۸۱–۱۸۳
مومن ۲۷
مہر دیکھیے: غلام رسول مہر
ناصر دیکھیے: جمال عبدالناصر
ناصر الدین الالبانی ۲۲۷
نبی اکرمﷺ ۱۰۵، ۱۸۱، ۱۹۷، ۲۰۱
نثار احمد ۱۱۷
نذیر احمد، ڈپٹی ۲۴، ۶۸
نصر اللہ خان عزیز ۱۵۵
نظام الدین اولیاء، شیخ ۳۶، ۱۱۷، ۱۱۹–۱۲۰،
۱۷۵
نعمت اللہ ولی، شاہ ۱۴۳
نفس زکیہ ۱۰۵، نیز دیکھیے: محمد
النفس الزکیہ
نفیس الحسینی، سید ۱۴۳
نور الحسن، نواب سید ۷۹
نور الدین بھیروی، حکیم ۱۵۵
نووی، امام ۳۱، ۲۶۴
واقدی ۲۲، ۵۱
والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان
دیکھیے: صدیق حسن خان،
نواب سید

www.abulhasanalinadwi.org

وزیرالدولہ ۱۳۱-۱۳۲
ولی اللہ، شاہ ۴۳، ۴۵، ۸۹، ۲۶۲، ۲۶۵
ولید بن یزید ۱۰۵
ہاشم ۱۹۹
ہلالی دیکھیے: محمد تقی الدین ہلالی
یحییٰ منیری، شیخ دیکھیے: شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ
یوسف ۱۸۱-۱۸۲، ۲۴۶
یوسف حسین خان ۴۲

اماکن

آزاد کشمیر ۲۸۲
اجمیر ۱۱۹، ۱۳۱
اردن ۵۴، ۸۶، ۲۳۴-۲۳۵
اسپین ۱۲۷، ۲۵۶
استنبول ۹۲
اسکندریہ ۱۹۲
اسلام آباد ۱۱-۱۲، ۱۴۵، ۲۳۵
اعظم گڑھ ۲۱، ۷۰، ۱۱۵-۱۱۶، ۲۲۵
افریقہ ۱۲۷، ۱۶۸، ۲۳۸
افغانستان ۱۳، ۱۷، ۱۰۲
اکوڑہ خٹک ۲۱، ۷۰
الجزائر ۱۸۸، ۲۹۳
الجیزہ ۲۷۴
الخلیل ۸۶
القدس ۸۶
الہ آباد ۷۴، ۲۶۸، ۲۸۲
امرتسر ۳۴، ۵۴
امریکہ ۷۲، ۸۲، ۹۲-۹۳، ۱۷۲، ۱۹۰، ۱۹۴
امین آباد [لکھنؤ] ۷۹
انبالہ ۱۳۳
اندلس ۲۸
انڈونیشیا ۲۸۴، ۴۹
انڈیا ۹۳، نیز دیکھیے: بھارت، ہندوستان، ہند
انڈیمان ۱۳۳
اودھ ۲۷
اوکسفرڈ ۷۲، ۹۲، ۱۱۵
ایران ۵۶، ۷۴، ۱۰۲، ۲۴۹
ایشیا ۹۷
بابری مسجد ۱۷
بالاکوٹ ۷۴، ۱۳۲، ۱۳۵

www.abulhasanalinadwi.org

بدر ۲۶۹

برصغیر پاک [پاکستان] وہند ۵۶، ۷۲-۷۳، ۱۱۵، ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۸۸، ۲۳۱، ۲۳۷، نیز دیکھیے: ہندو پاکستان

برطانیہ ۱۴، ۸۵، ۱۳۴، ۱۷۸، ۳۰۰

بریلی ۲۶۶

بصرہ ۷۳

بغداد ۷۴، ۱۰۹، ۲۶۷، ۲۸۴، ۲۹۸

بمبئی ۲۸۴

بنگلہ دیش ۱۱

بوسنیا ۱۳، ۱۷

بہار ۱۳۵

بہاول پور ۲۶۱، ۲۸۵

بھارت ۱۷-۱۸، نیز دیکھیے: انڈیا

بھوپال ۲۸، ۷۹-۸۰، ۲۲۸، ۲۷۱

بھوپال ہاؤس [لکھنؤ] ۷۹

بویب ۲۶

بیت المقدس ۲۹۸

بیروت ۲۹، ۸۹، ۲۲۵-۲۲۶

پاکستان ۱۱، ۱۴، ۱۷-۱۸، ۵۶، ۷۲، ۱۷۳، ۱۸۸، ۲۲۴، ۲۵۳-۲۵۶، ۲۶۷، ۲۸۵، ۳۰۲

پاکستان وہند ۱۱-۱۲

پٹنہ ۴۸، ۵۱

پشاور ۱۴۲

پنجاب ۴۲، ۴۵

پونہ ۲۲۵

تبوک ۲۳۳

ترکی ۸۷، ۱۸۸، ۲۹۵-۲۹۶

تکیہ شاہ علم اللہ ۱۳۸، نیز دیکھیے: تکیہ کلاں

تکیہ کلاں ۷۵، ۸۷، نیز دیکھیے: تکیہ شاہ علم اللہ

ٹونک ۱۳۱، ۱۳۴

ٹیونس ۱۶۴

جامع اموی [دمشق] ۲۹۱-۲۹۳

جزائر شرق الہند ۲۳۸، نیز دیکھیے: مشرقی جزائر

جزیرۃ الروضہ ۲۷۶

جزیرہ نمائے عرب ۹۹

جسر ۲۶

چشت ۱۲۰-۱۲۱

چھتر منزل [لکھنؤ] ۲۹۳

چین ۲۴۹، ۲۸۴

www.abulhasanalinadwi.org

حجاز[مقدس] ۷۱-۷۲، ۸۶-۸۸، ۹۱-۹۲، ۲۲۹، ۲۳۵، ۲۸۱-۲۸۳، ۲۹۲

حران ۱۰۸

حرمین شریفین ۲۴۵

حلب ۲۸۴، ۲۸۹

حماۃ ۲۸۹

حمص ۲۸۹

حیدرآباد[دکن] ۲۵، ۴۱، ۷۷، ۱۴۴، ۲۸۳

خانۂ کعبہ ۱۲۰

خلیج[فارس]=خلیجی ممالک ۹۱، ۹۳

دائرہ شاہ علم اللہ ۷۵، ۲۶۳، نیز دیکھیے: تکیہ شاہ علم اللہ

دمشق ۵۷، ۷۷، ۸۶، ۸۹، ۱۱۰-۱۱۲، ۱۴۸، ۲۱۷، ۲۲۶، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۶۷، ۲۸۴، ۲۸۷، ۲۹۶، ۲۹۸

دنیائے اسلام ۷۲، ۲۴۵-۲۴۶، ۲۵۱، نیز دیکھیے: عالم اسلام

دہلی ۷۰، ۷۴، ۷۷، ۸۳، ۸۸، ۲۶۶، ۲۹۸

دیوبند ۴۰، ۱۸۷

راولپنڈی ۱۴۵

رائے بریلی ۲۲، ۲۵، ۲۸، ۳۷، ۵۳، ۷۴، ۷۸-۷۹، ۸۲، ۱۳۸، ۲۴۳، ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۷۲، ۳۰۰-۳۰۱

رائے پور ۲۹۵، ۲۹۸

رباط بھوپال[مکہ] ۲۷۴

روم ۲۴۹

رومۃ الکبریٰ ۵۸

ریاض ۲۳۵

سرحد، صوبہ[پاکستان] ۷۴، ۱۳۲

سعودی عرب ۹۳، ۱۸۲، ۲۳۴

سلون ۳۷

سندھ ۷۳-۷۴، ۱۱۸

سوڈان ۸۶، ۱۸۸، ۲۳۳

سورت ۱۵۸

سوریہ ۲۹۳، نیز دیکھیے: شام

سوق حمیدیہ ۲۹۳

سہارنپور ۸۵، ۲۰۲، ۲۶۶

شارع موسیٰ[قاہرہ] ۲۷۵

شام ۲۳، ۶۷، ۸۶-۸۷، ۱۴۸، ۱۵۷، ۲۰۹، ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۸

شرق اوسط ۱۴۸، ۱۵۷، ۲۷۶-۲۷۷، ۲۸۰

www.abulhasanalinadwi.org

شکاگو ۱۹۰
شنقیط ۳۲
شیشان ۱۳
صادق پور [پٹنہ] ۵۱، ۱۳۴-۱۳۵
طورسینا ۱۲۳
عالم اسلام ۹۸-۱۰۰، ۱۰۲، ۱۵۶،
۱۷۱، ۱۷۴، ۲۳۳، نیز دیکھیے: دنیائے اسلام
عالم عرب=عالم عربی ۵۳-۵۴، ۵۷، ۷۱-
۷۲، ۸۵-۸۷، ۹۸، ۱۰۳، ۲۳۳-۲۳۵،
۲۵۳، ۲۷۶، ۲۸۰، نیز دیکھیے: عرب
عراق ۲۶، ۷۴، ۱۰۸، ۲۳۵،
۲۶۹، ۲۷۱، ۲۸۲
عرب=عرب دنیا ۱۷، ۹۲، ۹۸، ۱۰۵،
۱۵۵، ۲۱۹، ۲۲۷، ۲۳۳
عکاظ ۲۸
عمان ۲۹۸
غزنی ۷۴
فقیروالی [ضلع بہاولنگر] ۲۶۱
فلسطین ۱۳، ۸۶، ۲۳۱، ۲۸۰،
۲۹۳، ۲۹۷-۲۹۸
قادسیہ ۲۶
قاہرہ ۵۷، ۹۷، ۲۳۳-۲۳۵،
۲۶۷، ۲۷۴-۲۷۵، ۲۷۸

قرطبہ ۹۰، ۲۱۸
قلعہ کٹرہ ۷۴
کاغان [وادی] ۷۴
کانپور ۲۶
کچھ ۷۳
کراچی ۷۴، ۷۷، ۱۴۳-۱۴۵،
۱۸۵، ۲۰۹-۲۱۰، ۲۲۶، ۲۳۵، ۲۷۸،
۲۸۳-۲۸۴، ۲۸۷، ۲۹۰، ۲۹۸
کٹرہ مانک پور ۷۴
کشمیر ۱۳، ۱۷
کلفٹن [کراچی] ۷۴
کلکتہ ۱۷، ۱۴۴
کوسوا ۱۳
کویت ۵۷
گنج مرادآباد ۳۶
گوئن روڈ [لکھنؤ] ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۷۳
لاہور ۲۷، ۸۲-۸۳، ۸۵،
۹۲، ۱۱۵، ۱۴۳-۱۴۵، ۱۵۵، ۱۵۷،
۱۷۸، ۲۱۶، ۲۲۵-۲۲۶، ۲۳۱
لبنان ۸۶
لکسمبرگ ۷۲
لکھنؤ ۲۱-۲۲، ۲۷، ۵۵، ۷۰،
۷۸-۷۹، ۸۴، ۸۷، ۱۴۴، ۱۵۵، ۱۸۵،

www.abulhasanalinadwi.org

۱۸۷، ۱۹۵، ۲۰۹-۲۱۰، ۲۳۵، ۲۶۵-
۲۶۶، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۵-
۲۸۷، ۲۸۹
لندن ۸۲، ۹۲
لیسٹر ۱۴، ۸۵
مالیگاؤں ۱۵۷
مانک پور ۷۴
محلہ قافلہ [ٹونک] ۱۳۲
مدراس ۷۸، ۱۱۶
مدینہ [طیبہ] ۲۵، ۷۳، ۸۶، ۹۱،
۲۳۴، ۲۵۴-۲۵۵
مراکش ۲۹۶
مرکز الاخوان ۲۸۸
مسجد اقصیٰ ۱۳
مسقط ۵۴
مشرق عربی = مشرق وسطیٰ ۱۰۳، ۱۶۸، نیز دیکھیے:
شرق اوسط، عرب دنیا
مشرقی پاکستان ۱۷
مشرقی جزائر ۱۰۲
مصر ۲۹، ۳۹، ۴۲، ۵۰، ۵۴،
-۵۵، ۵۷، ۶۷، ۷۲، ۷۵، ۸۰، ۸۵-۹۰، ۹۰،
۱۴۸، ۱۵۷، ۱۸۸، ۲۲۴، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۳،
۲۶۵، ۲۷۴-۲۷۷، ۲۸۳-۲۸۵، ۳۰۰
مغرب اقصیٰ ۳۲، ۲۸۰
مکہ [مکرمہ] ۷۵، ۹۱، ۲۳۴، ۲۵۴
-۲۵۵، ۲۶۷، ۲۷۰-۲۷۱، ۲۷۴-
۲۷۵، ۲۸۵
ملتان ۱۱۸
ناسک ۱۵۷
ننگھم ۱۵، ۱۷۸
نوساری ۱۵۸
نیویارک ۸۲
ہند = ہندوستان ۱۱، ۲۲، ۲۵، ۲۹، ۳۲،
۳۴، ۴۱-۴۲، ۴۹، ۵۱-۵۵، ۵۶،
۷۱-۷۳، ۸۳، ۸۷، ۹۲-۹۳، ۹۷، ۱۱۷-
۱۱۹، ۱۲۷، ۱۳۹، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۶۷،
۱۷۱، ۱۷۳، ۲۲۹-۲۳۰، ۲۳۸، ۲۴۴،
-۲۴۵، ۲۴۹، ۲۶۳، ۲۶۷، ۲۷۵،
۲۷۹-۲۸۰، ۲۸۲، ۲۸۵، ۲۸۹، ۲۹۱،
۲۹۶-۲۹۷
ہندوپاکستان ۱۰۲، ۲۸۱
یمن ۲۷۵
یورپ ۲۳، ۵۷، ۷۲، ۹۱،
۹۳، ۹۷-۹۹، ۱۰۱، ۱۷۲، ۱۹۴
یونان ۵۷-۵۸
یونیورسٹی ہال [جامعہ سوریہ] ۲۸۸، ۲۹۷

www.abulhasanalinadwi.org

کتابیں اور جرائد

آب حیات ۲۷-۲۸، ۷۷، ۲۱۵
ابن تیمیہ، حیاتہ وعصرہ --- ۱۱۶
احیاء العلوم ۳۱، ۳۷
اذاھبت ریح الایمان ۱۴۱، ۲۳۴
الاذاعۃ العربیۃ السعودیہ ۲۷۲
اردو نثر کے ارتقاء میں
علماء کا حصہ ۱۴۳
ارشادِ رحمانی ۳۶
الارکان الاربعہ ۹۰
ارمغانِ احباب ۳۶، ۱۳۶
ارمغانِ حجاز ۱۵۲
ازالۃ الخفاء ۴۳، ۴۵، ۲۶۵
استفادہ ۳۶
اسٹیٹسمین ۱۵۹
اسلام اور ہمارے کچھ فکری
واخلاقی مسائل ۳۰۱
اسلام کے قلعے ۲۶۳
الاسلام والمناھج الاشتراکیہ ۲۷۵
اسلامی علوم وفنون:
ہندوستان میں ۶۱
اسمعوا منی صریحہ ۲۳۴
اسمعی یا زھرۃ الصحراء ۲۳۴
اسمعی یا سوریا ۸۸، ۲۳۴
اسمعی یا مصر ۸۸، ۲۷۸، ۲۳۴،
۲۸۴
الاعلام بما فی الھند من الاعلام ۷۷
الاغانی ۳۲-۳۳، ۶۷،
۱۹۸، ۲۲۹
الی ممثلی البلاد الاسلامیہ ۸۸، ۲۷۰
ام القریٰ ۳۴
امام ابن تیمیہ ۱۱۶
الامامۃ والسیاسۃ ۳۳، ۲۲۹
انتشار الاسلام فی الھند ۲۷۹
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے
عروج وزوال کا اثر ۵۷، ۹۷، ۱۵۳،
۲۴۷، ۲۸۳
انصاف ۲۶۵
اورنگ زیب عالمگیر پر
ایک نظر ۱۹۲
ایک اہم دینی دعوت ۲۶۶
ایھا العرب ۲۳۴
بابِ رحمت ۲۱۴
بالِ جبریل ۵۳
بانگِ درا ۵۳

www.abulhasanalinadwi.org

بچوں کے لیے دینی کہانیاں ۲۲۴
البلاد السعودیہ ۲۷۳
بوستان ۶۷
بین الجاہلیہ والہدایہ ۸۸
بین الصورۃ والحقیقہ ۸۸، ۲۰۹
پاجا سراغِ زندگی ۱۹۵
پس چہ باید کرد ۱۵۱
پرانے چراغ ۸۲، ۸۵، ۱۴۴، ۱۸۷، ۲۱۵، ۲۳۵-۲۳۶، ۲۸۳، ۲۸۷
پنج گنج ۲۲۹
تاریخ الادب العربی ۲۷۸
تاریخ احمدیہ ۱۳۲
تاریخ اخلاقِ یورپ ۳۹
تاریخ دعوت وعزیمت ۱۵-۱۶، ۲۶، ۶۹، ۸۹-۹۰، ۱۰۵، ۱۰۷-۱۰۸، ۱۱۶-۱۱۷، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۵۳، ۱۷۵، ۱۸۰-۱۸۱، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۵، ۲۰۹-۲۱۰، ۲۱۵
تاریخ فیروز شاہی ۷۴
تاریخ مشائخ چشت ۱۷۵
تاملات فی سورۃ الکہف ۲۳۴
تائید آسمانی در ردِ نشانِ آسمانی ۱۴۳
تبصرہ للناس ۲۶۶
تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب ۱۸۱، ۱۸۵
تجدید واحیائے دین ۱۴۴
تحقیقات وتاثرات ۷۴
تدوینِ حدیث ۴۱
تذکرہ ۴۰، ۱۴۱
تذکرہ حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی ۷۶
تذکرہ شعرائے اُردو دیکھیے: گلِ رعنا
ترجمان القرآن، [تفسیر] ۴۰
ترجمان القرآن، [ماہنامہ] ۳۹، ۲۸۴
ترجمۃ الامام السید احمد بن عرفان الشہید ۳۴، ۵۵، ۱۳۶، ۲۱۶، ۲۳۰
الترجمۃ العربیہ ۲۶۵
تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک ۲۳۸
تعلیم المتعلم ۳۵
تفسیر [ابن کثیر] ۴۷
تفسیر جوہری طنطاوی ۲۶۱، ۲۶۴
تفسیر سورۂ اخلاص ۴۳
تفسیر سورۃ النور ۳۵
تفسیر سورۂ فاتحہ ۱۳۱، ۱۴۳
تفسیرِ ماجدی ۴۰
تفسیرِ مظہری ۲۶۱، ۲۶۴
تفہیمات ۲۶۵

www.abulhasanalinadwi.org

تقویۃ الایمان	۱۳۴،۱۳۶،۱۴۲،۱۴۵
تلبیس ابلیس	۳۸
تمرین النحو	۲۶۵
تنقیح الانظار	۳۱
تنقیحات	۳۹،۱۷۵،۲۶۵،۲۷۳
تواریخ عجیب	دیکھیے: کالا پانی
تواریخ عجیبہ	دیکھیے: سوانح احمدی
توحید [امرتسر]	۳۴،۵۴،۱۳۶
توضیح الافکار	۳۱
تہذیب [کراچی]	۷۲
تہذیب الاخلاق	۴۱
تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات	۱۵۳
تیسیر الوصول	۲۶۱
الثقافۃ	۹۷،۲۷۳
الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند	۷۷
جامع ترمذی	۸۱،۸۳
الجامعۃ الاسلامیہ	۲۳۱
جب ایمان کی بہار آئی	۱۴۱،۱۴۵
جلالین	۲۶۱،۲۶۴
جماعت مجاہدین	۱۴۱
جمع الفوائد	۲۶۱
جنۃ المشرق	۲۱۴
الجواب الکافی	۳۵
الجوہر النقی	۳۱
چراغ راہ [کراچی]	۱۵،۲۸۱
حاضر العالم الاسلامی	۵۵،۲۲۹
حاضر مسلمی الہند وغابرہم	۲۸۴-۲۸۵
الحج	۲۷۲-۲۷۳
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب	۱۸۳
حجۃ الاسلام	۱۹۴
حجۃ اللہ البالغہ	۴۵،۸۳،۲۶۶
حدیث پاکستان	۱۸،۲۲۴،۲۲۶
حسن معاشرت	۷۷
حضرت مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت	۱۸۵
الحق [اکوڑہ خٹک]	۲۱،۷۰
حکومت خوداختیاری	۴۱
حماسہ	۲۹،۳۲
حیات جاوید	۴۱
حیات شبلی	۴۱
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ	۱۱۶
حیات طیبہ	۱۳۴،۱۴۳
حیات عبدالحی	۷۷،۲۱۵،۲۲۵-۲۲۶
حیاتی	۱۷۷
خطبات مدراس	۴۱

www.abulhasanalinadwi.org

خیر الاصول ۲۶۱
درالمعارف ۳۶
الدعوۃ الاسلامیہ وتطوراتہا فی الہند ۲۷۹
دقائق الکنوز ۳۸
دلائل الاعجاز ۲۹، ۲۲۹
دو ہفتے ترکی میں ۳۰۰
دہلی اور اس کے اطراف ۷۰
دیار عرب میں چند ماہ ۲۷۳، ۲۸۲، ۲۸۵
دین و مذہب ۸۸
دیوان ابی نواس ۲۲۵
دیوان الحماسہ ۲۲۵
دیوان الشافعی ۲۲۶
دیوانِ غالب ۶۷، ۱۶۳
دیوانِ نابغہ ۲۳۰
ذکرِ خیر ۷۷، ۲۲۶
ذکری الامیر شکیب ارسلان ۲۷۷
رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام ۸۸-۸۹، ۲۳۴
رحمۃ للعالمین ۲۵
الرد علی المنطقیین ۱۱۳
الرسالہ ۲۸۵
رسالہ اشغال ۱۳۱، ۱۴۳
رسالۃ التوحید ۱۳۶، ۱۴۴
رسالہ اہل سنت ۲۶۵
رسالہ حقیقت الصلوٰۃ ۱۳۱، ۱۴۳
رسائل اخوان الصفاء ۲۸۲، ۲۸۶
رسائل [جاحظ] ۳۳
روائع اقبال ۴۳، ۵۴، ۸۹-۹۰، ۱۴۷-۱۴۹، ۲۱۵، ۲۱۸، ۲۲۶، ۲۳۴
روح العالم العربی ۲۳۴
روحِ اقبال ۴۲
ریاض [کراچی]، سلیمان نمبر ۲۸۶
ریاض الصالحین ۲۶۴
زاد المعاد ۳۵
زمیندار [لاہور] ۵۳
سچ [لکھنؤ] ۳۸، ۵۳
سفرنامہ روم ومصر وشام ۲۶
سفینہ اردو ۲۵
سقط الزند ۲۹
سنن ابی داؤد ۸۱-۸۲
السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی ۴۵، ۲۹۸
سوادِ اردو ۲۴-۲۵
سوانح احمدی ۱۳۳-۱۳۵
سوانح امام ابن تیمیہ ۱۱۵

www.abulhasanalinadwi.org

سوانح مولانا روم ۲۶
سیارہ[لاہور] ۵۹
السید رشید رضا او اخاء اربعین سنہ ۵۵
سید احمد شہید ۱۳۸،۱۴۳-۱۴۴
سید احمد شہید کی اُردو
تصانیف--- ۱۴۳
السیرۃ النبویہ ۸۷،۹۰
سیرت سید احمد شہید ۱۴،۱۶،۵۶،۸۸-
۸۹،۱۳۶-۱۳۸،۱۴۰،۱۴۲،۱۴۴،۲۷۰،
۲۸۱-۲۸۲،۳۰۰
سیرۃ السید احمد بن عرفان ۲۳۴
سیرۃ علمیہ ۷۶
شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال ۹۰،۲۸۵
شاہنامہ[فردوسی] ۲۶
شرح شذور الذہب ۲۳۰
شرح عقائد نسفی ۲۶۵
شرح مسلم ۳۱
شرقِ اوسط کی ڈائری ۸۷
شعر العجم ۲۷
الشوریٰ ۲۷۵
صحاح ستہ ۲۳۲،۲۶۱
صحبتے با اہلِ دل ۷۰
صحیح بخاری ۸۱،۸۳
صحیح مسلم ۸۱-۸۲
صدق[لکھنؤ] ۳۸،۵۳
صدق جدید[لکھنؤ] ۱۶۰
صراط مستقیم ۴۶
الصراع بین الاسلام والمادیہ ۲۳۴
صرف میر ۲۲۹
صمصام الاسلام ۵۱-۵۲،۷۰
ضحیٰ الاسلام ۳۹
ضربِ کلیم ۵۳،۸۹
الضریری ۲۹،۲۲۹
الضیاء[لکھنؤ] ۳۳،۲۸۳
طبقاتِ ناصری ۷۴
الطریق الی مکہ ۳۹
الطریقۃ الجدیدہ ۲۶۵
الطریقۃ المبتکرہ ۲۹،۲۲۸
طوفان سے ساحل تک ۳۹
العالم العربی ۷۲۵
العرب والاسلام ۲۳۴
العرب یکتشفون انفسہم ۲۳۴
العرفان ۲۳۱
عشر قصائد ۲۲۹
عصرِ حاضر میں دین کی
تفہیم و تشریح ۱۷۲

www.abulhasanalinadwi.org

العطیات ۷۵
العقد الفرید ۲۷۷
علمائے سلف ۳۵
عنایۃ الہادی ۷۵
الغزالی ۲۶
الفاروق ۲۶
الفتح [قاہرہ] ۲۳۱، ۲۸۴
فتح الباری ۳۱
فتوح الشام ۲۲–۲۳، ۵۱
فتوح الغیب ۴۷
فتی العرب [دمشق] ۲۳۱
فجر الاسلام ۳۹
الفرقان [لکھنؤ] ۱۴۴، ۲۶۳، ۲۷۰، ۲۸۲، ۲۹۹–۳۰۰
الفرقان – حج نمبر ۲۷۰
الفرقان – شاہ ولی اللہ نمبر ۴۱، ۴۵، ۶۴
الفرقان – مجدد نمبر ۶۴
الفضل [ربوہ] ۱۵۶–۱۵۸، ۱۶۰
فضل علم السلف علی الخلف ۳۷–۳۸
فوائد الفواد ۳۶
الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ۴۵، ۲۶۱، ۲۶۴
فی ظلال البعثۃ المحمدیہ ۲۰۹–۲۱۰
فیوضِ یزدانی ۲۱۰
قادیانی مذہب ۱۵۶، ۱۵۹–۱۶۰
قادیانی مسئلہ ۱۵۹
القادیانی والقادیانیہ ۹۰، ۱۵۵، ۱۵۷–۱۵۹
قادیانیت – مطالعہ وجائزہ ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۵۷–۱۶۰
القادیانیہ ثورۃ علی النبوۃ المحمدیہ ۱۵۸–۱۵۹
القراءۃ الراشدہ ۲۳۲، ۲۶۵
قرآن ۲۳، ۲۸، ۴۴، ۴۶–۴۸، ۵۸، ۶۲، ۶۹، ۷۸–۷۹، ۸۲، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۵۰، ۱۶۸، ۱۷۰، ۱۸۴، ۲۱۵، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۵۶، ۲۶۱–۲۶۲، ۲۶۴، ۲۷۶، ۲۹۱–۲۹۲، ۲۹۵، ۳۰۱،
نیز دیکھیے: کتاب اللہ
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ۱۷۲
قصائد بدر چاچ ۱۶۳
القصص الدینی للاطفال ۲۲۴
قصص النبیین ۲۱۵، ۲۲۰–۲۲۲، ۲۲۴، ۲۲۶، ۲۳۲، ۲۶۵
قیام اللیل دیکھیے: کتاب قیام اللیل
کاروانِ دعوت وعزیمت ۱۴۱
کاروانِ زندگی ۱۸، ۷۳، ۷۹، ۹۲، ۲۱۵، ۲۳۵–۲۳۶

www.abulhasanalinadwi.org

کالا پانی ۱۳۳
کتاب الادعیہ ۳۱
کتاب الاغانی دیکھیے: الاغانی
کتاب التوحید ۱۳۴
کتاب الزہد والرقاق ۳۱
کتاب اللہ ۳۵، ۲۳۳
کتاب قیام اللیل ۳۵
کتاب المعوات ۴۳
کشاف ۴۷
کلیاتِ اقبال [اردو] ۲۲۶
کلیاتِ اقبال [فارسی] ۲۲۶
کلیلہ ودمنہ ۲۹، ۳۳، ۲۲۸
کمک اردو ۲۴
کیف دخل العرب التاریخ ۲۳۴
کیف ینظر الحجاز وجزیرۃ العرب ۲۳۴
گل رعنا ۲۷-۲۸، ۶۳-۶۴، ۷۷، ۲۱۴-۲۱۵، ۲۲۵، ۲۳۱
گلزارِ دبستان ۱۶۳
گلستان ۶۷
گنج ہائے گراں مایہ ۶۴
لسان العرب ۴۷
ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ۱۵، ۵۷، ۸۵-۸۶، ۹۷، ۱۰۳، ۱۶۷، ۱۷۳-۱۷۴، ۲۰۹، ۲۱۵، ۲۳۳، ۲۴۷، ۲۷۳، ۲۷۸
المامون ۲۶
ماہِ نو [کراچی] ۱۴۴
مثنوی مولانا روم ۵۶، ۶۷، ۱۵۰
مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ ۴۱
مجلۃ الاثنین ۱۰۱
مجلۃ الادب الاسلامی ۲۳۵
مجلۃ الازہر ۲۷۵
مجلۃ الزہراء ۲۳۱
مجلۃ المجمع العلمی ۲۳۱
مجموعۃ من النظم والنثر ۲۹، ۲۲۸-۲۲۹
محمد بن عبدالوہاب: ایک مظلوم اور بدنام مصلح ۱۴۴
محمد رسول اللہ ۲۳۴
مختارات [من ادب العرب] ۱۶۱، ۱۶۳-۱۶۴، ۲۳۲، ۲۶۵
مختصر تاریخ ادب اللغۃ العربیہ ۲۹
مختصر منہاج القاصدین ۳۸
مخزنِ احمدی ۱۳۲-۱۳۳، ۱۳۵
مدارج القراءۃ ۲۹، ۲۲۸
مدارک [التنزیل] ۲۶۴

www.abulhasanalinadwi.org

مذکرات سائح فی الشرق العربی ۸۷
مذہب وتمدن ۲۶۵
مذہب وعقلیات ۴۳، ۲۶۵
مرآۃ المثنوی ۶۷
المرأۃ المسلمہ ۲۸۴
المرتضیٰ ۹۰، ۲۲۰، ۲۲۶
مسدسِ حالی ۴۴، ۴۹، ۵۱، ۷۶
مسدسِ خیالی ۷۶
مسلم ممالک میں اسلامیت ۱۵۳، ۱۷۲، ۱۸۵،
اور مغربیت کی کشمکش ۱۸۸
مسلمان عورت ۲۸۴
مسلمانوں کا روشن مستقبل ۴۱
مسلمانوں کے تنزل سے دنیا
کو کیا نقصان پہنچا؟ ۱۵
المسلمون [دمشق] ۱۴۸، ۲۱۷
مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں ۲۱
مشکوٰۃ شریف ۲۶۱
مصر الفتاۃ ۱۰۱
مضامینِ قرآن ۲۶۵
المطالعۃ العربیہ ۲۹
معارف [اعظم گڑھ] ۷۰
معارف العوارف ۲۱۴
معاصرین ۲۴۳
معتقل ھیکستیب ۲۷۷
معرکۂ مذہب وسائنس ۳۸
معتقل الانسانیہ ۲۷۱
مغرب سے کچھ صاف
صاف باتیں ۱۷۹، ۱۸۵
مفردات غریب القرآن ۴۷
مقالاتِ شبلی ۱۱۵
المقتطف ۲۳۱
مکاتیب سید احمد شہید ۱۴۳
مکتوباتِ [حضرت مجدد
الف ثانی] ۴۳-۴۵، ۴۷، ۱۲۳
مکتوباتِ [سید احمد شہید] ۱۳۱
مکتوباتِ [صدی] ۴۴
من الجاہلیہ الی الاسلام ۲۷۰-۲۷۱
من العالم الی جزیرۃ العرب ۲۷۲
من غار حرا ۸۸
من ھنا نعلم ۲۷۵
المنار [قاہرہ] ۴۴، ۵۵، ۷۵، ۱۳۶،
۲۱۶، ۲۲۹-۲۳۱
منبر الشرق ۲۷۵
منثورات ۳۳۲
منشعب ۲۲۹
منصب امامت ۴۵

www.abulhasanalinadwi.org

منظورۃ السعداء فی احوال
الغزاۃ والشہداء ۵۵، ۱۳۲
مولانا محمد الیاس اور اُن کی
دینی دعوت ۸۴، ۲۰۲، ۲۰۹-۲۱۰
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: حیات
وافکار کے چند پہلو ۱۲
مہر جہاں تاب ۶۳، ۷۶
میزان ۲۲۹
النبوۃ والانبیاء فی ضوء القرآن ۹۰، ۲۳۴
النبی الخاتم ۴۱
النحو الواضح ۲۶۵
نحو میر ۲۲۹
نخبۃ الفکر ۲۶۱
الندوہ [لکھنؤ] ۲۱، ۲۶۳
نشانِ آسمانی ۱۴۳
نصب الرایہ ۳۱
النظرات ۳۰
نفحۃ العرب ۱۶۳-۱۶۴
نفحۃ الیمن ۱۶۲-۱۶۳
نقطۂ نظر [اسلام آباد] ۱۴۵
نقوشِ اقبال ۷۰، ۸۹، ۱۴۷، ۱۴۹
نہج البلاغہ ۲۹-۳۰، ۲۲۹
نزہۃ الخواطر ۴۱-۴۲، ۴۹-۵۰، ۶۳،
۷۳، ۷۵-۷۶، ۲۱۴
نئی دنیا (امریکہ) میں صاف
صاف باتیں ۱۹۵
نیرنگِ خیال ۲۸
نیل الاوطار ۳۱
وامعتصماہ ۲۱۰
وائس آف اسلام ۲۹۹
وحی الرسالہ ۲۷۸، ۲۸۵
وصایا الوزیر علی طریق
البشیر والنذیر ۱۳۳
وقارِ حیات ۴۱
وقائع احمدی ۱۳۲
ہدایہ ۳۵
الہدایۃ الاسلامیہ ۲۷۵
الہلال ۴۰، ۲۳۱
الہند فی العہد الاسلامی ۷۷
ہندوستان کی پہلی اسلامی
تحریک ۱۴۵
[ہندوستان میں مسلمانوں کا]
نظامِ تعلیم وتربیت ۴۱
یادِ ایام ۲۸، ۶۴

www.abulhasanalinadwi.org

Confict Between Religon and Science 57
Decline and Fall of the Roman Empire 58
History of European Morals 57
Islam at the Crossroads 39
Journal of Islamic Studies 115
Making of Humanity 59
Road to Mecca 39

ادارے اور تنظیمیں

اخوان — دیکھیے: اخوان المسلمون
اخوان المسلمون ۸۶، ۱۷۲، ۱۸۸، ۲۳۵، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۸۰، ۲۸۵، ۲۸۸-۲۸۹، ۲۹۸
اخوان المسلمین — دیکھیے: اخوان المسلمون
الادارۃ الثقافیہ للجامعۃ العربیہ ۲۷۴
ادارہ تحقیقات اسلامی-اسلام آباد ۱۱-۱۳، ۷۳
ادارہ ثقافت اسلامیہ [لاہور] ۱۴۳
ادارہ علم وفن-کراچی ۷۴
اردو دائرہ معارف اسلامیہ [لاہور] ۲۲۵
اردو مراٹھی پرکاشن-پونہ ۲۲۵
اسلامک پبلشنگ ہاؤس-لاہور ۱۱۵
اسلامک پبلی کیشنز-لاہور ۶۹، ۱۴۴
اسلامک سنٹر [اوکسفرڈ] ۹۲
اسلامک فاؤنڈیشن [لیسٹر] ۱۴، ۸۵
اسلامک کلوکیم [مجلس مذاکرات علمی] ۱۵۵، ۱۵۷
اسلامی جمعیت طلبہ ۱۴
اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان ۲۵۳
اسلامی یونیورسٹی-اسلام آباد ۲۳۴
اسلامی یونیورسٹیوں کی انجمن-رباط ۲۳۴
اسلامیہ کالج-لاہور ۱۷۸
اقبال اکیڈمی [پاکستان-لاہور] ۶۹
انجمن ترقی اردو-دہلی ۷۰
اورینٹل کالج-لاہور ۲۷، ۶۶، ۸۰
البلاغ پریس [کلکتہ] ۱۴۴
پیام انسانیت — دیکھیے: تحریک پیام انسانیت
تبلیغی تحریک ۸۸، ۲۸۹، نیز دیکھیے: تبلیغی جماعت
تبلیغی جماعت ۱۷۸، ۲۹۲، نیز دیکھیے: تبلیغی تحریک
تحریک اصلاح وجہاد [سید احمد شہید] ۱۳۱، ۱۳۲

www.abulhasanalinadwi.org

-۱۳۶، ۱۳۹
تحریک پیام انسانیت ۸۷، ۹۳
جامعہ اسلامیہ [مدینہ منورہ] ۹۱، ۲۳۴
جامعۃ السوریہ ۲۸۷، ۲۹۸
الجامعۃ العربیہ ۲۷۵
جامعہ اوکسفرڈ ۲۳۶
جامعہ عباسیہ [بہاول پور] ۲۸۵
جامعہ فواد [قاہرہ] ۲۷۸
جامعہ ملیہ [دہلی] ۲۷، ۸۸
جامعۃ الہدیٰ [نوٹنگھم] ۱۷۸
جماعت اسلامی ۸۴-۸۵،
۱۷۲-۱۷۳، ۱۸۴، ۱۸۸، ۲۷۳
جماعت اسلامی ہند ۸۳
جماعتِ تبلیغ ۸۴، نیز
دیکھیے: تبلیغی تحریک، تبلیغی جماعت
جمعیۃ الشبان المسلمین ۲۷۵، ۲۷۹
جمعیت علمائے ہند ۹۳
چیف کورٹ [لکھنؤ] ۲۹۳
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری ۴۸
دارالاشاعت [کراچی] ۲۱۰
[دارالعلوم] دیوبند ۸۱-۸۳،
۱۸۷
دارالعلوم [قاہرہ] ۲۷۸
دارالعلوم [نوٹنگھم] ۱۵
دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ ۱۴، ۲۱، ۳۰،
-۳۱، ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۴۰، ۵۵، ۶۴-۶۵،
۷۰، ۷۸، ۸۱-۸۵، ۸۷، ۹۰-۹۲، ۱۳۵،
-۱۳۶، ۱۴۴، ۱۵۵، ۱۶۷، ۱۷۱، ۱۸۴،
۱۸۷، ۲۰۹-۲۱۰، ۲۲۹، ۲۳۱-۲۳۲،
۲۳۵، ۲۴۴-۲۴۵، ۲۶۴-۲۶۶، ۲۶۹،
۲۸۰، ۲۸۲-۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۷، ۳۰۱
دارالفتح ۲۷۹
دارالفکر [دمشق] ۸۹
دارالقرآن الکریم-شام ۲۰۹
دارالقلم [دمشق] ۲۲۶
دارالکتاب العربی [بیروت] ۲۲۵
دارالنور-بیروت ۲۲۶
دارالمصنفین [اعظم گڑھ] ۵۱، ۶۹، ۸۹، ۱۱۵،
۲۴۴
دانش گاہ پنجاب [لاہور] ۲۲۵
دائرۃ المعارف العثمانیہ-حیدرآباد ۷۷
دمشق یونیورسٹی ۸۸-۸۹، نیز
دیکھیے: جامعۃ السوریہ
دینی تعلیمی کونسل ۹۳
ڈاکٹر محمد حمید اللہ لائبریری-
اسلام آباد ۱۲

www.abulhasanalinadwi.org

رابطہ ادبِ اسلامی ۹۱-۹۲، ۲۱۶، ۲۳۴-۲۳۵
الرحیم اکیڈمی [کراچی] ۱۴۳
سعودی ریڈیو ۸۶
سعید اینڈ کمپنی [کراچی]، ایچ-ایم ۱۴۴
شاہ ولی اللہ اکیڈمی [حیدرآباد] ۶۹
شاہی اکیڈمی برائے اسلامی تمدن [اردن] ۲۳۵، نیز دیکھیے: موسسہ اہل البیت
شبان المسلمین ۸۶، ۲۸۵
شبلی دارالاقامہ [ندوۃ العلماء] ۹۱
شرف الدین واولادہٗ [بمبئی] ۲۸۲
شیخ غلام علی اینڈ سنز-لاہور ۲۲۶
عالمی مجلس اعلیٰ [قاہرہ] ۲۳۴
عربی اکیڈمی-دمشق ۲۳۴
عربی اکیڈمی-قاہرہ ۲۳۴-۲۳۵
فقہ اکادمی = المجمع الفقہی ۹۱
قاہرہ یونیورسٹی ۸۶
کتاب منزل-لاہور ۱۴۳
کتب خانہ الفرقان [لکھنؤ] ۲۰۹
کلیۃ الادب [قاہرہ] ۲۷۹
کلیہ دارالعلوم [قاہرہ] ۸۹، ۲۷۹
کلیۃ الشریعہ [جامعہ سوریہ] ۸۸، ۲۸۷، ۲۹۳، ۲۹۸
لجنۃ التالیف-قاہرہ ۹۷، ۱۰۳
لکھنؤ یونیورسٹی ۸۰-۸۲، ۲۲۸
المجمع الاسلامی العلمی [لکھنؤ] ۲۰۹-۲۱۰
المجمع [العلمی] العربی-دمشق ۵۰، ۷۷، ۲۳۵، نیز دیکھیے: عربی اکیڈمی-دمشق
المجمع الفقہی دیکھیے: فقہ اکادمی
مجمع اللغۃ-دمشق ۵۰، ۷۷
مجلس الاعلیٰ للمساجد ۹۱
مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ ۶۹-۷۰، ۱۲۸، ۱۸۵، ۱۹۵
مجلس نشریات اسلام-کراچی ۱۴۴-۱۴۵، ۱۵۸، ۲۰۹، ۲۲۶، ۲۳۵، ۲۸۳
مدرسۃ الامراء ۲۷۳
مدرسہ قاسم العلوم-فقیروالی ۲۶۱
مدرسہ قاسم العلوم-لاہور ۸۱، ۸۳
مدرسہ مظاہر العلوم-سہارنپور ۲۰۲، ۲۶۴
مدینہ برقی پریس-مدراس ۱۱۶
مرکز دعوت وتبلیغ-لکھنؤ ۲۸۸-۲۸۹، ۲۹۳، ۲۹۸
مسلم پرسنل بورڈ ۹۳
مسلم مجلسِ مشاورت ۹۳، ۱۸۴، ۲۵۶
مطبع معارف [اعظم گڑھ] ۲۱، ۱۱۶، ۲۲۵

www.abulhasanalinadwi.org

مطبع مفید عام-آگرہ ۱۳۳
مطبع نامی-کانپور ۲۶
مطبع نولکشور-لکھنؤ ۷۰
مکتبہ اُردو-لاہور ۱۱۵
مکتبہ اسلام[لکھنؤ] ۲۶۶
مکتبہ التعاون[لکھنؤ] ۲۶۵
المکتبۃ السلفیہ[لاہور] ۱۱۶،۱۴۳
مکتبہ الفرقان-لکھنؤ ۷۰
مکتبہ خلیل-لاہور ۱۴۵
مکتبہ رشیدیہ-لاہور ۱۴۳
مکتبہ فردوس-لکھنؤ ۲۳۵،۲۸۷
مکتبہ محمودیہ-لاہور ۱۴۳
مکتبہ ملیہ-راولپنڈی ۱۴۵
مکتبہ ندوۃ العلماء[لکھنؤ] ۷۰
مکتبہ نشاۃ ثانیہ[حیدرآباد] ۱۴۴
مؤتمر[دمشق] ۲۹۶-۲۹۹
المؤتمر الاسلامی ۲۷۸
موسسہ اہل البیت ۵۴، نیز دیکھیے:
شاہی اکیڈمی برائے اسلامی تمدن
میڈیکل کالج[لکھنؤ] ۲۴، ۷۸-۷۹
ندوۃ العلماء دیکھیے: دار العلوم ندوۃ العلماء
ندوۃ المصنفین[دہلی] ۶۹

www.abulhasanalinadwi.org

www.abulhasanalinadwi.org